www.kurfku.blogspot.com
www.facebook.com/kurf.ku
دورِ حاضر کے
تجدد پسندوں کے افکار
تالیف
فقیہ العصر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی
مکتبہ لدھیانوی

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی! اما بعد

مرشدی حکیم العصر حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی زید مجدہم کی ماہنامہ بینات سے وابستگی کا آغاز ایک ایسے قلمی شاہکار سے ہوا جس کے بارے میں خود حضرت اقدس نے "اقرأ ڈائجسٹ" حضرت بنوریؒ نمبر میں تحریر فرمایا تھا:

"بینات کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی تمام تر ظاہری وباطنی قوتیں فضل الرحمانی فتنہ کا سر کچلنے پر مرکوز ہیں، انہی دنوں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے بعض ملحدانہ مضامین اخبارات میں شائع ہوئے جس سے اس ناکارہ کی طبیعت بے چین ہو گئی.....

بینات کے مضامین سے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے اقتباسات کو پڑھ کر ناکارہ نے "ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے تحقیقاتی فلسفہ اور اسکے بنیادی اصول" کے عنوان سے ایک تردیدی مضمون مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ مدیر بینات کی خدمت میں اصلاح کے لئے بھیجا، تاکہ کسی عام رسالے میں شائع کرا دیں، حضرت مولانا ادریس صاحبؒ نے نہ صرف اس مضمون کو شائع کیا، بلکہ حضرت اقدس مولانا بنوری رحمہ اللہ نے خط تحریر فرمایا کہ تمہارا مضمون پسند آیا، تم رمضان المبارک ہمارے پاس گزارو اور اگر یہ تعلق مستقل ہو جائے تو بہت بہتر ہوگا۔"

حضرت اقدس یکم شعبان ۱۳۸۶ھ سے عاشق رسول، محدث العصر مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے "ہم نام وہم کام" کی حیثیت سے دنیا میں متعارف ہوئے، اور بحمد اللہ حضرت بنوریؒ کے فرمان: "میں تم کو (مولانا محمد یوسف لدھیانوی اور مفتی ولی حسنؒ) اپنے مدرسہ کا مدار سمجھتا ہوں"- کے مصداق آج بھی جامعہ بنوری ٹاؤن کے مدار کی حیثیت سے آپ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہورہے ہیں- پیش نظر کتاب میں فضل الرحمانی فتنہ سے لے کر دور حاضر کے دیگر ایسے جدت پسندوں کے بارے میں مضامین کو یکجا کردیا گیا ہے، جو اسلام کے نام پر امت میں اپنی "جدید تحقیقات" متعارف کرانا چاہتے ہیں-

اللہ تعالیٰ حضرت اقدس کی ان خدمات جلیلہ کو قبول فرماتے ہوئے امت کے لئے نافع بنائے-اس کتاب کی تدوین وترتیب کے سلسلے میں رفیق محترم مولانا سعید احمد جلال پوری، عبد اللطیف طاہر، عزیزان عتیق الرحمٰن لدھیانوی اور مولانا محمد طیب لدھیانوی، مولانا نعیم امجد سلیمی، اطہر عظیم کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور حضرات اکابرؒ کے لئے صدقہ جاریہ بنائے-

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین

محمد جمیل خان

خاکپائے حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی

اشاعت اول..................جون ۲۰۰۰ء

ناشر: مکتبہ لدھیانوی جامع مسجد فلاح
فیڈرل بی ایریا، نصیر آباد، بلاک نمبر ۱۴ کراچی

فہرست

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے نظریات

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا تحقیقاتی فلسفہ

حامداً ومصلیاً ومسلماً، اما بعد:

جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب بالقابہ کئی سال سے سرکاری وسائل سے "اسلامی تحقیقات" پر مشق ستم فرمارہے تھے، پہلے پہل موصوف نے اس "کارخیر" کے لئے اپنے اساتذہ کی زبان ــــ انگریزی ــــ کو منتخب فرمایا، جولائی ۱۹۶۳ء سے "فکر ونظر" کے پہلے ہی شمارے سے ان کے "مضامین عالیہ" اردو زبان کے "چولے" میں منظرعام پر آنے لگے، تاہم ان کے خیالات ابھی تک "اہل علم" کے حلقہ تک یا ادارہ تحقیقات اسلامی کی چہار دیواری تک محدود تھے، جون ۱۹۶۶ء سے آپ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، اور اردو، انگریزی اخبارات میں "زکوٰۃ" سے متعلق یکے بعد دیگرے دو بیان دے ڈالے، پہلے بیان کی اگرچہ تردید فرمادی، لیکن ساتھ ہی اس "تردید" کے "بین السطور" میں اس کی حقانیت پر بھی پورا زور دیا، اسلام پر ان کے اس کھلے عام عمل جراحی سے پوری ملت اسلامیہ کا تڑپ اٹھنا فطری امر تھا، اس لئے ملک کے گوشے گوشے سے قراردادیں بھیجی گئیں، کہ "ڈاکٹر صاحب کو ادارہ تحقیقات اسلامیہ کی ڈائریکٹری اور "اسلامی مشاورتی کونسل" کی رکنیت سے الگ کیا جائے"۔ ہمیں علم نہیں کہ جمہور کی یہ آواز "جمہور کے نمائندوں" یعنی ارکان دولت کے کانوں تک پہنچی یا نہیں؟ اگر پہنچی ہے تو اسے لائق توجہ سمجھا گیا یا نہیں؟ اور اگر سمجھا گیا ہے تو

اس پر غور و فکر کا کوئی نتیجہ برآمد ہوا یا نہیں؟

ذیل کی سطور میں ہم ڈاکٹر صاحب کے نظریات کی اجمالی فہرست دینا چاہتے ہیں، جس سے واضح ہو گا کہ موصوف کی "تحقیقات اسلامیہ" کا خلاصہ یہ ہے، کہ موجودہ "اسلام" قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کا خود ساختہ ہے، اور موجودہ زمانہ میں ناکارہ۔

اس صورت میں موصوف کو "اسلامی تحقیقاتی ادارہ" کی سربراہی کے عہدہ پر مامور کرنا، بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی ماسٹر تارا سنگھ، لالہ بہاری لال، یا پروفیسر جوزف شاخت کو قرآن و سنت اور اسلام کی تشریح و تفسیر کے کام پر مامور کر دیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ "اسلام" اور اسلام کے اس جدید "شارح" دونوں پر ظلم ہے، اس لئے جمہور اپنے اس مطالبہ میں حق بجانب ہیں، کہ ڈاکٹر صاحب کو کم از کم سرکاری ذرائع سے "اسلام" پر خط تنسیخ (نفی کی لکیر) کھینچنے کا موقعہ نہ دیا جائے، ڈاکٹر صاحب کے نظریات پیش کرنے سے پہلے مناسب ہو گا، کہ ان کی تحریک کا پس منظر، اور ان کی تحریفات کے وہ "راہنما اصول" مختصراً عرض کر دیئے جائیں، جن پر یہ "نئی عمارت" کھڑی کی جا رہی ہے، واللہ الموفق والمعین۔

ا ــــ ڈاکٹر صاحب موصوف جس "مکتبہ فکر" کے نقیب ہیں، اس کے نزدیک "اسلام" کا مفہوم بظاہر بہت سادہ اور مختصر ـــــ لیکن بے حد پر پیچ ـــــ ہے، یعنی "اسلام" نام ہے چند مثالی معیاروں اور نصب العینوں کا، جن کو مختلف معاشرتی مظاہر اور ظروف احوال میں "ترقی پسندانہ" انداز میں عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے"۔ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۱۱ ص ۷۹۶) (واضح رہے کہ یہ چند "معیار" اور "نصب العین" بھی آج تک شرمندہ تفصیل نہیں ہو سکے۔ ناقل) "یہ اسلام جو ہمیشہ نو بنو صورتیں، تازہ بتازہ

شکلیں تلاش واختیار کرتا رہا ہے' یہی اسلام "زندہ اسلام" کہلانے کا مستحق ہے"۔
(فکر و نظر جلد ۲ ش ۱۱ ص ۶۹۶)

اس مکتب فکر کا خیال ہے' کہ اسلام کی اصل روح پہلی صدی کے وسط (جلد ۱ ش ۶ ص ۸) یا تقریباً آخر (فکر و نظر جلد ۱ ش ۱۰ ص ۸) میں دفن ہو کر رہ گئی' اور اب جو "مدون اسلام" تیرہ یا چودہ صدیوں سے مسلمانوں کے پاس موجود ہے' یہ وہ اسلام نہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا' بلکہ یہ اسلام "مردہ کا ورثہ" اور "زندگی کی حرارت" سے محروم جسد بے روح ہے (فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۳) یہ اسلام محض پوست ہے مغز سے خالی' ظاہری رسمی ڈھانچہ ہے روح سے عاری۔ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۳) یہ اسلام "آزاد ثبوتی فکر" کا گلا گھونٹ کر خود فریبی میں مبتلا ہے (۔ فکر و نظر جلد ۲ ش ۶ ص ۱۵۳) یہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں' انتہا پسندی اور غلو کی چکی میں پسا ہوا ہے۔ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۶) یہ اسلام "قانون مبرم" کا زخم خوردہ' ارتقائی اور فکری لحاظ سے بے حد نقصان رسیدہ اور زوال پذیر ہے (فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۶) یہ اسلام صرف "تعزیروں" اور "پابندیوں" کا مجموعہ' "قدامت پرستی" کے اطوار کا شاہکار (فکر و نظر جلد ۱ ش ۹ ص ۹۲) اور ہمیشہ سے انتہا پسندانہ نظریات کا شکار ہے (فکر و نظر جلد ۱ ش ۳ ص ۱۵۶) یہ اسلام روشن ضمیری سے محرومی کی "پیتا" کا مارا ہوا کور' بخت اسلام ہے (فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۸) اور ہر "تمدنی ڈھانچہ" کے لئے اس کا وجود تباہ کن ہے (فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۸)۔

۲ ـــــ امت مسلمہ اور حاملین دین کے بارے میں اس "مکتب فکر" کا انداز فکر یہ ہے' کہ رحلت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً" ایک صدی بعد وہ اخلاقی اور عملی رجحان کی بجائے شدید تفکر و تعمق میں مبتلا ہو کر رہ گئے تھے' اور دیگر مذاہب کی طرح

اسلام کو بھی یہ "حادثہ" پیش آیا کہ اس کا عالمی نظریہ "اعمال" کی بجائے "عقائد" کے رنگ میں تشکیل پانے لگا، اور دوسرے گمراہ فرقوں کی طرح "اہل سنت" بھی اخلاقی تجاذب کے ایک ہی سرے ——افراط ——پر زور دے کر غلو اور تشدد میں اس قدر ڈوب گئے کہ اپنے "خود ساختہ" عقائد کے ہاتھوں گویا خود "گروی" ہو گئے، اور امتداد زمانہ کے ساتھ انہوں نے "جبریت" کو "روایتی عقائد" کا جزو لاینفک بنا ڈالا (فکر و نظر جلد ا ش ۱۰ ص ۸) اور انہوں نے ایمان و عمل کی تفریق کا نظریہ —— جو مسیحی عقیدہ "استحقاق ایمان بہ نجات" کا عین مین چربہ ہے —— اپنا کر انتہا پسندانہ اقدام بلکہ "اخلاقی خودکشی" کا ارتکاب کیا (فکر و نظر جلد ا ش ۱۰ ص ۹) فلسفہ سے ٹکراؤ ان کے لئے ہلاکت آفریں ثابت ہوا (فکر و نظر جلد ۲ ش ا ص ۱۲) اور فلسفہ پر یکطرفہ "غیر عقلی" حملہ کر کے انہوں نے خود اپنے آپ کو ذہنی اور روحانی طور پر ناکارہ اور مفلوج بنالیا (فکر و نظر جلد ۲ ش ا ص ۱۸) اور غزالی اور ان کے بعد کے تمام علمبرداران "راسخ العقیدگی" نے تمام عالم انسانیت سے روگردانی اختیار کرلی (فکر و نظر جلد ۲ ش ا ص ۱۸) امام غزالی، امام شاطبی، امام ابن تیمیہ اور شیخ احمد سرہندی اور تمام مشاہیر اسلام—— جن کی فہرست طویل ہے —— نے "ثبوتی علوم" کے بارے میں مہلک رویہ اختیار کیا (فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۵) اور فلاسفہ پر تنقید کے شوق میں ان مسلمہ عقاید کے حامیوں پر پشت در پشت اور پے در پے، انسانی عقل کو ساقط الاعتبار قرار دے کر جو انتہاپسندانہ اور "چوطرفہ" حملہ کیا یہ نہ صرف غیر صحیح تھا بلکہ خودکشی کے مترادف تھا۔ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۵)۔

۳ —— فقہائے اسلام کے بارے میں اس مکتب خیال کا انداز فکر اس سے بھی زیادہ

شدید ہے' ان کا خیال ہے' کہ "قدیم فقہا" نے نہ صرف اپنے ذاتی آرا وافکار کو بلکہ "بیرونی عناصر" کو بھی ——— جن کا ماخذ "یہودی روایات" اور "باز نطینی" و "ایرانی" انتظامی معاملات تھے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردیا (فکر و نظر جلد ا ش ا ص ۱۲) امام ابو یوسفؒ نے تمام تر "احتیاطی تدابیر" کے باوجود بہت سی احادیث ——— جن کا فرضی سلسلہ ذات نبویؐ سے ملایا جاچکا تھا ——— کتاب الآثار میں روایت کی ہیں (فکر و نظر جلد ا ش ۳ ص ۱۸) امام شافعیؒ نے نہ صرف یہ کہ حدیث اور اجماع سے متعلق ——— بہت سی "مشکوک" اور "فرضی" احادیث ذات نبویؐ سے منسوب کی ہیں (فکر و نظر جلد ا ش ۵ ص ۱۴) بلکہ ان کی روشن دماغی اور تیز طبعی نے ایک ایسے "مشینی" نظام کو جنم دیا جس نے اسلام کو "جدت فکر کی تخلیق" سے محروم کردیا اور اسے زندہ "طاقت" اور اپنی تقدیر کا خود مالک نہ رہنے دیا' بلکہ اسے ایک اثر پذیر وجود کی حیثیت سے زندگی کے تھپیڑوں کی نذر کردیا (فکر و نظر جلد ا ش ا ص ۳۰)۔

۴۔ حضرات محدثین کے متعلق اس مکتب فکر کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف بعض اقوال شافعیؒ کو حدیث بنا ڈالا (فکر و نظر جلد ا ش ا ص ۳۰) بلکہ وہ سیاسی جنگوں اور کلامی بحثوں سے پیدا ہونے والے تمام آرا وافکار کو "عقائد" کا نام دے کر "حدیث" کی شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کرتے رہے (فکر و نظر جلد ا ش ٦ ص ٨) اس مکتب فکر کا خیال ہے کہ احادیث احکام' احادیث اجماع' احادیث فتن' احادیث جبر وقدر' احادیث ایمان و عمل' اور احادیث تصوف وغیرہ کا تمام ذخیرہ ——— معاذ اللہ ——— اسی فرضی نسبت کی وجہ سے وجود میں آیا ہے (فکر و نظر جلد ا ش ٦ ص ٨) ان تمام انسانی آرا کو ——— جو زمانہ مابعد کی پیداوار تھیں درجہ

"استناد" بخشنے، "تقدس" کا نام دینے اور "ابدی" صداقت قرار دینے کے لئے یوں ہی خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام باور کرایا جاتا رہا (فکر و نظر جلد۲ ش۵ ص۲۹۹) باوجودیکہ "قدما محدثین" خود اس "معلوم حقیقت" کا اشتہار دیا کرتے تھے، کہ اخلاقی امثال، پند ونصائح اور جوامع الکلم کے ذات نبویؐ سے منسوب کردینے میں —— خواہ یہ انتساب درست ہو یا نادرست —— کوئی حرج نہ سمجھا جائے، البتہ فقہ وعقاید کی احادیث میں "صحت" کا خیال رکھنا ضروری سمجھنا چاہئے (فکر و نظر جلد۱ ش۵ ص۱۳) اس کے باوجود یہ، "متعصب محدثین" (فکر و نظر جلد۱ ش۷ ص۲۲) سب سے زیادہ فقہی اور کلامی احادیث ہی کو، ان کے "قطعی مشکوک" "ناقابل اعتماد" اور "غیر صحیح" ہونے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کرنے میں کامیاب ہوگئے (فکر و نظر جلد۱ ش۷ ص۹) الغرض محدثین کی اس "جرأتِ رندانہ" کے طفیل "حدیث" کا کام "تاریخ نویسی" نہیں بلکہ "تاریخ سازی" بن کر رہ گیا تھا۔

(فکر و نظر جلد۱ ش۵ ص۱۷)

لطف یہ کہ یہی مشکوک، ناقابل اعتماد اور خودساختہ تاریخ (حدیث۔ناقل) ہے جس پر "مبادیات دین اسلام" کی ساری عمارت کی بنیاد قائم ہے۔ (فکرو نظر جلد۱ ش۷ ص۱۰) اور امت کی تیرہ صدیاں آنکھیں بند کرکے اسی مشکوک اسلام کے موافق اپنے ایمان وعمل، فقہ وعقاید، احسان وتصوف اور سیاست ومعاشرت کے نقشے تیار کرتی رہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہم اپنے ناظرین سے معذرت خواہ ہیں کہ انہیں اس "متعفن" نظریاتی غلاظت خانہ میں تھوڑی دیر کے لئے جانے کی زحمت اٹھانا پڑی، جس سے ان کے دماغ پھٹے جاتے ہوں گے، لیکن کیا کیا جائے اس "غلاظت خانہ" میں لیجائے بغیر ہم اس کا تجزیہ کرنے سے معذور تھے، ہم اس بحث میں نہیں جانا چاہتے کہ یہ سب کچھ

دیانت داری سے کہا گیا ہے یا یہ سیاسی حالات کی پیداوار ہے؟ اس کا منشا غلط فہمی ہے' یا دیدہ دانستہ مغالطہ اندازی ہے؟ اور "یہ فیضان نظر ہے' یا کہ اس مکتب فکر کی کرامت" ہے؟ لیکن اتنی بات ضرور صاف صاف کہیں گے ---اور اسی میں پاکستان کی' ملت اسلامیہ کی' حکومت پاکستان کی' اور خود ڈاکٹر صاحب کی بھلائی ہے ---- کہ اس مکتب فکر کا مقصد جو کچھ بھی ہو' مگر ان کے افکار "پریشان" کا نتیجہ قطعاً" مذہب بیزاری' دینی تشکیک و تذبذب' تمام امت اسلامیہ کی تجہیل اور تحمیق اور قدیم علما امت اور حاملین دین کو ناقابل اعتماد مجرم قرار دینا اور اسلام کی پوری تاریخ کو تاریک در تاریک دکھلانا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے قلم سے جتنی قلمی تحقیقات "صفحۂ قرطاس" پر آئی ہیں ان کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ معروف و مسلم اسلام قطعاً" مشکوک' ناقابل اعتماد' فرضی' بناوٹی' اور غلط مذہب ہے' کیا سطور بالا میں ذکر کردہ نظریات سے' اس کے علاوہ کسی اور نتیجہ کی گنجائش ہے۔؟

پس منظر

پنجاب مرحوم اس لحاظ سے خاص امتیازی حیثیت کا حامل ہے کہ یہاں گزشتہ صدی میں "تجدید اسلام" کے عنوان سے "دیرینہ اسلام" کو غلط ثابت کرنے والی کئی تحریکوں نے جنم لیا ہے' جن میں مرزا غلام احمد قادیانی' علامہ عنایت اللہ مشرقی' اور مسٹر غلام احمد پرویز کا نام سرفہرست آتا ہے ---- "مرزائی" مکتب فکر نے "تجدید اسلام" کی صورت "دعویٔ نبوت" کی شکل میں تجویز کی' مگر ختم نبوت' حیات مسیح وغیرہ چند مسائل حقہ اس کے لئے پاؤں کی زنجیر ثابت ہوئے' اب اس کی پوزیشن مثل مشہور "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" سے زائد نہیں رہی' اور ثانی الذکر نے "مولوی

"مذہب غلط" کا نعرہ لگایا، مگر ان کا "عسکری اسلام" جو شاید خود ان کے لئے بھی ناقابل
فہم تھا، چل نہ سکا۔ آخر میں مسٹر پرویز نے "قدیم اسلام" کو "عجمی سازش" قرار دے
کر "مرکز ملت" اور "نظام ربوبیت" کا نظریہ پیش کیا۔ مگر ایک آدھ "مرکز ملت"
سے زیادہ کی بارگاہ میں اس کو شرف پذیرائی حاصل نہ ہو سکا، اس کی وجہ شاید یہ تھی،
کہ ان کی تحریک علمی نہ تھی، بلکہ برسراقتدار "کرسی نشینوں" کو خوش کرنے کے لئے
چند مبہم قسم کے عامیانہ اور سوقیانہ افکار اور مدحیہ قصائد کا پلندہ تھی، البتہ ڈاکٹر
صاحب کا مکتب فکر اس حیثیت سے امتیازی مقام رکھتا ہے، کہ اس نے "انکار دین
قدیم" اور "تخریب اسلام کہنہ" کی تحریک کو مستشرقین کے طرز پر ایک "علمی" اور
"فلسفی" انداز میں پیش کرنے کی کوشش ہی نہیں بلکہ بڑی محنت کی ہے۔ تاہم احسان
ناشناسی ہوگی اگر وہ اپنے ان تمام "اسلاف" کے شکرگزار نہ ہوں، کیونکہ کم از کم اصل
مقصد کی حد تک تو یہ لوگ یقیناً موصوف کے لئے "ہراول دستہ" ثابت ہوئے ہیں،
اور انہوں نے موصوف کی تحریک کے لئے کافی حد تک زمین تیار کردی ہے۔
بالخصوص موخر الذکر کا تو انہیں بہت زیادہ ممنون ہونا چاہئے، کہ ان کے اور ان کے
نظریات وافکار، سچ مچ کافی حد تک میل کھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پرویز صاحب کے
کئی ایک "خاص تربیت یافتہ" اصحاب، جو برسوں ان سے منسلک رہے، اب ڈاکٹر
صاحب کی صفوں میں نظر آتے ہیں، کیونکہ ان کا قدیم مشن ——— قدیم اسلام کو غلط
ثابت کرنا ——— یہاں ذرا سنجیدہ، علمی، اور سائنٹفک ہے۔

ڈاکٹر صاحب انکار دین قدیم، اور تخریب اسلام کے لئے ——— جس کو وہ
نہایت دلفریب عنوان "اسلام کی تعمیر نو" **(Re-Construction of Islam)**
سے تعبیر کرتے ہیں ——— جو "فلسفہ" پیش کیا ہے، وہ مغربی اصطلاح میں، "فلسفہ ارتقا
یا ... " اور مشرقی اصطلاح میں "فتنہ استشراق" کہلاتا ہے، یہ فلسفہ یا فتنہ موصوف کی

اختراع نہیں بلکہ کافی مدت سے یہودیوں اور مسیحیوں کا "چبایا ہوا لقمہ" ہے' (ملاحظہ فرمایئے کتاب العقیدہ والشریعہ و تطور الفقہ الاسلامی' بحوالہ دفاع عن العقیدۃ والشریعہ لعلامہ محمد غزالی المصری ــــ مطبوعہ دارالکتب الحدیثی) جس کا مقصد اس کی ابتدائے آفرینش ہی سے یہ تھا' کہ اسلام کی موجودہ شکل کو ارتقا کی "شعبدہ بازی" قرار دے کر اسلام اور عیسائی کلیسا کو ہم رنگ اور ہم شکل ثابت کیا جائے' تاکہ جس طرح مغربی نسل ـــــ یورپین اقوام ـــــ نے عیسائی کلیسا کے جبروت کا جوا اتار پھینکا ہے' اور "مادر پدر آزاد" ہوگئے ہیں اسی طرح مسلمانوں کی آنے والی نسل بھی اسلام اور اس کی صحیح تعلیمات کا جوا آسانی سے اتار پھینکے اور "پابندیٔ اسلام" سے آزاد ہوجائیں "پیر مغربی" اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا؟ اس کے لئے ڈاکٹر صاحب' ان کے قلمی رفقا اور ان کے مکتب فکر کی شہادت کافی ہے۔

اسے ڈاکٹر صاحب کی خوش قسمتی کہئے یا کچھ اور' کہ ان کی عقل و خرد' شعور واحساس' فہم وادراک' اور ہوش وحواس کی آنکھ ٹھیک اس ماحول میں جاکر کھلی' جہاں اس "فلسفہ" کا چرچا اس شدت سے تھا کہ ہم مشرقیوں کو بھی اس کی گونج اور صدائے بازگشت کبھی کبھی سنائی دیا کرتی تھی' اس پر طرہ یہ ہوا کہ موصوف کی "ساخت وپرداخت" اور تعلیم وتربیت ان ہی "ارتقائی فلاسفہ" کے سپرد ہوئی' جن کے دل ودماغ کا سب سے بڑا کانٹا "مذہب اسلام" تھا' اس لئے ان کے لائق اور قابل فخر تلمیذ رشید کا ان سے "متاثر" ہونا' بلکہ ان کا "معتقد" اور ان سے علمی حلقہ میں "مرعوب اور مسحور" ہونا ایک فطری امر تھا' کیونکہ بقول خود ان کے :

> "ایک یکساں "نظام فقہ" کی تشکیل میں ایک اور امر یہ مانع تھا' کہ ہر مذہب فقہ کے پیرو اپنے "بانی" اور "شیوخ" کا غیر معمولی

احترام کرتے تھے' اور بالعموم ان کی رائے سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔

—— ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں' جہاں کوئی فقیہ' دوسرے مذاہب فقہ کے افکار و آرا سے متاثر ہوکر کسی مسئلہ میں اپنے موقف سے دستبردار ہوگیا ہو' امام ابو یوسف اپنی کتاب "الرد علیٰ سیر الاوزاعی" میں بالعموم امام ابو حنیفہؒ کے موقف کی تائید کرتے ہیں' صرف دو تین مقامات پر مثلاً دارالحرب میں "ربوا" کے مسئلہ کی نسبت وہ امام اوزاعی کی حمایت کرتے ہیں۔

یہ امر بالکل فطری ہے' اور آج بھی بالعموم یہی ہوتا ہے' کہ شاگرد اکثر امور میں اپنے استاد کا ہم خیال ہوتا ہے"۔

(فکرو نظر ج ۳ ش ۷'۸ ص ۵۶۷)

اس فطری عمل نے ڈاکٹر صاحب کے مزاج پر گہرا "ارتقائی" رنگ چڑھایا' تا آنکہ ڈاکٹر صاحب کو "فرقہ ارتقائیہ" کا امام' اور گولڈ تسہیر اور جوزف شاخت کی ٹکر کا آدمی بنادیا' اب وہ اس فن کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف اور اس کے اصول وفروع کے اس قدر ماہر ہیں' کہ وہ اپنے "مغربی اساتذہ" کے "ارتقائی نظریات" کی پورے شرح صدر کے ساتھ تبلیغ کرتے ہیں' اور جہاں ان کا کوئی نظریہ لائق توجیہ ہو' وہاں دلائل و براہین کے ساتھ اسے موجہ کردیتے ہیں' اور اگر مشرقی فضا کے لئے وحشت آور ہو تو اسے نئے اور مانوس اسلوب میں نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں (ملاحظہ ہو مقالہ "سنت" مشمولہ فکرو نظر ج ا ش ا ص ۱۶) اور اگر کسی "اسلامی مسئلہ" پر وہ لوگ "ارتقائی دلائل" پیش نہیں کرسکے' تو موصوف اس کے لئے جدید اصول وضع کرتے ہیں' اور نئے دلائل مہیا فرماتے ہیں' علمی اصطلاح میں کہنا چاہئے

کہ اس فن ارتقا میں ان کو "مجتہد فی المذہب" کا مقام حاصل ہے' (جسے بر خود غلط خوش فہمی سے انہوں نے "اجتہاد فی الدین" تصور کرلیا ہے) گویا علامہ اقبالؒ کے پیر رومیؒ نے انہیں کو سامنے رکھ کر کہا تھا :

مرغ پر نارستہ چوں پراں شود
طعمہ ہر گربہ دراں شود!!!

فلسفہ ارتقا کے بنیادی اصول

اس فلسفہ ارتقا کی بنیاد جن "اصول موضوعہ" پر رکھی گئی ہے وہ بہت سادہ' مختصر' اور بظاہر دلفریب ہیں' یعنی :

الف :" آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اساسی طور پر بنی نوع انسان کے اخلاقی مصلح تھے"۔

(فکرو نظر ج ا ش ا ص ١٦)

ب": آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) شارع --- قانون ساز --- نہ تھے اس لئے اسلام کی ترقی کے لئے نہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قانون سازی کی' نہ از روئے قیاس اس کے لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرصت تھی۔

(فکرو نظر ج ا ش ا ص ١٨)

ج :"دور نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بھی صحابہ کرامؓ اپنی عقل و فہم یا رسوم ورواج کے موافق خود ہی فیصلہ کیا کرتے تھے' اگر انتہائی غیر

معمولی حالات میں ذات نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو زحمت بھی دی جاتی' یا بہت خاص حالات میں قرآن کا سہارا لینا ہی پڑتا' تو ان قرآنی اور نبوی فیصلوں کی نوعیت محض ہنگامی اور وقتی ہوتی' جنہیں قانون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا' زیادہ سے زیادہ "ایک گونہ نظیر" ہی کہا جاسکتا ہے"۔

(فکرو نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۱۸)

د :" محض مذہب یا حکومت سے تعلق رکھنے والی بڑی بڑی پالیسیوں کو طے کرنے یا اہم اخلاقی اصولوں کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرنے ہی میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کوئی اقدام فرمایا ہے' لیکن اس کے لئے بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اکابر صحابہؓ سے مشورہ فرمالیا کرتے تھے' یعنی ان کا مشورہ تنہائی میں یا پبلک میں حاصل کرلیا جاتا۔

(فکرو نظر ج ۱ ش ۱ ص ۱۸)۔

ان فرضی مقدمات سے جو نتائج بر آمد ہوتے ہیں ان کو بھی فلسفہ ارتقاء کے اصول موضوعہ میں شامل کرلیا گیا چنانچہ کہا گیا کہ :

ہ :" قرآن تو عام اخلاقی اصولوں کے علاوہ کوئی قانون اپنے اندر نہیں رکھتا' وہ صرف ان "علل وغایات" کے اعتبار سے ابدی ہے جو اس سے اخذ کئے جاسکتے ہیں۔" (فکرو نظر ج ۲ ش ۴ ص ۲۳۷)

(جن کو ان "ارتقائی ڈاکٹروں" سے پہلے.... امت میں کوئی بھی اخذ نہیں کرسکا۔ ناقل)

و :"اور سنت کا اول تو (قرآنی بیانات سے باہر قانونی یا اخلاقی امور

کے متعلق) وجود ہی نہیں۔" (فکر و نظر ج ا ش ا ص ۱۲)۔

ز :"اور اگر اس کا وجود تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ کوئی متعین شی نہیں۔"

(فکر و نظر ج ا ش ا ص ۱۶)۔

ح :"بلکہ وہ ایک "عمومی محیط تصور" اور "تعاملی اصطلاح" تھی جو کسی خاص مادے اور عنصر تک محدود نہیں ہوتی' نہ کی جاسکتی ہے' بلکہ مختلف کوائف و ظروف میں اس کی مختلف تعبیروں اور تطبیقوں کی گنجائش ہے۔"

(فکر و نظر ج ا ش ا ص ۱۸)۔

(یعنی سنت کا وجود تو ہے' لیکن بالکل مبہم' غیر معقول' فلاسفہ یونان کا ہیولیٰ' وجود ہے لیکن عدم سے بدتر۔ ناقل)

ان تمام مبادیات کو سامنے رکھنے سے جو اہم سوال کھڑا ہونا چاہئے تھا' وہ یہی ہے' کہ اسلام کا یہ عظیم الشان "علمی ذخیرہ" جو ہمارے سامنے تفسیر' حدیث' فقہ' عقائد' اصول وغیرہ کی شکل میں عبادات' عقاید' معاملات' اخلاق' حدود اور سیاسیات وغیرہ کے مختلف شعبوں پر مشتمل ہے' یہ آخر کہاں سے آیا؟ بس اسی سوال کے جواب کا نام "فلسفہ ارتقاۓ اسلام" ہے' پہلے اجمالاً اتنی بات ذہن نشین کرائی گئی کہ یہ سب عہد وسطیٰ کے فقہا (اور محدثین) کی رنگ آمیزی ہے' (فکر و نظر ج ا ش ا ص ۱۶) اس کے بعد حدیث' فقہ' عقاید' اور اصول' الغرض علوم اسلامیہ کے ایک ایک شعبہ کو لے کر اس کے --- بالکل فرضی --- ارتقائی منازل بیان کئے جانے لگے اور اسلام کے ایک ایک جزئی مسئلہ کا سرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے "کاٹ کر" زمانۂ بعد سے "جوڑا" جانے لگا' اور ساتھ کے ساتھ ہر ہر مرحلہ پر امت مسلمہ کے قائدین اور دین اسلام

کے محافظین، ائمہ مجتہدین، فقہا و محدثین بلکہ صحابہ و تابعین کی فرضی لغزشوں کے افسانے تراشے جانے لگے، اور یہ سب کچھ اتنی صفائی، چابکدستی، سبک روی، ملمع کاری، اور "معصومانہ انداز" میں کہا گیا کہ قاری خود بخود یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائے کہ معاذ اللہ دنیا کا سب سے بڑا "سازشی" اور مکروہ مذہب اسلام ہے اور خطہ زمین کے سب سے بدتر، مکار اور فریبی ہر دور کے مسلمان علما کرام، محافظین اسلام ہیں" معاذ اللہ۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب "اسلامی منہاج کی تاریخ" (بزبان انگریزی جس کا ترجمہ بسلسلہ مقالات" "فکر و نظر" کی زینت ہے) اسی موضوع پر ان کا کامیاب ترین شاہکار ہے:

فلسفہ ارتقأ اسلام کے اختراع کا پس منظر

فلسفہ ارتقأ اسلام کے یہ "مبادی" اور "اصول موضوعہ" مغربی مزاج اور ذہنیت کی پیداوار اور ان کے منتقمانہ مقاصد کی صاف صاف غمازی کرتے ہیں، اور ان میں یہودی اور عیسائی سازش واضح طور پر جھلکتی نظر آتی ہے، درحقیقت:

> "مستشرقین عمومی طور پر اہل علم کا وہ بد قسمت اور بے توفیق گروہ ہے جس نے قرآن وحدیث، سیرت نبوی، فقہ اسلامی، اور اخلاق و تصوف کے سمندر میں بار بار غوطے لگائے اور بالکل "خشک دامن" اور "تہی دست" واپس آیا، بلکہ اس سے اس کا عناد، اسلام سے دوری اور حق کے انکار کا جذبہ اور بڑھ گیا۔"

(الفرقان لکھنؤ ج۳۱ ش ۷ ص ۳۲)۔ از مولانا ابوالحسن ندوی مدظلہ۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی یہ غوطہ زنی ایک "آبدوز کشتی" کی غوطہ زنی تھی کہ اسلام کی کشتی کو ڈائنامیٹ لگا کر تباہ کر دیں، اللہ تعالیٰ روز اول سے اس "کشتی" کے محافظ ہیں انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ اس لئے یہ آبدوزیں خود ہی ڈوب گئیں اور فی النار والسقر ہو گئیں۔ (از مدیر)۔

اصول فلسفہ ارتقا کا تجزیہ

ا----- چنانچہ پہلے اصول کو لیجئے، کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اساسی طور سے اخلاقی مصلح تھے" یہ اہل مغرب کے نظریہ کی ترجمانی ہے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت بڑے مفکر، اچھے سیاست دان، عظیم قومی رہنما، بلند مرتبہ ریفارمر اور مصلح اعظم کی حیثیت سے تسلیم کر لینے میں کبھی کوئی عذر نہیں ہوا، بنی نوع انسان پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان احسانات کو وہ بڑی فراخ دلی سے تسلیم کریں گے، اسلام کو ایک "عظیم انقلابی تحریک" کی حیثیت سے مان لینے سے بھی کبھی ان کو انکار نہ ہو گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے ذریعہ سے، اصلاح عالم کا جو صور پھونکا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ نے فدائیت، جانبازی اور جانفروشی کے جو مظاہرے کئے، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت، دور اندیشی، اور سیاسی قائدانہ صلاحیتوں کا کرشمہ قرار دینے میں بھی انہیں کبھی کوئی باک نہ ہو گا، وہ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ مادر گیتی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا عظیم قائد، عظیم مدبر، اور داعی انقلاب پیدا نہیں کیا، وہ ڈاکٹر صاحب کے اس خراج تحسین کو بھی مان لیں گے، کہ :

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار میں مذہبی اقتدار اور

جمہوریت کا کچھ ایسا حسین انداز کا امتزاج تھا جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔" (یہ ہے نبی کی تعریف۔؟ معاذ اللہ۔ ناقل)

(فکرو نظر ج ا ش ا ص ۱۸)۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ کی تمام جزئیات جن کا تعلق خالص اخلاق سے ہے' ان کو تسلیم کر لینے میں انہیں ذرا تامل نہ ہوگا' بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی اخلاق وعادات' صبرو استقامت' لیاقت و قابلیت کو بسرو چشم قبول کرنے میں بڑے عالی ظرفی کا ثبوت دیں گے' لیکن انہیں جس امر کے تسلیم کئے جانے سے انکار ہے اور جسے تسلیم کئے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات کی تمام "گردان" بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "صاحب شریعت" نبی تھے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے یا جو کچھ کرتے تھے' وہ کبھی اپنے دل ودماغ' عقل وفہم اور بصیرت وادراک سے نہیں بلکہ "وحی الٰہی" کے ذریعہ کہتے تھے اور مامور من اللہ ہونے کی حیثیت سے کرتے تھے' وحی الٰہی' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر قول وفعل' حرکت وسکون' نشست وبرخاست' صلح وجنگ' اور عبادت ومعاشرت کی ذمہ دار اور نگراں تھی' اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر قول وفعل دین وشریعت کا مستقل ماخذ اور وحی خداوندی کے مطابق دین کا ناقابل تنسیخ قانون ہوتا تھا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف نبی مرسل ہی نہ تھے' بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ آپ تمام ادیان کے ناسخ بھی تھے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے دین موسوی' دین عیسوی' اور خطہ عالم کے تمام ادیان پر خط تنسیخ کھنچ گیا' وصول الی اللہ کے دوسرے تمام راستے بند ہوگئے' معراج انسانیت کی تمام سعادتیں صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقش قدم اور اسوۂ حسنہ میں منحصر ہوگئیں اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد صرف "امتیں" نہیں' بلکہ امتوں کے نبی اور اولوا العزم نبی بھی آپ ہی کے فیصلے' آپ ہی کے قانون' آپ

ہی کی شریعت، آپ ہی کی تعلیم اور آپ ہی کی کتاب و حکمت کے تابع ہوں گے، اسی پر بس نہیں، بلکہ آپ خاتم النبیین اور آخری نبی بھی ہیں، آپ ﷺ کی وحی آخری وحی، آپ کی کتاب آخری کتاب ہے، اس لئے آپ ﷺ کی شریعت ایسی جامع اور ناقابل تنسیخ قانون شریعت ہونا چاہئے کہ اس کے بعد قیامت تک کے لئے کسی شریعت، کسی قانون، کسی دینی نظریہ، تھیوری اور اتھارٹی کی ضرورت باقی نہ رہ جائے۔ (ملاحظہ ہو حجتہ اللہ البالغہ باب الحاجہ الی دین تنسیخ الادیان ص ۱۱۸ مطبوعہ منیریہ)

الغرض "دانشوران مغرب" کو اپنی تمام علمی کاوشوں کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، رسالت، وحی، کامل، واکمل شریعت، اور ماموریت من اللہ سے انکار ہے اور شدید انکار ہے ورنہ جیسا کہ ہم نے ابھی کہا، آپ ﷺ کے بارے میں اخلاقی مصلح، عظیم مفکر، داعی انقلاب، محسن انسانیت وغیرہ نہایت خوبصورت القاب کے تسلیم کرلینے میں ان کا کیا بگڑتا ہے، ان کے مذاہب پر کیا حرف آتا ہے، ان کے تحریف "شدہ مجموعہ کتب" پر کیا زد پڑتی ہے، اور ان کی بہیمانہ خواہشات کی آزادروی کی کیا حوصلہ شکنی ہوتی ہے؟

یہ ہے فلسفہ ارتقا کا "بنیادی پتھر" جسے ہمارے ڈاکٹر صاحب نے دانایان فرنگ سے حاصل کیا اور بڑی سادہ مزاجی، مگر پُرمکاری کے ساتھ اس پر "ارتقا اسلام" کی عمارت اٹھانا شروع کردی، یعنی یہ کہ آنحضرت ﷺ اساسی طور سے بنی نوع انسان کے اخلاقی مصلح تھے" آپ کو اس کی فرصت ہی کہاں ملی کہ آپ امت کے لئے قانون بناتے۔

ہم پھر ایک دفعہ اس حقیقت پر زور دینا چاہتے ہیں، کہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں "اساسی طور پر اخلاقی مصلح" کا نظریہ بظاہر کتنی ہی جاذبیت، دل آویزی

اور دل فریبی کیوں نہ رکھتا ہو، لیکن اس کی تہ میں یقین مانیئے "آپ ﷺ کی نبوت و رسالت اور دین و شریعت کے انکار" کا "چور" چھپا ہوا ہے، ہم صاف کہیں گے کہ جن اہل مغرب نے یہ نظریہ پیش کیا، یہ ان کی کور چشمی، ہٹ دھرمی، منتقمانہ باطنی کی دلیل ہے، اور ان کے جن مشرقی "شاگردوں" نے اسے قبول کیا یہ ان کی سادہ لوحی، خود فریبی اور ایمان سے محرومی کا نشان ہے، ہمارے ان "فریب خوردہ" دوستوں کو اگر ان الفاظ میں درشتی اور گرانی کا احساس ہو، تو میں ان سے بصد احترام، معذرت کرتے ہوئے درخواست کروں گا کہ مجھے یہ سوال کرنے کا حق دیجئے کہ قرآن مجید کی کس آیت میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے، کتاب الٰہی کے کس فقرے میں آپ کو "ایہا المصلح" سے خطاب کیا گیا ہے، حضور اقدس ﷺ کے کس ارشاد میں اس "اساسی حیثیت" کو بیان فرمایا گیا ہے، اور اسلامی تاریخ کی چودہ صدیوں میں کس صحابی، تابعی، فقیہ اور امام نے یہ کہا کہ آپ ﷺ کی "اساسی حیثیت" "اخلاقی مصلح" کی تھی اور بس۔؟

کسی کو غلط فہمی نہ ہونی چاہئے، ہمیں آنحضرت ﷺ کے "اخلاقی مصلح" ہونے سے انکار نہیں، بلکہ ڈاکٹر صاحب کے "اساسی" نظریہ کے منفی پہلو سے انکار ہے یعنی ہم اور تمام دنیا اسلام آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت اور دین و شریعت پر ایمان لائے ہیں "اخلاقی مصلح" کا تصور "عقیدہ نبوت" کا جزو لاینفک ہے، اس لئے کہ "اخلاقی اصلاح" دائرہ نبوت میں آپ سے آپ آجاتی ہے، ہر نبی لازماً اخلاقی مصلح بھی ہوتا ہے، مگر ہر "اخلاقی مصلح" تو "نبی" نہیں ہوتا، دیکھنا یہ ہے کہ ان مغربی دوست نما دشمن کافروں اور معاندوں کے سوا بھی کسی اور محقق و مورخ کو کبھی یہ سوجھا ہے، کہ آپ ﷺ اساسی طور سے بنی نوع انسان کے اخلاقی مصلح

تھے""؟ اور کیا آپ کی اس حیثیت سے کسی کافر کو بھی انکار ہے؟ اور کیا اس نظریہ کو تسلیم کر لینے سے ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب کفر کی دلدل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟

ڈاکٹر صاحب! آپ جس فلسفہ کے زور سے بقول خود دین اسلام کی پوری عمارت کو منہدم کر دینے کا خواب دیکھ رہے تھے (ملاحظہ ہو فکر و نظر جلد ا ش ۷-۸ ص ۱۰ سطر ا' ۲) خود اسی کی بنیاد "جہنم میں گرتے ہوئے کنارے" پر کھڑی ہے' یعنی آنحضرت ﷺ کے بارے میں "خاتم النبیین" کے عقیدہ کی بجائے اساسی طور پر اخلاقی مصلح" کا نظریہ' جسے انہوں نے اپنے یہودی اساتذہ سے حاصل کیا' اور ابلہ فریبی سے اپنے فلسفہ ارتقا کا اسے سنگ بنیاد بنا ڈالا ہے۔

اب ڈاکٹر صاحب کے لئے دو ہی راستے ہیں' اگر وہ اپنے اس نظریہ پر' جو انکار نبوت کے ہم معنی ہے' قائم رہتے ہیں' تو مسلمانوں کو بجا طور پر یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ "ڈاکٹر صاحب کا آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت اور اسلام کی حقانیت پر ایمان نہیں' ان کا جگہ جگہ آپ ﷺ کو نبی یا پیغمبر (بغیر درود و سلام) کہنا اہل مغرب کی نقالی ہے۔ اور اگر وہ اپنے اس نظریہ سے دستبردار ہو کر آنحضرت ﷺ کو تمام لوازم نبوت سمیت "نبی" ماننے کے لئے تیار ہوں تو ان کے فلسفہ ارتقا کی پوری عمارت دھڑام سے نیچے آ گرتی ہے' اس لئے انہیں یا اپنے ایمان و اسلام کو بچانا ہو گا یا اس مغرب کے چبائے ہوئے لقمے فلسفہ ارتقا کو؟ دونوں کو یک جا کرنے سے انہیں معذوری ظاہر کرنی ہو گی' خوب کہا ہے :

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
بڑے ہی تیز ہیں یورپ کے "رندے"

(اقبال)

۲ ــــ اب ذرا دوسرے "ارتقائی اصول" پر غور کیجئے' کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ "شارع" نہ تھے' آپ ﷺ نے اسلام کی ترقی کے لئے قانون سازی نہیں کی' نہ از روئے قیاس اس کے لئے آپ ﷺ کو فرصت تھی۔ (ملاحظہ ہو فکر و نظر جلد ا' ش ا ص ۱۸) یہ نظریہ بھی خالص یہودیانہ ذہنیت کی پیداوار ہے جسے ہمارے قابل رحم ڈاکٹر صاحب نے بڑی ہی معصومیت کے ساتھ پیش کیا ہے' اور ان کی سادہ لوحی نے اسے "وحی آسمانی" کی طرح قطعی سمجھ کر اس فلسفہ ارتقا کی بنیاد میں چن دیا' جس سے وہ قدیم دین اسلام کی پوری عمارت کی بنیاد اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں' یہ نظریہ نہ صرف نبوت محمدیہ (علٰی صاحبہا الصلاۃ والسلام) کو بلکہ پوری تاریخ نبوت کو مسخ کردیتا ہے' آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا محمد ﷺ تک جتنے انبیا علیہم السلام تشریف لائے ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی آسمانی شریعت پر خواہ وہ جدید ہو یا قدیم 'قائم تھا "شریعت" کے بغیر "نبوت" کا تصور ہی ابلہانہ خیال ہے' تاریخ نبوت میں ایک نبی کا نام تو بتلایا جائے جس کے پاس کوئی نہ کوئی شریعت نہ ہوئی ہو' کسی آسمانی قانون کا تابع' اور کسی قسم کے "اصول تشریع" پر قائم نہ تھا؟ (۱)

مگر یہ مسئلہ یہودی پروفیسر اسمتھ سے نہیں' بلکہ قرآن سے سمجھا جاسکے گا' ڈاکٹر صاحب کی مشکل یہ ہے' کہ وہ قرآنی آیات کو "یہودی عینک" کے بغیر پڑھنے سے معذور ہیں۔ خیر سنئے ڈاکٹر صاحب! قرآن اعلان کرتا ہے کہ :

"لکل امة جعلنا منکم شرعة ومنھا جا۔" (مائدۃ ر ۴۸)

---

(۱) الڈ فضل الرحمٰن کا فرض ہے کہ وہ اپنے "مزعومات" کے ثبوت میں اسی طرح قرآن کریم کی "آیات" پیش کریں۔ فرضی قیاس آرائی' اور "قلمی ساحری" سے اب کام نہ چلے گا۔ ۱۲۔ مدیر)

ترجمہ: ہم نے ہر امت کے لئے ایک شریعت' اور ایک منہاج مقرر کیا"۔

"لکل امة جعلنا منسکا ھم ناسکوہ۔"

(الحج، ٦٧)

ترجمہ: "ہم نے ہر امت کے لئے ایک راہ شریعت مقرر کی جس پر وہ چلا کئے۔"

"شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحًا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسٰی وعیسٰی۔"

(الشوریٰ۔ ١٣)

ترجمہ: "اللہ نے تمہارے لئے بھی اسی دین کی وصیت کی ہے جس کی وصیت نوحؑ کو کی تھی' اور جس کی وحی تمہاری طرف بھیجی ہے' اور جس کی وصیت ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی کی تھی۔"

"ثم جعلناک علٰی شریعة من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون۔"

(الجاثیہ۔ ١٨)

ترجمہ: پھر ہم نے آپ ﷺ کے لئے دین کی ایک شریعت مقرر کی ہے' پس آپ ﷺ اسی کی پیروی کرتے رہیں اور نادان لوگوں کی خواہشات کی پیروی ہرگز نہ کریں۔"

لیکن ڈاکٹر صاحب ان قرآنی اعلانات کے علی الرغم' اعلان کرتے ہیں کہ نبی (ﷺ) "شارع" یعنی صاحب شریعت نہ تھے' ہمیں حیرت ہے' کہ آج ڈاکٹر

صاحب ایسے ذی علم شخص کی بدولت اس "بدیہی" مسئلہ پر قلم اٹھانا پڑ رہا ہے جس کے انکار کی توقع، کسی نادان، جاہل، مجنون، اور دیوانے سے بھی نہیں کی جاسکتی تھی،

ڈاکٹر صاحب بھولتے ہیں یا وہ نہیں جانتے یا نہیں جاننا چاہتے کہ نبی کو "قانون سازی" کی ضرورت نہیں ہوتی، نبی کو تو بنا بنایا "قانون شریعت" وحی آسمانی کے ذریعہ دیا جاتا ہے، اور نبی اس قانون شریعت کا مبلغ اور نافذ کنندہ ہوتا ہے خود بھی اس پر مضبوطی اور سختی کے ساتھ قائم رہتا ہے، اور امت کو بھی قولاً وفعلاً اسی کی تعلیم دیتا ہے، اسی لئے نبی کا ہر قول وفعل "شرع الٰہی" کی تفسیر و تشریح ہوتا ہے اور احکام شرعیہ کا "ماخذ دوم" ہونے کی وجہ سے حجت ہوتا ہے۔ ۲۳ سالہ تشریعی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساکن وساکت اور چپ چاپ بیٹھے نہیں رہے، بلکہ ہر آن اور ہر ساعت جو اقوال وافعال آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرزد ہوئے، وہی تمام اقوال وافعال و تقریر (بیان سکوتی) "قانون شریعت" تھے اور اس قانون شریعت کی تدوین کے لئے کاغذی فائلوں اور قرطاسی پرزوں کی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ ہزاروں صحابہ کرامؓ کی شکل میں زندہ "ریکارڈ مشینیں" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون شریعت کا ریکارڈ لینے اور اسے محفوظ ومدون کرنے میں مصروف عمل تھیں، دار ارقم اور مسجد حرام، مکہ مکرمہ میں، مسجد نبوی اور مسجد قبا مدینہ منورہ میں، وادی بدر، وادی حنین، اور میدان تبوک وغیرہ سفر میں اس قانون شریعت کی ---کلیات الشرعیہ--- لا یونیورسٹیاں تھیں، جن میں اس قانون کے اصول و فروع اور ان کی عملی صورتیں سمجھائی اور عمل کرائی جاتی تھیں، "وحی الٰہی" ان طلبہ کو صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ کی ڈگریاں دے رہی تھی، اور "عنایت الہیہ" انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کے لئے ان کو آلہ کار اور قانون شریعت کی نشرواشاعت کا ٹیپ ریکارڈ بنا رہی تھی اور آیت کریمہ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ان کی تصدیق و توثیق کر رہی

تھی کہ رہتی دنیا تک کوئی ان کو دروغ گو نہ کہہ سکے' ان کی صداقت' دیانت اور امانت پر حرف گیری نہ کر سکے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "آپ کو اتنی فرصت ہی نہ تھی" بے ادبی معاف ہو' تو میں کہوں کہ مغرب کی یہودی تعلیم و تربیت نے ان کو نبوت کے صحیح تصور سے اندھیرے میں رکھا ہے' اس لئے وہ بار بار نبی کے لئے "قانون سازی" کی فرصت کا سوال اٹھاتے ہیں' کیا وہ مجھے یہ سوال کرنے کی اجازت دیں گے؟ کہ نبیؐ کی ۲۳ سالہ زندگی کا کون سا لمحہ وحی الٰہی کے تحت تشریع قانون سے خالی رہتا تھا' آپؐ کا تو کھانا' پینا' سونا جاگنا' چلنا پھرنا' گھر میں' گھر کے لوگوں سے اور گھر سے باہر اصحاب و اتباع سے ملنا جلنا' کیا یہ سب اقوال' احوال اور اخلاق مسلمانوں کے لئے "شریعت" نہ تھے؟ کسی کو مبالغہ کا وہم نہ ہو' بلاشبہ نبیؐ کا تو سونا بھی تشریع سے فارغ نہیں ہوتا' نہ اس حالت میں وحی الٰہی کا تعلق نبی سے منقطع ہوتا ہے اس لئے کہ نبی کی شان یہ ہے کہ ان عینی تنام ولا ینام قلبی اس لئے نبیؐ کی ہر خلوت و جلوت' قول و فعل صحت و مرض' بیداری و خواب' جینا اور مرناسب امت کے لئے ماخذ قانون شریعت ہوتی ہے' قرآن عظیم اس کی شہادت دے رہا ہے۔ قل ان صلوتی ونسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین اسی لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں :

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوہ حسنۃ"

ترجمہ: اے نبیؐ کی امت تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔"

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی خاص قول و فعل اور عبادت و معاشرت کو نہیں' بلکہ سرتاپا نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات معصوم کو مسلمانوں کے لئے بہترین نمونہ عمل قرار دیا گیا ہے' اب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ نبی کی شخصیت

سے جو کچھ بھی صادر ہوگا۔ وہ امت کے لئے شریعت، قانون اور دستور العمل بنتا چلا جائے گا۔ (۱)

آپ چاہیں تو اسے یوں تعبیر کرلیں، کہ نہ نبی ﷺ شریعت الہیہ سے کبھی ایک انچ ہٹنے پاتا ہے، نہ شریعت نبی علیہ الصلوۃ والسلام سے ایک لمحہ کے لئے الگ ہوسکتی ہے، نبی جو راہ اختیار کرلیتا ہے، وہی راہ شریعت بن جاتی ہے اور نبی جہاں بیٹھ جاتا ہے، وہی ہیئت نشست شریعت کا قانون بن جاتی ہے۔

جب نبی کی زندگی اور موت کا ہر لمحہ رضائے الٰہی میں فنا ہوکر صرف خدا کے لئے وقف ہوکر رہ جاتا ہے تو کون کہہ سکتا ہے، کہ نبوی زندگی کا کوئی لمحہ بھی تشریع (بیان احکام شریعت) سے خالی جاتا ہوگا؟ جب کہ نبی کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس پر تعجب ہے کہ آپ ﷺ کو "تشریع" کی فرصت ہی کب تھی، اور ہمیں اس پر تعجب اور فخر ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو "تشریع" سے فرصت کب تھی اور کہاں تھی؟ (دیکھئے "کی" اور "سے" کا فرق کہاں سے کہاں پہنچ گیا)۔

ڈاکٹر صاحب نے شریعت محمدیہ (علی صاحبها الف الف صلوۃ وتحیۃ) کے انکار تشریع پر کتنی وزنی اور معقول دلیل بیان فرمائی ہے یعنی "قیاس یہ کہتا ہے" مجھے ان کے خفا ہوجانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو بصد ادب عرض کرتا، کہ آنجناب نے تمام شریعت اسلامیہ اور دین خداوندی کو رد کرنے کے لئے "قیاس یہ کہتا ہے" کی منطق جو اختراع کی ہے اس کی بہ نسبت تو صرف ایک امر الٰہی (سجدہ آدم) کو رد کرنے کے لئے "قیاس یہ کہتا ہے" کی "ابلیسی منطق" کئی درجے زیادہ وزنی ہے، اس لعین نے

---

(۱) مگر مصیبت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کان میں گولڈ زیہر نے پھونک دیا کہ حدیثیں سب زمانہ بعد کی پیداوار ہیں۔ ملاحظہ ہو الدراسات الاسلامیہ (از مدیر)

اپنے "قیاس یہ کہتا ہے" کو ثابت کرنے کے لئے منطقی انداز میں (انا خیر منه خلقتنی من نار وخلقته من طین) غلط سلط فرضی مقدمات (صغریٰ' کبریٰ) ترتیب دے کر ایک منطقی قیاس تو بیان کر ہی ڈالا' مگر "آپ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا" آپ نے صرف "قیاس یہ کہتا ہے" ہی پر کفایت فرمائی' اس "قیاس" کے لئے کچھ فرضی مقدمات ہی ترتیب دے لئے ہوتے۔

پھر ڈاکٹر صاحب کے قیاس نے جو کچھ کہا ہے' یعنی "نبی کو تشریع کی فرصت نہ تھی" اسے ایک لمحہ کے لئے بفرض محال تسلیم کرلیجئے' تو کیا فوراً" یہ سوال نہ ہوگا' کہ کیا وحی نازل کرنے والا خدا بھی "عدیم الفرصت" تھا' اس نے اپنے نبی ﷺ کو "لاقانونیت" کی زندگی کیوں گزارنے دی' اور اگر قانون شریعت کی تدوین کے لئے "ادارہ تحقیقات اسلامیہ" ہی کی ضرورت تھی تو فرشتوں کا ایک "بورڈ" مقرر کردیا جاتا' آخر جو کام آج ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی سی "اداری" کرڈالنا چاہتی ہے' ڈاکٹر صاحب کا قیاس کیوں یہ کہتا ہے' کہ وہی کام نہ خدا کرسکتا تھا نہ اس کے فرشتے' نہ نبی ﷺ سے وہ ہوسکتا تھا' نہ جلیل القدر صحابہ کرامؓ سے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ :

بریں عقل ودانش بباید گریست

کچھ بھی ہو ڈاکٹر صاحب کا "قیاس" کہے یا نہ کہے' لیکن واقعہ یہی ہے' کہ حق تعالیٰ نے تمام انسانی حاجات کے لئے کافی ووافی قانون شریعت "قرآن وحکمت" کی شکل میں نازل فرمایا' آنحضرت ﷺ نے اس کی تلاوت اور تعلیم فرمائی' قولاً وفعلاً تبیین (تشریح) فرمائی' مجتہدین' صحابہ' تابعین اور ائمہ دین نے اس کی تعبیرو تفسیر کو اس قدر نکھار دیا' کہ الحاد وزندقہ' اور تغییرو تحریف کے سب دروازے بند ہوگئے'

اب جو شخص اس تشریح و تفسیر پر حملہ کرے گا' اسے شریعت کا انکار کئے بغیر چارہ نہ ہو گا' ہمارے ڈاکٹر صاحب کا دامن ایمان اسی انکار کی خار زار میں الجھ کر تار تار ہو رہا ہے' نعوذ باللہ من فتنۃ الصدر۔

ڈاکٹر صاحب سالہا سال کی مغربی تعلیم اور "استشراقی" تربیت کے باعث "انکار شریعت محمدیہ" اور "ہدم دین اسلام" کے جس مقام پر راسخ القدم ہیں اس کے پیش نظر ان سے اور ان کے مکتب فکر سے بظاہر یہ توقع مشکل ہے' کہ وہ ہم غریب "قدامت پسندوں" کی معروضات پر توجہ' اپنے مغربی نظریات پر نظر ثانی اور بیچارے اسلام پر "رحم" کرنے کے لئے تیار ہوں گے' بلکہ یہاں تو صورت حال یہ ہے کہ : "میں کہوں گا حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟" لیکن پھر بھی دل چاہتا ہے کہ کم از کم "معذرۃ الٰی ربکم" کے درجہ میں سہی' اس سلسلہ میں کچھ مزید گزارش کی جائے ولعلھم یتقون۔

انکار شریعت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا سب سے بڑا وسوسہ کہئے یا شبہ' یہی ہے کہ نبی کو "تشریع" یا ان کے لفظوں میں "قانون سازی" کی فرصت کہاں تھی؟ حالانکہ اتنی بات ڈاکٹر صاحب بھی جانتے ہوں گے' کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ۲۳ سالہ تشریعی زندگی میں فرد اور معاشرہ دونوں سے متعلق تمام ہی امور سے سابقہ پڑا ہے' ذاتی اور نجی زندگی سے لے کر حکومت کے انتظام و انصرام' اور بین المملکتی' تعلقات تک سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسائل زندگی ایک ایک کر کے آئے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ نے (معاذ اللہ) ان پیش آمدہ مسائل کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ وحی الٰہی' فراست نبوت' اور ہمت ملکیہ یا ڈاکٹر صاحب کی اصطلاح میں ملہمانہ بصیرت' کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کی تمام مشکلات کا حل پیش کیا ہے' پیش آمدہ مسائل کی ایک ایک گرہ کو کھولا ہے اور زندگی

کے "ہر موڑ" پر آپ ﷺ نے امت کے لئے راستہ معین فرمایا ہے' کیا ان تمام امور کو آنحضرت ﷺ کی "تشریع" یا باصطلاح جدید "قانون سازی" نہ کہا جائے گا؟ نبی ﷺ کے لئے یہ تشریع کتنی آسان ہے' اس کے لئے کسی طویل فرصت' اور تحقیقاتی بورڈ کی قطعا حاجت نہیں۔ کہ نبی ﷺ ایک دفعہ وضو کرکے دکھلاتا ہے' تو "کتاب الوضوء" کی سینکڑوں جزئیات کی تعلیم و تشریع ہو جاتی ہے' نبی ﷺ وحی الٰہی کی روشنی میں امت کے سامنے نماز کی دو چار رکعتیں پڑھتا اور پڑھاتا ہے تو "کتاب الصلوة" کے ہزاروں مسائل کی تشریع کا دروازہ کھل جاتا ہے' اسی طرح زکوة' روزہ' حج قربانی' جہاد' نکاح وطلاق' بیع و شراء' حدود و قصاص' صلح وجنگ وغیرہ عبادات ومعاملات ومعاشرت کے لاکھوں مسائل میں سے ایک ایک کی تشریع' نبی ﷺ اپنی عملی اور فعلی تعلیم سے چند منٹوں میں کر دیتا ہے' اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ نبی ﷺ کی ۲۳ سالہ زندگی بھی تشریع کے لئے ناکافی تھی؟

اور یہ تو آپ ﷺ کی فعلی تشریع کا حال ہے' اسی کے ساتھ اگر آپ ﷺ کے ارشادات' کلمات طیبات اور جوامع الکلم کو بھی ملالیا جائے' تو تشریع نبوی ﷺ کا مسئلہ اور بھی اقرب الی الفہم ہو جاتا ہے۔ یہاں صرف ایک' مثال عرض کرتا ہوں' نبی علیہ الصلوة والسلام ایک معصوم بچے سے ازراہ ملاطفت ومزاح فرماتے ہیں : یا ابا عمیر! ما فعل النغیر۔(اے ابو عمیر! وہ چڑیا کیا ہوئی؟) یہ بادی الرائی میں ایک معمولی سا فقرہ ہے جس کے حروف کی تعداد ۱۷۔ ۱۸ سے زائد نہیں' لیکن یہی چند حرفی فقرہ جب لسان نبوت سے صادر ہو جاتا ہے' تو مزاج شناسان نبوت کو اسی سے بیسیوں بلکہ تقریباً" ایک صد مسائل شرعیہ کا سراغ مل جاتا ہے' ملاحظہ ہوں شروح حدیث۔ جس نبی علیہ الصلوة والسلام کا اعلان برحق یہ ہو :

"اوتیت جوامع الکلم' واوتیت علم الاولین والاخرین"۔

ترجمہ :"مجھے جامع کلمات اور اولین و آخرین کے علوم عطا کئے گئے ہیں۔"

اس نبی علیہ السلام کے بارے میں ....میں نہیں سمجھتا---- کہ کسی مومن کے منہ سے یہ بات بھی نکل سکتی ہے کہ آپ ﷺ کو معاذ اللہ تشریع کی فرصت نہیں ملی۔

تقریب الی الفہم کے لئے وحی اور نبی ﷺ کے باہمی تعلق کو "روح وجسم" یا "قوت برقی اور مشینی آلات" کے مابین تعلق سے سمجھا جاسکتا ہے' جس طرح جسم کے تمام اعضا کی ساخت پوری' ٹھیک اور درست کردینے کے بعد قدرت الہیہ اس پر روح کا فیضان کرتی ہے' اور مرکز جسم---- قلب---- سے روح کا تعلق جوڑ دیا جاتا ہے' تو تمام اعضا جسم فوراً اپنا اپنا کام شروع کردیتے ہیں' کان سننے لگتے ہیں' زبان گویائی میں مصروف ہوجاتی ہے' آنکھیں محو تماشا ہوجاتی ہیں' پاؤں تگ ودو کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں' ہاتھ قبض و بسط' داد و ستد'اور گرفت وگزار' میں منہمک ہوجاتے ہیں' الغرض جسم کے تمام آلات وجوارح' اور قوائے شعور واحساس کے یہ تمام افعال بظاہر جسم ہی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں' لیکن حقیقت شناس جانتا ہے کہ یہ تمام افعال "روح" کا فیض ہے' اور اعضا جسم اس کے لئے "آلہ کار" ہیں' یا کسی "مشینری" کے تمام پرزوں کو پوری طرح فٹ کردینے کے بعد برقی خزانہ سے جب بجلی چھوڑی جاتی ہے اور ان مشینی آلات کا برقی طاقت کے ساتھ رابطہ قائم کردیا جاتا ہے' تو پوری مشین اور اس کا ایک ایک پرزہ اپنا عمل شروع کردیتا ہے' یہاں بھی ان مشینی پرزوں کی حرکت اور عملی تگ ودو ان کی ذاتی نہیں' بلکہ یہ تو صرف قوت

کہربائیہ کے لئے "آلہ کار" ہیں، ٹھیک اسی طرح---- لیکن بلا تشبیہ---
نبی ﷺ کے قوائے علمیہ و عملیہ کی تکمیل، کے بعد جب نبی ﷺ کے
قلب اطہر کا "ملاء اعلیٰ" سے رابطہ قائم کردیا جاتا ہے اور وحی الٰہی کی "برقی روح" کا
اس پر فیضان ہوتا ہے، تو وحی کی تشریح و تفسیر اور اس کے منشا کی تفصیل و توضیح کے
لئے نبی ﷺ کی شخصیت سراپا عمل بن جاتی ہے، پھر اس سے جو کچھ صادر ہوتا
ہے، وہ ایک ظاہر بیں کی نظر میں نبی کا عمل ہوتا ہے، لیکن حقیقت شناس جانتا ہے کہ
یہ سب وحی الٰہی کی کار فرمائی ہے، نبی ﷺ اس کے لئے جارحہ (آلہ کار) کی
حیثیت رکھتا ہے، وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی۔

پھر جس طرح یہ ناممکن عادی ہے کہ جسم کے تمام اعضا بالکل صحیح سالم ہوں،
اور روح کا تعلق بھی جسم سے قائم ہو، لیکن جسم، روح کے اشارہ چشم و ابرو کی تعمیل
نہ کرے، یا مشینی پرزے بالکل ٹھیک حالت میں اپنی اپنی جگہ فٹ ہوں، اور بجلی کا
کنکشن بھی ان سے ٹھیک ٹھیک قائم ہو لیکن اس کے باوجود یہ مشینی آلات گردش
میں نہ آئیں، اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے، کہ نبی ﷺ جن کے قبل از نبوت ہی
اعضا و جوارح، ملکات و قویٰ، احساسات و رجحانات، اور اخلاق و عادات کو ہر نقص سے
پاک کردیا جاتا ہے، کے ساتھ سلسلہ وحی قائم ہوجانے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی
آپ منشائے وحی کی تعمیل میں کوتاہی کریں، ارشاد خداوندی ہے :

ما ضل صاحبکم وما غویٰ، وما ینطق عن
الھویٰ، ان ھو الا وحی یوحیٰ۔

(النجم۔ ۲ تا ۵)

ترجمہ :"نہ تمہارا نبی راہ بھٹکا، نہ کج راہ ہوا، وہ اپنی خواہش سے

نہیں بولتا' وہ تو صرف وحی ہے جو اس کے پاس بھیجی جاتی ہے۔"

اس لئے کہ اس رابطہ کے بعد نبی کا ہر قول و فعل' اور خلق و عمل وحی ربانی کی امہ داری سے وقوع پذیر ہوتا ہے' پھر جس طرح لوہا' پیتل وغیرہ کے سیال اور پگھلے ہوئے مادہ کو مختلف قالبوں میں انڈیل دیا جاتا ہے' اور وہ جو ایک مادی وحدت تھی ان قالوں میں جاکر نوع در نوع شکلوں میں متشکل اور مختلف ڈیزائن کے گوناگوں پرزوں میں تبدیل ہوجاتی ہے' ٹھیک اسی طرح' بلا کیف و تشبیہ' وحی الٰہی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی قوالب میں ڈھلتی ہے' تو اعتقادات' عبادات' معاملات' سیاسیات' معاشیات' اور اخلاق کے تشریعی قوانین کی شکل میں متشکل ہوکر ظہور پذیر ہوتی ہے اور حکمت کا نام پاتی ہے۔ ویعلمہم الکتاب والحکمۃ (ای السنۃ کما فسر بہ کبار الصحابۃ والمفسرین)۔

الغرض نہ وحی خداوندی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے بغیر--- اپنی تفصیلی تشریحات و تعبیرات میں--- ظہور پذیر ہوتی ہے نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو وحی سے جدا کیا جاسکتا ہے' وحی کا صحیح مفہوم اور اس کی ٹھیک تعبیر اسی وقت ممکن ہوگی جب کہ اسے اعمال نبویہ کے جزئیاتی قوالب (یعنی احادیث نبویہ) میں ڈھالکر پڑھا جائے گا' تب ہی اس پر عمل ہوسکے گا' کون نہیں جانتا کہ وحی الٰہی "صلوۃ" کا حکم دیتی ہے' لیکن یہ نماز نبی کے عمل میں متشکل ہوکر ہی سامنے آئی ہے' صلوا کما رایتمونی اصلی۔ وحی الٰہی "زکوۃ" کا حکم دیتی ہے' یہ حکم اپنی تفصیلی نوعیت کے ساتھ سنن نبویہ کے آئینہ میں ہی جلوہ گر ہوسکتا ہے' وقس علی ھذا' یہی راز ہے کہ حق تعالیٰ نے کسی نبی مرسل کے بغیر کوئی کتاب نازل نہیں فرمائی' بلکہ کتاب کے ساتھ صاحب کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی بھیجا گیا' تاکہ احکام کتاب کی تفصیل و تعیین تعبیر

و تشکیل اور اس کے رموز و اسرار اور تشریعی قوانین کی توضیح کرے' (۱) واللہ اعلم۔

۳۔۔۔۔۔اب ہم اس فلسفہ کے تیسرے "فرضی" اصول پر بحث کریں گے' اس میں کہا گیا ہے کہ :

"صحابہ کرام پیدا ہونے والے نزاعات کا فیصلہ' اپنی عقل و فہم یا رسوم و رواج کے مطابق خود ہی کرلیا کرتے تھے۔ صرف انتہائی غیر معمولی حالات ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فیصلہ کی زحمت دی جاتی تھی۔' ۳۔ اور بہت ہی خاص حالات میں قرآن کا سہارا لینا پڑتا تھا' ۴۔ لیکن ان قرآنی اور نبوی فیصلوں کی حیثیت بھی محض ہنگامی اور وقتی واقعات کی ہوتی تھی' ۵۔ اس لئے ان کو تشددانہ طور پر قانون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا' ۶۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ ان کو "ایک گونہ نظیر" ہی کہا جاسکتا ہے۔ (فکر و نظر ج ۱ ش ۱ ص ۱۸)۔

یہ چھ کے چھ فقرے بھی خالص یہودی ذہنیت کی پیداوار ہیں' جن میں کفر ونفاق عریاں رقص کررہے ہیں پہلے فقرے میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ دور نبوی میں "لاقانونیت" کا دور دورہ تھا' وہ لوگ کسی اصول' ضابطہ' قاعدہ' اور قانون کے پابند نہ تھے' اسلام سے پہلے وہ اپنی عقل و خرد اور رسوم و رواج کی جس ڈگر پر چلا کرتے تھے' اسلام کے بعد بھی وہ اسی پر بدستور چلتے رہے' اسلام نے انہیں کوئی قانون عبادت' قانون معاشرت' قانون معاملات' قانون سیاست' قانون تعزیر' اور قانون اخلاق نہیں

---

(۱) اس بحث میں وحی اور صاحب وحی کے تعلق کے لئے جو مثالیں ہم نے دی ہیں' ان سے مقصود محض تقریب الی الفہم ہے' ورنہ ظاہر ہے کہ وحی کی اصل کیفیت ہر قسم کی مثال سے بالاتر' ہر تشبیہ سے منزہ اور وراء الوراء ہے۔ ۱۲ از مقالہ نگار)

بلکہ' بلکہ ان کے لئے قانون عمل یا خود ان کی اپنی عقل تھی' یا لے دے کر اسلام سے پہلے کے وہ جاہلی رسوم و رواج جن کو معمولی تبدیلی کے بعد علی حالہ رہنے دیا گیا تھا' کیا اس فقرے کے مضمرات یہی نہیں ہیں؟ اس مفروضہ سے ایک طرف دور نبوی کی تمام تاریخ مسخ ہو جاتی ہے' اور دوسری طرف اسلام کی "عدم افادیت" بلکہ (معاذ اللہ) "لغویت" پر مہر لگ جاتی ہے اور کیا یہ بعینہ ا۔ لامنز (Lammens) ۲۔ مرجیلیوث (Margoliouth) ۳۔ شاخت (Schacht) کا نظریہ سنت نہیں ہے۔

(فکر و نظر ج ا ش ا' ۲ ص ۱۱)

دوسرے اور تیسرے فقرے میں صحابہ کرام کی تاریخ' مزاج اور ذہنیت کو اس قدر تاریک دکھایا گیا ہے جس سے زائد کا تصور ہمارے لئے ممکن نہیں۔ یعنی خدا و رسول کی طرف رجوع کرنے یا ان کے لفظوں میں سہارا لینے کی ضرورت صحابہ کرام صرف انتہائی غیر معمولی حالات' یا بہت ہی خاص حالات میں محسوس کرتے تھے' ورنہ غیر معمولی حالات میں بلکہ خاص حالات میں بھی وہ خدا و رسول سے بے نیاز ہی رہا کرتے تھے' امت کے تمام اکابر محدثین کو "تاریخ ساز" قرار دینے والے "مجتہد" کا اپنا ضمیر اگر اس غلط' بھونڈی' اور مکروہ تاریخ سازی پر "نفریں" نہیں کرتا تو تمام دنیا اندھوں کی نگری نہیں' تاریخ صحابہ کا ہر مبتدی طالب علم بھی اس پر نفریں کہے گا حالات صحابہ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں' کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ نظریہ سورج کے منہ پر تھوکنے کے مترادف ہے'

چوتھے فقرے میں "قرآنی" اور "نبوی" فیصلوں کو محض "ہنگامی اور وقتی" قرار دے کر بعد میں آنے والی امت کا رشتہ ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کاٹنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی' قیامت تک رہنے والی نبوت عامہ' پر کاری ضرب لگانے کی انتہائی مکروہ اور شرمناک کوشش ہے جو خالص منتقمانہ یہودی ذہنیت اور ابدیت دین

محمدی کے خلاف کھلی سازش ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس خالص افترا اور "سفید جھوٹ" کی کیا دلیل ہے کہ قرآن وحدیث اور خدا ورسول کے تمام فیصلے محض وقتی تھے' بعد کی امت کو ان کی پابندی سے چھٹی دے دی گئی تھی۔ جب قرآن کو تاقیامت باقی رہنا ہے' جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کی نوع انسانی۔ اسود و احمر کے لئے نبی رحمت ہیں' جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کے بعد آنے والے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرح امتی ہیں' جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لوگ تھے' جب اسلام "ابدی صداقت" ہے' جسے ہمیشہ رہنا ہے" تو ڈاکٹر صاحب کے کان میں کس شیطان نے یہ صور پھونک دیا ہے' کہ مسلمان قرآن کو کتاب اللہ سمجھا پڑھا ضرور کریں لیکن اس کے فیصلوں کو ہنگامی اور وقتی' اور اس زمانہ کے لوگوں کے لئے' کہہ کر ان سے جان چرایا کریں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "نبی" مانا کریں' لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو یہ کہہ کر رد کردیا کریں کہ وہ صرف انہی ظروف واحوال اور اسی وقت کے لئے تھے' اسلام کو "دین حق" تو تسلیم کیا کریں لیکن اس اعتقاد کے ساتھ' کہ اسلام کے تمام قوانین ہماری "رائے" کے تابع ہیں ہمیں اپنے زمانہ اور حالات کے مطابق ان میں تغیر وتبدل کا اختیار ہے اپنے کو نبی کے "امتی" کہا کریں لیکن ساتھ ہی یہ نظریہ بھی رکھیں کہ ہم نبی کے کسی "فیصلہ" کے اور قول و عمل کے پابند نہیں وہ تو اس زمانہ کے لوگوں کے لئے تھے :

ع "تو ہی بتا کہ پھر کافری کیا ہے"

سچ یہ ہے : یرید ون لیطفؤا نور اللّٰه بافواههم واللّٰه متم نوره ولو كره الكافرون۔

پانچویں فقرے میں ان "مفروضات بالا" کے نتیجہ کے طور پر صاف صاف "کافرانہ" اعلان کردیا گیا' جس کے سننے کی تاب بھی میرا خیال ہے کسی مسلمان کو نہیں ہوسکتی' یعنی "خدا کا فیصلہ بندوں کیلئے اور نبی کا فیصلہ امت کے لئے قانون کا درجہ نہیں رکھتا" اناللہ۔

ڈاکٹر صاحب جس "حکومت" کے نمک خوار ہیں ذرا اس کے بارے میں تو کوئی اعلان کرکے دیکھیں' کہ "اس حکومت کا "دستور" ہم لوگوں کے لئے "دستور کا" اور اس کا "قانون" ہمارے لئے "قانون" کا ایسا درجہ نہیں رکھتا جسے متشددانہ طور پر حرف بہ حرف نافذ کیا جائے' اسی وقت آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجائے گا' لیکن یہ تمام مسخرہ پن خدا ورسول اور قرآن وحدیث ہی کے ساتھ سوجھتا ہے' لیکن ایسے مسخروں کے بارے میں خدا تعالیٰ کا اعلان بھی سن رکھئے :

قل ابا للہ وآیا تہ و رسولہ کنتم تستھزء ون
لا تعتذ روا قد کفرتم بعد ایما نکم۔

(التوبہ: ۶۵۔ ۶۶)

ترجمہ : "اے نبی آپ اعلان کردیجئے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام سے دل لگی کرتے ہو؟ بہانے نہ بناؤ! تم دعوائے ایمان کے باوجود "کافر" ہوگئے ہو۔"

چھٹا فقرہ اس سے بھی بڑھ کر "یہودیانہ" ہے' ہمارے "لائق رحم" ڈاکٹر صاحب خدا ورسول کے فیصلہ کو "نظیر کامل" ماننے کے لئے بھی تیار نہیں' کیونکہ ان کی "اسلامی تحقیقات" کو اس سے بھی خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ ہے بلکہ وہ اسے صرف "ایک گونہ نظیر" قرار دیتے ہیں' گویا "ماتحت عدالتوں" کے لئے "عدالت عالیہ" کا فیصلہ جس احترام کا مستحق ہے' بلکہ ایک متوازی اور ہم مرتبہ عدالت کے لئے

دوسری عدالت کا فیصلہ جس قدر لائق احترام ہے، ڈاکٹر صاحب کے "ماڈرن اسلام" میں خدا اور رسول کے فیصلوں کو اتنا احترام بھی حاصل نہیں۔ استغفر اللہ۔

پھر ڈاکٹر صاحب کے اشہب قلم کی سبک خرامی ملاحظہ کیجئے کہ وہ ایک ہی سانس میں پے بہ پے ان ملحدانہ اور زندیقانہ دعووں کی بھرمار کئے جاتے ہیں، لیکن ان کے لئے حرام ہے کہ کسی ایک دعویٰ کی بھی عقلی یا نقلی توجیہ پیش کریں یا دلیل پیش کریں، صرف اس لئے کہ ان کے ان تمام دعاوی کی "سند" ان کے استاذ محترم یہودی پروفیسر جناب ا سمتھ کے ارشادات ہیں جو ان کے حافظہ میں محفوظ ہیں اور بس! اور ان کا نام لینا مصلحت کے خلاف ہے۔

میں ڈاکٹر صاحب سے باادب التماس کروں گا، کہ آپ براہ کرم مسلمانوں کو "قدامت پرستی" میں مبتلا اور "قبرستانوں کی طرف رخ کرنے والا" رہنے دیں (۱) مسلمان اس نام نہاد "جدید اسلام" کو لے کر کیا چاٹیں گے، جس میں خدا اور رسول کو بھی فیصلے سے معزول کردیا گیا ہو، آپ کے یہ نظریات مسٹر پرویز کے نظریہ "مرکز ملت" ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے، آخر اس ایچ پیچ اور لاگ لپیٹ کی کیا ضرورت ہے؟ صاف صاف کیوں نہیں کہا جاتا کہ "ہم اس زمانہ میں خدا کو خدا، رسول کو رسول، اور اسلام کو دین کی حیثیت سے ماننے کے لئے تیار نہیں، اس کے بعد جس قسم کی تحقیقات کا "شوق فرمائیں" مسلمانوں کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے، ورنہ پھر خدا اور رسول، قرآن وحدیث، اور دین و شریعت کے خلاف زہر اگلنے اور مکروہ پروپیگنڈا کرنے سے آپ کو کیا حاصل؟ بجز اس کے کہ "اپنے کفر کے محضرنامہ" پر دستخط کریں اور "اقبالی مجرم" بنیں اس لئے کہ مسلمان ہزار گنہ گار سہی، مگر اتنی ایمانی رمق ان میں بہرحال

(۱) ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ماضی کی طرح قرآن وسنت کی طرف سادہ رجعت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم قبرستانوں کی طرف رخ کرلیں۔ ملاحظہ ہو "فکر ونظر جلد ۲ ش ۵ ص ا۔۳)

اب بھی باقی ہے' کہ جس ذات پر وہ ایمان لائے ہیں اس کے خلاف آپ کے ان "زہر میں بجھے ہوئے تیروں" کی بارش کو ٹھنڈے دل سے برداشت نہیں کرتے رہیں گے

: ایاز! قدر خویش بہ شناس

آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ مسلمان قوم اپنے نبی ﷺ کی حرمت کے معاملہ میں کتنی غیور' اور سریع الحس واقع ہوئی ہے' "جرأت رندانہ" کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے' کتنی ڈھٹائی اور دریدہ دہنی کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے' کہ خدا ورسول کے فیصلے قانون نہیں بلکہ صرف "ایک گونہ نظیر" کا درجہ رکھتے ہیں۔ کس کے لئے؟ مسلمانوں کے لئے؟ خدا کے بندوں اور محمد ﷺ کے امتی کہلانے والوں کے لئے :

"تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!"

۴ ــــــ اب فلسفہ ارتقا اسلام کے چوتھے اور آخری اصول کو سامنے لائیے' اب تک جتنے اصول ذکر کئے گئے' ان میں خدا ورسول کے فیصلہ کا ذکر "وقتی فیصلہ اور "ہنگامی" کے عنوان ہی کے ساتھ سہی' مگر بہرحال آتا ہے' مگر اس فلسفہ کے مخترعین اعداء اللہ واعداء الاسلام واعداء المسلمین کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ کسی طرح دین اسلام کا رشتہ وحی خداوندی سے کاٹ کر "انسانی افکار کی اختراع" سے مربوط کردیا جائے' چنانچہ یہ مقصد اس چوتھے "ارتقائی اصول" میں صاف صاف اگل دیا گیا' کہا گیا ہے :

"محض مذہب یا حکومت سے تعلق رکھنے والی بڑی بڑی پالیسیوں کے طے کرنے یا اہم اخلاقی اصولوں کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرنے ہی میں آنحضرت ﷺ نے کوئی اقدام فرمایا' لیکن اس کے لئے بھی آپ ﷺ اکابر صحابہ سے مشورہ کرلیا کرتے

تھے‘ یعنی ان کا مشورہ تنہائی میں یا پبلک میں حاصل کرلیا جاتا“۔

(فکرو نظر ج ا ش ا ص ۱۸)۔

اس اردو عبارت کا مفہوم بالکل واضح ہے‘ یعنی (۱) چند پالیسیوں یا اہم اخلاقی اصولوں کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کوئی فیصلہ نہیں فرمایا (۲) وہ فیصلہ بھی محض وقتی ہوتا تھا‘ دوسرے وقت یا زمانہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا‘ (۳) پھر جو فیصلہ بھی آپ ﷺ نے فرمایا وہ ”وحی خداوندی“ یا ”آپ ﷺ کی تنہا رائے اور اجتہاد کا نتیجہ نہیں‘ بلکہ اکابر صحابہؓ کے نجی یا علانیہ مشورہ کا مرہون منت ہوتا تھا‘ لہٰذا اس عبارت سے مندرجہ ذیل سنگین نتائج برآمد ہوں گے :

۱۔۔۔ محمد ﷺ کا پیش کردہ اسلام خدا کا نازل کردہ آسمانی دین نہیں تھا بلکہ معاذ اللہ اسلام‘ محمد ﷺ اور ان کے صحابہ کی شورائی پالیسیوں کے فیصلوں کا مجموعہ اور انسانی ذہن و فکر کے مخترع اصولوں کا نام ہے‘

۲۔۔۔ اسلام‘ پیغمبر اسلام ﷺ کے دور حیات میں بھی کبھی ”جامع و کامل نظام زندگی“ جو فرد اور معاشرے کی تمام شعبہ ہائے زندگی میں دخیل ہو‘ کے خواب سے شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا‘ بلکہ اس کی ”کل کائنات“ ”کل اثاثہ“ اور ”کل سرمایہ“ چند مبہم قسم کے اخلاقی اصول یا پالیسیوں کے فیصلے تھے‘ ورنہ ان کے علاوہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو کوئی اعتقادی‘ عباداتی‘ سیاسی‘ سماجی‘ معاشی‘ معاشرتی اور اخلاقی نظریاتی نظام نہیں دیا‘ نہ ہی کسی قسم کا کوئی فیصلہ فرمایا‘

۳۔۔۔ پھر چونکہ ڈاکٹر صاحب کے بقول یہ تمام اخلاقی اور پالیسی فیصلے بھی وقتی اور ہنگامی تھے‘ اس لئے رحلت نبوی ﷺ اور مرور وقت کے ساتھ ہی اسلام کا یہ ”اثاثہ“ بھی لٹ گیا‘ اس لئے مسلمانوں کو اسلام پر تو اناللہ پڑھ لینی چاہئے‘ اور اپنے

مسائل خود حل کرنے کے لئے نظامہائے زندگی مرتب کرنے چاہئیں اور "لادینی" کو اپنالینا چاہئے ورنہ اسلام ان کی مشکلات کا علاج نہیں کر سکتا۔

اگر میں نے ڈاکٹر صاحب کی اس اردو عبارت کا مفہوم سمجھنے یا اس کے مضمرات کو بصورت نتائج ظاہر کرنے میں ٹھوکر کھائی ہو، تو میں طالب علم کی حیثیت سے اس کے صحیح نتائج کا خیر مقدم کروں گا، اور اگر الفاظ کی سختی نرمی سے قطع نظر میں نے اس اردو عبارت کی صحیح ترجمانی کی ہے، تو اس عبارت اور اس کے پیدا کردہ نتائج پر تبصرہ کا حق سردست محفوظ رکھتے ہوئے، ان تمام دانشمندان ملت سے۔ جنہوں نے قرآن کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو "وقتی" کہہ کر بدل ڈالنے، اسلام کو محمد اور اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم (واصحابہ) کے "شورائی گٹھ جوڑ" کا نتیجہ قرار دے لینے اور اسلام کا کل اثاثہ چند "وقتی پالیسیوں اور اخلاقی اصول" جن کی تفصیل جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن "صاحب بہادر" بھی بتلانے سے قاصر ہیں۔۔۔ مان لینے کا فیصلہ نہیں کرلیا۔۔۔ اپیل کروں گا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے آرا وافکار، اور عزائم ومقاصد کی تہ کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔

ان اريد الا الاصلاح ما استطعت وما توفيقى الا بالله۔

(بینات جمادی الثانی ۱۳۸۶ھ)۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی اسلام کے خلاف زہر افشانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ:

۴ مئی ۱۹۶۶ء سے ۱۱ مئی ۱۹۶۶ء تک امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی میں ایک مذاکرہ ہوا تھا جس میں دنیا کے تمام مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اس مذاکرہ میں ان مذاہب سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے گئے۔
(فکر و نظر جلد ۴ ش ا ص ۹)

اسی "عالمی مذہبی کانفرنس" میں پاکستان کے مندوب' ادارہ تحقیقات اسلامی کے نمائندہ اور اسلام کے وکیل کی حیثیت سے جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب بالقابہ صدر ادارہ تحقیقات اسلامی شریک ہوئے' اس طرح آپ کے لئے اپنے ہم مسلک وہم مشرب' ہم ذوق و ہمراز اور ہم نوالہ و ہم پیالہ احباب سے شرف ملاقات' ہم کلامی اور سات آٹھ دن تک کچھ اپنی کہنے اور کچھ ان کی سننے کا زرین موقع ہاتھ آیا' ذرا تصور کیجئے امریکہ کا آزاد ماحول' پرنسٹن یونیورسٹی کی پُر کیف فضا' نہ خطرہ محتسب' نہ شور و شغبِ ملاّ' ہم اور آپ کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے' کہ سوز و ساز اور راز و نیاز کی کتنی داستانیں دہرائی گئی ہوں گی' اسلام کے کتنے مثالی معیار اور نصب العین طے ہوئے

ہوں گے اور ان کو بدلتے ہوئے مظاہر و احوال میں ترقی پسندانہ عملی جامہ پہنانے کے لئے کیا کیا منصوبے زیر غور آئے ہوں گے۔(۱) "روایتی اسلام" کی تدفین کے لئے کن کن تدابیر پر سوچ بچار ہوئی ہوگی' زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہ تجدد پسندانہ اصلاح اسلام کے کیا کیا وسائل و ذرائع زیر بحث آئے ہوں گے۔ فارسی شاعر کی زبان میں :

آنجا کرا دماغ کہ پرسد زباغیاں
بلبل چہ گفت 'گل چہ شنید وصبا چہ کرد

یہ تمام امور ہمارے لئے بہرحال پردہ غیب میں ہیں' البتہ "مدیر فکر و نظر" کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے انگریزی مقالہ' جو اسلام کی طرف سے آپ نے اس موقع پر پیش کیا تھا' کے اردو ترجمہ کرنے اور اس کی اشاعت کی زحمت فرمائی' مقالہ کا اردو عنوان ہے۔ "اسلام پر تجدد پسندی کے اثرات" یہ مقالہ ایک دو بار نہیں بلکہ کئی بار ہم نے بھی پڑھا۔ اس کے مضمرات پر غور کیا اور ڈاکٹر صاحب کی اسلام پر بحث کو خوب جانچا پرکھا' پہلے ہم اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ڈاکٹر صاحب اس موقع پر اسلامی ملک کے مندوب' اسلامی ادارہ کے سربراہ اور اسلام کے وکیل کی

---

(۱) ڈاکٹر صاحب کے مکتب فکر کے نزدیک اسلام کی تفسیر یہ ہے:" اسلام نام ہے چند مثالی معیارات اور نصب العینوں کا جن کو بدلتے ہوئے معاشرتی مظاہر و احوال میں ترقی پسندانہ طور پر عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے" (فکر و نظر جلد ۲ ش ۱۱ ص ۶۹۶) یہ تفسیر انہوں نے گرو نبون اور بعض دوسرے نامور غیر مسلم محققین سے حاصل کی ہے۔ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۱۲ ص ۷۷۹)

"وہ صدیوں کا اسلام "ان کی اصطلاح میں" "روایتی اسلام" یا "راسخ العقیدہ گروہ کا اسلام" کہلاتا ہے۔ جو ان کے نزدیک مردہ ہے"

حیثیت سے تشریف لے جا رہے ہیں' ان کے نظریات کچھ بھی ہوں لیکن آخر قیامت تو نہیں آ گئی وہ اپنی اس پوزیشن کا لحاظ کرتے ہوئے "مذاہب عالم کانفرنس" میں اسلام کی کچھ تو لاج رکھیں گے' مگر "عالم اسلام" کی امیدوں کے برعکس آپ نے سب کے سامنے اسلام کی وہ پٹائی کی اور جارحیت کا ایسا شدید مظاہرہ کیا کہ ہمیں اپنی خوش فہمی پر ماتم کئے بغیر اور مدیر فکر و نظر کو حکومت اور ادارہ تحقیقات دونوں کی طرف سے "ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں" کا اعلان کئے بغیر نہ بن پڑی' وہ فرماتے ہیں :

> " یہ مقالہ اسی مذاکرہ میں پڑھا گیا' جن خیالات کا اس میں اظہار کیا گیا ہے وہ فاضل مقالہ نگار کی اپنی تحقیق کا نتیجہ ہیں' حکومت پاکستان یا ادارہ تحقیقات اسلامی کی پالیسی سے ان کا کوئی تعلق نہیں"۔
>
> (فکر و نظر جلد ۴ ش ۱ ص ۹)

ہم تمام عالم اسلام بالخصوص مسلمانان پاکستان کی طرف سے "فکر و نظر" کے مدیر محترم کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے سوقیانہ قسم کے مقالہ کی ذمہ داری سے انکار کر دیا' ان کا یہ اقدام مستحق صد مبارکباد ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے مکروہ پروپیگنڈہ کی ذمہ داری نہ کوئی اسلامی حکومت اٹھا سکتی ہے اور نہ کوئی سنجیدہ ادارہ اس بار گراں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اگر وہ یہ اعلان نہ کرتے تو ملک اور بیرون ملک کے زخمی دل مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوتی۔

البتہ یہ معماً ہماری فہم سے بالاتر ہے۔ شاید فکر و نظر کے مدیر محترم اسے حل کر سکیں کہ ایک شخص کسی حکومت یا ادارہ کا نمائندہ اور سفیر بن کر جائے لیکن جب وہ فرائض سفارت دے چکے تو حکومت اور ادارہ اپنے نمائندہ کی ذمہ داری سے انکار

کردے' ادارتی اور سفارتی تاریخ میں اس کی کتنی مثالیں ملیں گی۔؟ یہ تو دیکھا سنا تھا کہ اگر کسی نمائندہ نے حکومت یا ادارے کی پالیسی کا احترام کئے بغیر کوئی بیان جاری کر دیا تو نہ صرف یہ کہ وہ معزول کر دیا جاتا ہے بلکہ اس کے خلاف مناسب کارروائی بھی عمل میں لائی جاتی ہے مگر ہماری ناقص معلومات میں یہ کبھی نہیں آیا کہ سفیر' عہدہ سفارت پر' نمائندہ' منصب نمائندگی پر اور صدر' کرسی صدارت پر بدستور فائز رہتے ہوئے اپنی حکومت اور ادارہ کی پالیسی سے لاتعلق بیان دیتا رہے۔ اس کے باوجود نہ اسے کسی قسم کی سرزنش کی جائے' نہ اس کی معزولی عمل میں آئے' نہ اسے کسی درجہ میں قابل مذمت تصور کیا جائے' بلکہ اس تمام قصہ کو "فاضل مقالہ نگار کی اپنی تحقیق کا نتیجہ" کہہ کر گول کر دیا جائے۔

اور اس معما میں ناقابل فہم پیچیدگی اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جب کہ ہم فکر و نظر کے فاضل مقالہ نگار کے مقالہ میں صدر مملکت اور ادارہ تحقیقات اسلامی کی صاف صاف نمائندگی ان الفاظ میں پڑھتے ہیں :

> " صدر محمد ایوب خان کی حکومت نے ۱۹۶۰ء میں ایک ادارہ' ادارہ تحقیقات اسلامی کے نام سے علوم اسلامی میں تحقیقات اور جدید ضرورتوں کے لئے اسلام کی تعبیر و تشریح کی غرض سے قائم کیا ہے' ۱۹۶۲ء میں اس ادارہ کو ایک آئینی حیثیت دی گئی۔'
>
> (صفحہ ۲۶)
>
> "ادارہ تحقیقات اسلامی کے مطالعہ نے بتلایا۔ الخ" "ادارہ تحقیقات کا استدلال صفحہ ۲۷"

"فاضل مقالہ نگار' کے یہ بیانات کسی وکیل' بیرسٹر اور جج کے سامنے رکھئے کیا وہ یہ فیصلہ دے گا کہ مقالہ نگار صرف اپنے خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے؟ ڈاکٹر

صاحب کے یہ الفاظ پکار پکار کر اعلان کرتے ہیں کہ وہ اپنی زبان سے نہیں، بلکہ صدر مملکت اور ادارہ تحقیقات اسلامی کی زبان سے بول رہے ہیں :

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان اپنی ہے بات ان کی
ان ہی کی محفل سجا رہا ہوں چراغ اپنا ہے رات ان کی

پھر اس معما کی الجھن میں مزید بر مزید اضافہ اس وقت ہو جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ "مقالہ" جو ایک خاص ماحول میں پڑھا گیا تھا، بجائے اس کے کہ اسے دفن کر دیا جاتا، مگر ہوا یہ کہ ایک طرف "ادارہ تحقیقات اسلامی" اس مقالہ کے اردو، عربی، بنگلہ تراجم اپنے مجلّات میں ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر پورے پاکستان بلکہ کل عالم اسلام اور دیگر ممالک میں اس شر کو پھیلاتا ہے۔ اور دوسری طرف بڑی معصومیت اور ابلہ فریبی سے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی شائع کرتا ہے :

" یہ مقالہ نگار کی اپنی تحقیقات کا نتیجہ ہے حکومت پاکستان یا ادارہ تحقیقات اسلامی کی پالیسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

اگر واقعی ادارہ تحقیقات کو اس سے کوئی تعلق نہیں، تو مختلف زبانوں میں بڑی آب و تاب کے ساتھ اس کی اشاعت کے کیا معنی۔؟

ہمیں ادارہ تحقیقات کی اس پالیسی اور طرز عمل سے اندیشہ ہے کہ جس طرح آج "مدیر فکر و نظر" نے اپنے صدر محترم کے متعلق اعلان کر دیا، اسی طرح کل ان کے اسی اعلان کے بارے میں ادارہ کے کوئی دوسرے مدیر صاحب یہ اعلان نہ کر دیں کہ :

"ڈاکٹر صاحب کے مقالہ سے متعلق "مدیر فکر و نظر" نے جو اعلان لاتعلقی فرمایا ہے "فاضل مدیر فکر نظر" کی اپنی تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ حکومت پاکستان یا ادارہ

تحقیقات اسلامی کی پالیسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں"۔

کیا یہاں ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے فکر و نظر کے فاضل مدیر سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ: آپ اپنے ادارہ کی پالیسی کا اعلان بصد شوق کریں' لیکن حکومت پاکستان کی پالیسی کے اعلان کا منصب انہیں کب سے تفویض ہوا۔؟ یہ سوال اس لئے اہمیت رکھتا ہے کہ اگر "ادارہ تحقیقات اسلامی" کے صدر محترم جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا مقالہ "غیر ذمہ دارانہ" ہو سکتا ہے تو ان کے نائب مدیر فکر و نظر کے اعلان پر کون اعتماد کرے گا۔؟ اگر واقعتہً حکومت پاکستان کی پالیسی سے ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات کا کوئی تعلق نہیں تھا' تو حکومت پاکستان کی وزرات اطلاعات و نشریات یا کسی اور متعلقہ محکمہ کی جانب سے کیوں اس سے بیزاری کا اعلان نہ کیا گیا؟ یا حکومت کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ اس قدر غیر اہم اور لایعنی ہے کہ وہ اس کے بارے میں کسی وضاحتی بیان کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی۔؟

بہر حال ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ خود ایک معما ہے اس پر مدیر فکر و نظر کا اعلان لاتعلقی "معما در معما" ہے۔ بایں ہمہ ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ اس "غیر ذمہ دارانہ مقالہ" سے لاتعلقی کا "غیر ذمہ دارانہ اعلان" تو کر ہی دیا:

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے

مقالہ سے متعلق ان ابتدائی امور کے بعد اب اس کے مشمولات پر نظر ڈالئے موصوف اپنی بحث کے حدود متعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہاں مجھے جس مسئلے سے بحث کرنا ہے وہ کافی حد تک محدود اور بسیط ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اسلامی دنیا اور دوسری وسیع تر دنیا دونوں کے لئے بہت زیادہ فوری اہمیت رکھتا ہے میرا ارادہ' تجدید یعنی جدید زمانے کے مطابق اپنے آپ کو کرنے' یا زیادہ

واضح الفاظ میں جدت پسندی کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ اور اسلامی دنیا پر جدید طرز زندگی کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے اس کا ایک مجموعی جائزہ لینا ہے۔ اس سے خود اسلامی دنیا اور دوسری وسیع تر دنیا کے لئے مستقبل قریب میں مسلم معاشرے میں مناسب حد تک متوقع تبدیلیوں کی نوعیت اور وسعت واضح کرنے میں مدد ملے گی۔"

(صفحہ ۱۰)

آپ اس سے سمجھ گئے ہوں گے کہ موصوف تجدید' تجدد' اپنے کو جدید زمانے کے مطابق ڈھالنے یا واضح الفاظ میں جدت پسندی کے عوامل' اثرات اور تدابیر پر بحث کریں گے' یعنی اسلام کو "نئی دنیا" کے مطابق کتنا بدلا جا چکا ہے' کتنا بدلا جا سکتا ہے' کس طرح بدلا جا سکتا ہے اور یہ بدلنا کیوں ضروری ہے؟ اس اقتباس میں موصوف نے دو جگہ اسلامی دنیا کے ساتھ "دوسری وسیع تر دنیا" کے لئے اس مسئلہ کی "بہت زیادہ فوری اہمیت" کا جو ذکر فرمایا ہے اسے کسی طرح نظر انداز نہ کیا جائے' موصوف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اسلام کی تبدیلی میں اسلامی دنیا کو دلچسپی ہو یا نہ ہو' لیکن "دوسری وسیع تر دنیا" بالخصوص مسیحیت' یہودیت اور چینی اور روسی کمیونزم کے عاملین بڑی بے چینی سے منتظر ہیں کہ مسلمان اپنے اسلام اور اسلامی ورثہ کو خیرباد کہہ کر لادینیت' سیکولرزم 'یا مذہب کی بگڑی ہوئی صورت کو اپنا کر کب ہماری سطح پر آجاتے ہیں' تاکہ مسلمانوں کو یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ اپنی اصلی شکل میں صحیح مذہب اگر کوئی موجود ہے تو وہ اسلام ہے۔

اس حرف آغاز کے بعد موصوف اصلاحی تحریکوں کا تذکرہ شروع کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہابی تحریک اور سنوسی تحریک اور ان جیسی دوسری تحریکوں کا ذکر کرتے

ہوئے فرماتے ہیں:

"لیکن انہیں کسی طرح بھی جدت پسند اصلاحی تحریکیں نہیں کہا جا سکتا' کیونکہ صاف طور پر ان کی سرگرمیوں کی حدود تمام کی تمام مسلمانوں کے ماضی کے چوکھٹے میں منحصر ہیں۔"

(صفحہ ۱۰)

یعنی جدت پسندی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اسلام کے ماضی سے وہ اپنا رشتہ بالکلیہ کاٹ لے اور یہ تحریکیں اس شرط سے محروم تھیں۔ اس کے بعد جدت پسندی کے اصل نقطہ آغاز کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"دنیائے اسلام میں تجدد کے عمل دخل کی ابتداء اس وقت ہوئی جب کہ مغربی طاقتوں کی مسلمان ممالک کے ساتھ فوجی اور سیاسی مڈبھیڑ ہوئی۔"

(صفحہ ۱۱)

اس ذیل میں وہ شیخ محمد عبدہ مصری اور سرسید احمد خان کی سائینسی تحریک کا ذکر کرتے ہیں اور ان دونوں میں مشابہت اور مفارقت کی صورتیں ذکر کرنے کے بعد ان دونوں تحریکوں کے تباہ کن حشر کا ذکر کرتے ہیں' اس کے بعد وہ جدت پسندی کے ایک اور مرحلہ کی نشاندہی کرتے ہیں جسے ان کی اصطلاح میں علامہ محمد اقبال کا مرحلہ کہا جا سکتا ہے اس کے بارے میں موصوف کا خیال ہے کہ :

"اس مرحلے میں مسلمانوں کا معذرت خواہانہ انداز مغرب کے خلاف ایک جارحانہ انداز کی شکل اختیار کرتا ہے اور ان کی مدافعت 'جارحیت میں بدل جاتی ہے' مغرب کے خلاف اس طرز فکر نے جو کہ صریحاً دو رخا پن کا حامل ہے' قدامت پسندوں اور جدت پسندوں کی صفوں کو باہم ایک دوسرے کے بہت قریب کر

دیا' اتنا قریب کہ بعض دفعہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

(صفحہ ۱۴)

موصوف کے نزدیک جدت پسندی کی یہ تحریک بھی قدامت پسندوں کی نظر میں ناکام ہو کر رہ گئی' ان تمام تحریکات کی ناکامی کا اصل باعث کیا تھا؟ اس سلسلہ میں موصوف نے بڑی جرأت مندانہ بات کہی ہے' ان کا یہ "تجرباتی نظریہ" ان کی "اسلامی ذہنیت" کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے۔ فرماتے ہیں :

" یہ سوال کہ خالص دنیوی اقلیت اور سائنسی ذہنیت کتنی دور تک اور کتنی گہری ہو سکتی ہے' اگر روایتی مذہبی تصورات و اعمال اس سے نہایت سختی سے الگ رکھے جائیں' کافی سوچ میں ڈالنے والا ہے' تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ یہ کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتی جب تک مذہب کو زندگی پر قطعی طور سے اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کی اجازت نہ دی جائے' جب تک زندگی پر مذہب اپنی گرفت مضبوط رکھتا ہے تو ایک طرف خالص دنیوی عقلیت اور سائنسی ذہنیت اور دوسری طرف روایتی مذہبی تصورات و اعمال دونوں کو ایک دوسرے سے خواہ کتنی بھی سختی سے الگ الگ رکھا جائے' مذہب دنیوی افکار کو بھی داخل ہونے سے بڑے موثر طریقے سے روکے گا۔ یہ بات اگرچہ بظاہر متناقض نظر آتی ہے لیکن واقعہ یہی ہے۔"

(صفحہ ۱۵)

خلاصہ یہ کہ موصوف کے نزدیک مسلمانوں کی تمام بیماریوں کی جڑ "مذہب اسلام" ہے اس لئے مسلمان اگر اس بیماری سے شفایاب ہو کر ترقی کرنا چاہتے ہیں

تو راستے کے اس پتھر کو ہٹائیں، مذہب اسلام کو زندگی سے اپنی گرفت ڈھیلی کرنے پر مجبور کریں، بس مسلمان جس قدر مذہب سے دور اور لا مذہبیت کے قریب ہوتے چلے جائیں گے، اسی قدر ان کے سامنے زندگی کی ترقی کی راہیں کشادہ ہوتی چلی جائیں گی، اور ان کو ترقیاتی عروج پورا پورا اس دن نصیب ہوگا جس دن وہ مذہب اسلام کو بالکلیہ خیرباد کہہ دیں گے۔ اس کے بعد موصوف اپنے مقالہ میں اسلام کی جگہ لا مذہبیت کو اپنانے کی دعوت برابر دیتے چلے گئے ہیں، مثلاً ایک جگہ علماء اسلام کی طرف سے اسلامی عقائد اور احکام کی حفاظت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"علماء اسلام کا یہی وہ نقطہ نظر ہے جو اسلامی دنیا میں سیکولرزم، لا مذہبیت کے پھیلنے کا براہ راست ذمہ دار ہے"

(صفحہ ۱۶)

پھر اس کی مثال کے لئے "شرح زکوٰۃ" کو ملحدانہ منطق کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں :

"واقعہ یہ ہے کہ جدید زندگی اور روایتی اسلام" (جو آنحضرت ﷺ سے اب تک محفوظ چلا آ رہا ہے۔ ناقل) کے درمیان ٹکراؤ کے اس تمام عرصہ میں علماء کی اکثریت کی طرف سے جس نقطہ نظر کا اظہار ہوتا رہا ہے، وہ حقیقت میں سیکولرزم کا براہ راست ممد و معاون ہے۔"

(صفحہ ۱۷)

ایک جگہ پاکستان میں اسلام کی ضرورت سیکولرزم کے فعال اور موثر قوت بننے تک کو بڑی صراحت سے ذکر کرتے ہیں :

"مزید برآں پاکستان کے دو حصے ہیں، جو جغرافیائی لحاظ سے

ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں اور یہ صورت حال ہندوستان تک کو درپیش نہیں اب جب تک کہ سیکولرزم کو مثبت ترقی کے لئے ایک فعال اور موثر قوت نہ بنائی جا سکے' ان ملکوں کے لئے یہی ایک صورت ممکن نظر آتی ہے کہ وہ مذہب کو مملکت کی اساس تسلیم کریں۔"

(صفحہ ۲۳)

ایک جگہ اسلامی مملکت ہونے کی وجہ سے پاکستان کی مشکلات اور اس کے مقابلہ میں ایک سیکولر مملکت کی آسانیوں کو بڑے للچاتے ہوئے انداز میں ذکر کرتے ہیں :

"لیکن یہی وہ اصل سوال ہے' یعنی اسلام کی نئی تعبیر کی دریافت' جس کا ذہنی سطح پر حل تلاش کرنے میں سرکاری پالیسی مایوس کن رہی ہے۔ اولاً ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ اس طرح کے تمام مسائل کے حل' جیسے کہ اقلیتوں کے ساتھ کیا سلوک ہوا' اور صنعتی اور تیکنیکی تبدیلی سے جو معاشرتی نتائج نکلیں گے' ان کے پیش نظر ترقیاتی پروگرام کیا ہوں' ایک سیکولر مملکت میں زیادہ آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں' کیونکہ سیکولرزم تو ہے ہی روایتی رکاوٹوں اور تعصبات سے نجات پانے کے لئے ایک جرات مندانہ قدم' خواہ اس کے لئے کتنی بھی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے' اب چونکہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے اس لئے اسے ان مسائل کے حل کرنے کے لئے بڑی مشکلات درپیش ہیں۔"

(صفحہ ۲۴)

ایک مقام پر ان نام نہاد مشکلات کے حل کے لئے بزعم خود تعبیرو تاویل کا قابل قبول طریقہ پیش کیا ہے اور اس سلسلہ میں تعدد ازواج کی بحث کو اٹھا کر حسب عادت اس پر طویل تقریر کی ہے' جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کا اصل منشا تو یہ ہے کہ عام حالات میں ایک مرد کے لئے ایک بیوی کا ہونا ہی "مثالی" حیثیت رکھتا ہے' مگر زمانہ نزول کے معاشرے سے اسے مصالحت کرنا تھی اور اس معاشرے میں تعدد ازواج کی جڑیں گہری تھیں اس لئے اسے قانونی سطح پر تعدد ازواج کو قبول کرنا پڑا:

> "تاہم رسول مقبول علیہ السلام کی یہ آرزو تھی کہ مسلمان اس مثالی معاشرے کو بتدریج اپنائیں گے۔ بہرحال تاریخی لحاظ سے ہوا برعکس' رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد بڑے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئیں' جن کے نتیجے میں مسلم معاشرے میں بہت بھاری تعداد میں باہر سے عورتیں اور لونڈیاں آئیں اور یہ چیز اس معاملے میں قرآن کے اصل مقصد کے لئے رکاوٹ بن گئی۔" (صفحہ ۲۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جس آرزو کی نسبت کی گئی ہے' اس کا علم موصوف کو کن ذرائع سے ہوا؟ یہ تو انہیں کو معلوم ہوگا' لیکن ان کی عبارت سے اتنی بات بہرحال صاف ہوجاتی ہے کہ ان کے نزدیک قرآن کے مثالی معاشرہ کا جو تصور ہے' اسے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سکے نہ خلفاء راشدین' نہ صحابہ' نہ تابعین نہ ائمہ مجتہدین' نہ چودہ سو سالہ امت' بلکہ موصوف کے بقول یہ تمنائے نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی شرمندہ وقوع نہ ہو سکی البتہ تعبیرو تاویل کے جدید

تیشے سے چاہا جاتا ہے کہ قرآن کو تراش تراش کر یہ مثالی معاشرہ قائم کر دیا جائے' غالباً پاکستان میں مسلم فیملی لاز کے ذریعہ پہلی دفعہ آپ ﷺ کی آرزو کو پورا کرنے کے لئے مارشل لاء کی فرصت تلاش کی گئی۔ سبحان اللہ حضور انور ﷺ کی آرزو کا انکشاف ہوا کس کو؟ چودہ سو سال بعد کے ڈاکٹروں کو' جن کے نزدیک اسلام خود ثانوی حیثیت رکھتا ہے' اسی کے ذیل میں انہوں نے مسئلہ غلامی کا ذکر بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

" اور یہی غلامی کے مسئلے میں ہوا' جسے قانونی سطح پر تو برداشت کر لیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اخلاقی محرک عمل میں لایا گیا' کہ اس کی وجہ سے یہ ختم ہو جاتی ہے' اسلامی تاریخ نے اس مقصد کو بھی ناکام کر دیا اور ظاہر ہے کہ اس کے تاریخی وجوہ ہیں۔"

(صفحہ ۲۰)

تاریخی وجوہ کچھ بھی ہوں' لیکن مذاہب عالم کانفرنس کے بھرے مجمع میں تمام دنیا کے نمائندوں کے سامنے یہ اعلان تو کر ہی دیا کہ نہ صرف تعدد ازواج اور مسئلہ غلامی بلکہ پورے اسلام کو سمجھنے' اس کے منشا کو اپنانے' اور اسلام کی روح پر عمل کرنے میں' آنحضرت ﷺ سے لے کر اب تک اسلامی تاریخ کی تمام صدیاں ناکام رہیں۔ صحیح اسلام کا سراغ تحقیقات اسلامی کے ادارہ کو رہا ہے۔ اسی کے متصل آپ نے اسلامی عقائد پر بھی بحث کی ہے' تمہیداً فرماتے ہیں :

" ہم نے اب تک جن مثالوں کا انتخاب کیا وہ قانونی و اجتماعی معاملات کی ہیں۔ لیکن عقائد کا دائرہ بھی ان سے کچھ کم نہیں۔"

(صفحہ ۲۱)

یعنی مسلمانوں کا نہ صرف نظام قانون غلط ہے بلکہ نظام عقائد بھی غلط' اس کے بعد اس غلطی کی حمایت کے لئے آپ ایک عجیب و غریب اصول پیش فرماتے ہیں' ارشاد ہوتا ہے :

> " دنیا کے متعلق جدید آدمی کا جو تصور ہے باوجود ان تمام اختلافات کے جو اس میں پائے جاتے ہیں وہ قرون وسطیٰ کے نقطہ نظر اور روایتی طرز فکر سے مختلف ہے۔ سند کو مان لینا' اور خوش اعتقادی ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں' اور یہ سکہ جدید دنیا میں اب چالو نہیں رہا' جب آپ سند کو مانتے ہیں تو اس کا نتیجہ لازماً خوش اعتقادی ہوتا ہے۔" (صفحہ ۲۲)

موصوف کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام کے تمام اعمال 'عبادات اور عقائد کا مدار سند ہے اور سند کو مان لینے سے چونکہ خوش اعتقادی کا جن چھو جاتا ہے' اس وجہ سے یہ سکہ جدید دنیا میں چالو نہیں رہا' لہٰذا ثابت ہوا کہ دین اسلام کا کوئی عقیدہ کوئی قانون' اور کوئی عمل "جدید دنیا" کی حمایت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ موصوف کو کس "جدید آدمی" سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جس کے مذہب میں سند اور خوش اعتقادی کا سکہ پھینک دیئے جانے کا مستحق ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ سکہ امریکہ' برطانیہ اور روس بلکہ تمام ممالک میں اور تمام حلقوں میں بڑی مقبولیت سے چالو ہے۔ وہ کون سا ملک ہے جہاں بین الاقوامی سفیروں' عدالتی بیانوں' ماہرین فن کی شہادتوں پر اعتماد نہیں کیا جاتا' دنیا کا وہ کونسا جدید ملک' معاشرہ اور فرد ہے جس کے نزدیک کسی کا کسی کی بات پر اعتماد کرنا' اسے سند تسلیم کرنا اور خوش اعتقادی اور پسندیدگی کا اظہار کرنا ناقابل معافی جرم ہے؟

ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ اصول کب سے چل نکلا ہے' کہ جو سکہ دنیا میں چالو نہ رہے' خواہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو۔ اسے باہر پھینک کر "حماقت آمیز دانشمندی" کا مظاہرہ کیا جائے' عقل و نقل یہ اصول تو تسلیم کرتی ہے کہ اگر کوئی سکہ واقعی بے قیمت 'کھوٹا اور ردی ہو' اسے بڑی خوشی سے پھینک دیجئے' خس کم جہاں پاک لیکن جس سکہ کو چودہ سو سال سے دنیا کی ہر سنجیدہ قوم جانچ پرکھ کر اس کے قیمتی جوہر ہونے کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ اسے محض اس وجہ سے پھینک دینا کہ چند احمق اسے کھوٹا بتلانے لگے ہیں' کیا یہ عقل و خرد کا دیوالیہ نکال دینے کے مترادف نہیں۔؟ پھر جس جدید دنیا کا ذکر خیر ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں کیا اس میں قرآن و حدیث' نبوت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم' حشر و نشر' حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کا سکہ چالو ہے۔؟ اگر نہیں تو پھر جدید دنیا کی خاطر یہ تمام سکے بھی پھینک دیجئے۔ (اور موصوف ان سب کو پھینک چکے ہیں) ڈاکٹر صاحب نے بڑی سنجیدگی سے اس فقرہ میں جو خیال آرائی کی ہے اگر ہمیں ان کا اور پرنسٹن یونیورسٹی کے سنجیدہ مذاکرہ کا احترام ملحوظ نہ ہوتا' تو ہمارے نزدیک اس کی حیثیت "دیوانے کی بڑ" اور "بازاری گپ شپ" سے زائد نہیں تھی' دیوانہ گفت و ابلہ باور کرد۔

ڈاکٹر صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں کیا وہ اتنا نہیں جانتے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا عمومی محور وہی چیزیں رہی ہیں جن کا سکہ قوموں کی حماقت ' بگڑی ہوئی ذہنیت اور مسخ شدہ عقل کی وجہ سے دنیا میں چالو نہیں تھا' اب اگر ان کا یہ اصول صحیح ہو کہ جدید دنیا میں جس سکہ کی چلت نہ ہو اسے رد کرنا ہی صحیح عقلیت ہے تو انبیاء علیہم السلام کی جانب سے پیش کردہ توحید' رسالت' تصور قیامت' بعث بعد الموت' حشر و نشر وغیرہ مسائل جو اس وقت کے چلتے سکوں کے

علی الرغم پیش کیے گئے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے ادارہ تحقیقات سے کیا فتویٰ صادر ہوگا؟ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا سکہ فرعونی ماحول میں، ابراہیم علیہ السلام کے نظریات کا سکہ نمرودی ماحول میں، اور آنحضرت ﷺ کی دعوت کا سکہ مکی اور عربی ماحول میں کب چالو تھا۔؟

اصل قصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے تحقیقاتی ادارہ میں "سوچ و بچار" کا سکہ چالو نہیں، اس لئے وہ کسی بات کے کہہ ڈالنے سے پہلے اتنا سوچ لینے کے قائل نہیں، کہ ان کے اس نظریہ کی زد میں کون کون آجائے گا۔

چالو سکے کی بحث چل نکلی تو دل چاہتا ہے، کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ایک گزارش مزید کردی جائے، وہ یہ کہ ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ جدید دنیا کی بگڑی ہوئی اور خدا سے باغی انسانیت کے ماحول میں انبیاء علیہم السلام کے ماثر کی "سند" اور ان سے "خوش اعتقادی" کا سکہ نہیں چلتا، لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کے لئے "پرنسٹن یونیورسٹی" میں مقالہ خوانی نہیں کرتے رہیں گے، سنت بنی آدم ان پر بھی آخر کار جاری ہو کر رہے گی، اور موت کا آہنی چنگل انہیں بھی ایک نہ ایک دن دبوچ کر رہے گا، وہ ہمیں بتلائیں کہ بازار آخرت میں کونسا سکہ چلے گا۔ کیا پرنسٹن یونیورسٹی میں پڑھے ہوئے "ابن سینا اور راسخ العقیدہ اسلام" اور اسلام پر تجدد پسندی کے اثرات" قسم کے مقالے؟

"ایں خیال است و محال است وجنوں"۔

انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہاں اسی "روایتی اسلام" کا سکہ چلے گا۔ جس کے ایک ایک حرف کا مذاق اڑانا ہی ان کے نزدیک تقاضائے "جدید عقلیت" ہے۔ اگر ہماری یہ گزارش ان کے نزدیک "سندی خوش اعتقادی" میں داخل ہو تو قرآن مجید پڑھ کر دیکھیں اس کا اعلان آج بھی وہی ہے جو کل تھا:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الھدٰی و یتبع غیر سبیل المومنین نوله ما تولّٰی و نصله جھنم و ساءت مصیراً۔ (النساء رکوع ۱۷)

ترجمہ :"اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے رستے کے خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت بری جگہ پہنچا۔"

(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

ڈاکٹر صاحب اس آیت کے آئینے میں اپنے اس نظریہ کی اور اس مقالہ کے دوسرے نظریات کی اور دیگر تمام مقالات کی اصل صورت دیکھ لیں۔ الغرض ڈاکٹر صاحب کا یہ اصول ایک اعجوبہ ہے' اب ذرا سنیے کہ اس "اعجوبہ" کی زد میں وہ دین اسلام کی کن کن چیزوں کو لے آتے ہیں' ارشاد ہوتا ہے :

"اور خوش اعتقادی ہی اصل مورث ہے ہر قسم کے جادو' ٹوٹکے پر یقین کرنے' کرامات پر زور دینے' اور بھونڈی شکل میں روحانی شعبدہ بازی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معراج کو عام طور پر جس طرح پیش کیا جاتا ہے' وہ اس طرح کے توہمات پرستی کی جس کا قرآن مجید سے کوئی ثبوت نہیں ملتا ایک مثال ہے۔"

(صفحہ ۲۱)

صرف وہ کرامات جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے' ان ہی کی اگر فہرست

مرتب کر لی جائے تو ایک اچھا ضخیم مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔ اور معراج نبوی ﷺ کا ذکر قرآن مجید' احادیث متواتر جن کے راوی تیس کے قریب صحابہ ہیں' کے علاوہ تاریخ و سیرت کی ہر بڑی چھوٹی کتاب میں اجمالاً یا تفصیلاً موجود ہے اور چودہ سو سالہ امت کا اجماعی عقیدہ ہے اور ضروریات دین میں داخل ہے مگر ڈاکٹر صاحب کی "توہمات پرستی" کی داد دیجئے کہ آپ نے کرامت' معجزہ اور معراج نبوی ﷺ کے ڈانڈے' جادو' ٹوٹکے اور بھونڈی شعبدہ بازی سے جا ملائے۔ رہا یہ سوال کہ پھر یہ اجماعی عقیدہ مسلمانوں میں کہاں سے آیا' اور حدیث' سیرت اور تاریخ کے تمام مآخذ کے علاوہ قرآن مجید میں بھی کیسے درج ہو گیا۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ :

> "معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب مسلمان جزیرہ عرب سے باہر نکلے اور خاص طور سے عراق میں ان کو عیسائیوں سے سابقہ پڑا' تو انہیں مجبوراً عیسائیوں کے اس اعتقاد کے جواب میں کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے جانے کے بعد آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے معراج کو جسمانی شکل میں پیش کرنا پڑا" (صفحہ ۲۱)

چونکہ موصوف کی "جدید دنیا" میں کسی دعویٰ کی دلیل اور سند پیش کرنا خوش اعتقادی کا دوسرا رخ ہے' اس لئے اگر آپ یہ سوال اٹھائیں گے کہ موصوف کو "معلوم یہ ہوتا ہے" کا انکشاف کن ذرائع سے ہوا؟ اور اس کی سند اور دلیل کیا ہے؟ تو آپ پھر سے "سندی خوش اعتقادی" میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لئے خیریت اسی میں ہے کہ آپ اسلامی عقائد کے بارے میں موصوف کے تمام انکشافات بلا چون و چرا تسلیم کرتے جائیں۔ "سندی خوش اعتقادی" کے عفریت سے نجات کی بس یہی ایک صورت ہے البتہ یہ خطرہ ضرور ہے کہ قرآن مجید سے آپ اسراء اور معراج

نبوی ﷺ کا ذکر لے بیٹھیں گے، لیکن اس سلسلہ میں معراج کا صحیح مفہوم جو موصوف نے از راہ عنایت بیان فرمادیا ہے اسے سن کر اطمینان کر لیجئے، فرماتے ہیں :

"قرآن مجید نے کئی جگہ رسول کریم ﷺ کے بعض آفاق گیر روحانی مشاہدات کا ذکر کیا ہے جن میں آپ کی الوہی شخصیت طبعی حدود سے بلند و بالا تر ہو کر حقیقت اولیٰ کے محیط کل سے جاملتی ہے۔"

(صفحہ ۲۱)

اس تفسیر میں آپ کو "آفاق گیر روحانی مشاہدات" آپ ﷺ کی الوہی شخصیت "طبعی حدود سے اس کی بلندی و برتری" "حقیقت اولیٰ" اور "محیط کل" جیسے مبہم، مجہول، اجنبی بلکہ بعض لایعنی الفاظ اور مفہوم ضرور ملیں گے، لیکن معراج جسمانی جیسے بالکل واضح، آسان اور عام فہم مسئلہ کی توہمات پرستی سے نجات پانے کے لئے ضروری ہے، کہ آپ موصوف کے اسی لایعنی قسم کے لفظی گورکھ دھندے پر ایمان لے آئیں، ورنہ صدر ادارہ تحقیقات کی جانب سے خوش اعتقادی کا فتویٰ موجود ہے، کیونکہ یہ "جدید دنیا" ہے یہاں قرون وسطیٰ کے سکے اور اصول بدل چکے ہیں :

بریں عقل و دانش بباید گریست

موصوف نے توہمات پرستی کی جو مشین گن نصب کی ہے، اس کا سارا مسالا ختم نہیں ہوا، ابھی اس کی گولہ باری باقی ہے، ارشاد ہوتا ہے :

"اسی طرح مسلمانوں کے ہاں شفاعت کے مشہور عام عقیدے نے جو شکل اختیار کی ہے وہ عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ کا جواب تھا۔"

(صفحہ ۲۱)

بطور خلاصہ آخری بات یہ کہ :

"غرض قرآن مجید کی واضح تعلیمات کے بالکل بر خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کثیر التعداد معجزات منسوب کر کے آپ ﷺ میں ایک حد تک شان ایزدی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔"
(صفحہ ۲۱)

گویا صرف معراج، کرامت، شفاعت اور معجزات ہی نہیں، یہ تو صرف "ایک مثال" کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں ورنہ اس اصول کی روشنی میں ان امور کے علاوہ اسلام کے جس جس عقیدہ، عمل، یا مسئلہ کے لئے بھی کسی کا دل چاہے تو "خوش اعتقادی" اور "توہمات پرستی" کا ہلکا سا فقرہ چست کیا جا سکتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ بذریعہ معجزات نبی ﷺ کو خدا بنانے کا یہ "کامیاب عمل" کس کی ستم ظریفی ہے؟ تمام دنیا کے نمائندوں کی بھری محفل میں اس کا جواب ڈاکٹر صاحب کی زبان سے سنیے:

"نبی علیہ السلام کو ایک "اساطیری رنگ" میں پیش کرنے کا یہ عمل جس کا مصدر و منبع ایک سے زیادہ عناصر تھے "راسخ العقیدہ گروہ" بھی برابر اس میں شریک رہا اور اسے اس نے قبول کیا۔"
(صفحہ ۲۱)

"راسخ العقیدہ گروہ" یعنی صحابہؓ و تابعینؒ سے لے کر آج تک کے تمام علماؒ صلحاؒ "خدا سازی" کے اسی شغل میں لگے رہے، پوری امت پر "اساطیری رنگ آمیزی" اور "خدا سازی" کا الزام اس اعجوبہ زمان کی طرف سے لگایا جا رہا ہے، جو اسی مجلس میں اور اسی مقالہ میں چند سطر پہلے سند کو خوش اعتقادی قرار دے کر اساطیری (بے سند) افسانہ طرازی کرتا ہے اور آپ کی الوہی شخصیت کے بے سروپا دعوے ہانکتا

ہے۔ : چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد :

پھر "کثیر التعداد معجزات" اور "شان ایزدی" پیدا کرنے کی تک بھی عجیب ہے' کیا قرآن مجید میں انبیا علیہم السلام کے کثیر التعداد معجزات کا کہیں ذکر نہیں ہے؟ کیا قرآن عزیز بھی ان کے بقول "اساطیری رنگ میں خدا سازی کی کامیاب کوشش کرتا رہا" خدا جانے ان کو کس نے بتلا دیا' کہ اگر نبی کے لئے معجزہ کو تسلیم کرلیا جائے تو نبی خدا بن جاتا ہے' کیا ان کو معجزہ کی اتنی حقیقت بھی معلوم نہیں کہ 'معجزہ صرف خدا تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے نبی کے فعل کو اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔ البتہ عالم اسباب سے بالا تر کسی چیز کا اس کے ہاتھ پر ظاہر ہونا اس کے دعوائے نبوت اور مامور من اللہ ہونے کی حقانیت کی دلیل ہوتا ہے۔

موصوف نے اسلامی تاریخ کی تیرہ چودہ صدیوں کے تمام علماء کی جس طرح تجہیل و تحمیق اس "مذاہب عالم کانفرنس" میں کی اس کا ایک نمونہ اور ملاحظہ ہو' فرماتے ہیں :

> "گزشتہ تیرہ صدیوں کے دوران فقہایا علمائے اسلام اپنی بحث و نظر میں جن تحقیقاتی نتائج پر پہنچے ہیں' اگرچہ انکا پوری سنجیدگی و توجہ سے مطالعہ کرنا چاہئے اور ان کو قرار واقعی اہمیت دینی چاہئے لیکن اس کے باوجود یہ دیکھنے میں آئے گا کہ اکثر معاملات میں ان کے تحقیقاتی نتائج یا تو صحیح نہ تھے' یا وہ اس معاشرے کے لئے موزوں تھے جس میں وہ رہتے تھے نہ کہ آج کے معاشرے کے لئے۔"

(صفحہ ۲۷)

تیرہ صدیوں کے فقہاً اور ائمہ اجتہاد کے تحقیقاتی نتائج کا پوری سنجیدگی اور توجہ سے مطالعہ کرنے کے بعد ان کی قرار واقعی اہمیت اہل نظر کے نزدیک کیا ہوگی؟ یہ بحث اپنی جگہ رہی البتہ موصوف کے نزدیک ان کی قرار واقعی اہمیت یہی ہے کہ :

این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولی

(معاذ اللہ)

یعنی ان کے عقائد غلط' ان کی تحقیقات محض رنگ آمیزی' ان کا شعور و فہم قرآن و سنت کے صحیح مطالعہ سے محروم' ان کی تفسیری حدیثی اور فقہی تشریحات ناقابل قبول' ہاں قرآن و سنت اور اسلام کا صحیح فہم میک گل یونیورسٹی کے طالب علم اور یہودی پروفیسر اسمتھ کے شاگرد عزیز اور نور نظر اور ان کے ادارے کو نصیب ہوا' ان کے بقول یہی اصل وجہ ہے کہ اس گروہ کو ادارہ تحقیقات کی صورت میں منظم کر کے اسلام کی نوک پلک سنوارنے اور اسے جدید زمانہ مذہبی یعنی مذاہب عالم اور دیگر نظریہ ہائے حیات سے ہم آہنگ کرنے کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے' چنانچہ اس کی تفصیلی روئداد بھی موصوف نے مذاہب عالم کے نمائندوں کے سامنے رکھی' فرماتے ہیں :

> "صدر محمد ایوب خان کی حکومت نے ۱۹۶۰ء میں ایک ادارہ' ادارہ تحقیقات اسلامی کے نام سے علوم اسلامی میں تحقیقات اور جدید ضرورتوں کے لئے اسلام کی تعبیر و تشریح کی غرض سے قائم کیا' ۱۹۶۲ء میں اس ادارہ کو ایک آئینی حیثیت دی گئی۔"

(صفحہ ۲۶)

اسی کے ساتھ موصوف نے "اسلامی مشاورتی کونسل" کے قیام اس کے اغراض و مقاصد' ان دونوں اداروں کے تعلق کی نوعیت کا ذکر کیا' اور ان کے الفاظ میں پہلی آزمائش یعنی مسئلہ سود کے بارے میں "اسلامی مشاورتی کونسل" کے پھس پھسے رویہ پر تنقید کرتے ہوئے اس موقعہ پر "ادارہ تحقیقات اسلامی" کی جرأتِ رندانہ کا قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ ذرا الفاظ کی صولت اور شوکت ملاحظہ فرمایئے' ایسا لگتا ہے

کہ آپ ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور شافعی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ دنیائے اسلام کی سب سے بڑی اتھارٹی کی پوزیشن میں مصروف گویائی ہیں :

"ادارہ تحقیقات اسلامی کے تحقیقی مطالعہ" نے بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب میں ربا کا جو واقعۃ نظام مروج تھا وہ انتہائی بھونڈے قسم کے معاشی استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا تھا اس لئے قرآن مجید نے بار بار کی تنبیہات کے بعد اسے ممنوع قرار دیدیا اور یہ کہ بعد کی صدیوں میں مسلمان فقہاً نے غیر ضروری طور پر اس ممانعت کا دائرہ ان تمام مالی معاملات پر کردیا جن میں کہ اصل رقم پر کچھ اضافہ ہوتا ہو، چنانچہ اس ضمن میں ادارہ تحقیقات کا استدلال یہ تھا کہ اسلام کو آج بروئے کار لانے کے لئے سب سے پہلے تو یہ لازمی ہے کہ قرآن مجید کے احکامات کا تاریخی پس منظر سمجھا جائے تاکہ اخلاقی، روحانی اور معاشرتی و اقتصادی میدانوں میں قرآن مجید کس قسم کی اغراض کی تکمیل چاہتا ہے، ان کا تعین کیا جائے، نیز آج کے سیاق و سباق میں قرآن کی عملی تطبیق لفظاً نہیں کی جاسکتی۔" (صفحہ ۲۷)

حکومت کے قائم کردہ اس آئینی ادارہ کا یہ نقطہ فکر اور طرز تعبیر یعنی تیرہ صدیوں کی تحقیقات کو غلط قرار دینا، اور قرآن کی لفظی تعمیل کو حماقت بتلا کر اسلام کی آزادانہ تعبیر و تشریح یا بلفظ صحیح تحریف و تبدیل کے بارے میں موصوف فرماتے ہیں :

"یہ طریقہ سب طریقوں سے جنہیں عام طور پر اب تک اختیار کیا گیا ہے، اس قدر انقلابی اور بنیادی لحاظ سے مختلف ہے، کہ

یہ نہ صرف فقہ اور سنت نبوی ﷺ کو بلکہ قرآن مجید کے احکامات تک کو بھی تاریخی مطالعہ کا موضوع بتاتا ہے' اسے نہ محض "روایت پرست علماء" بلکہ بہت سے تجدد پسند بھی قبول کرنے سے سنجیدگی کے ساتھ تامل ہی کریں گے۔" (صفحہ ۲۸)

مطلب یہ کہ تجدد پسندی کے جتنے طریقوں کا اب تک تجربہ کیا گیا ہے وہ سب جزوی تھے' ان میں اسلام کی بعض چیزوں کو بہرحال تسلیم کر لیا جاتا تھا لیکن ادارہ تحقیقات اسلامی کے "ذہین کارندوں" نے جو طریقہ درآمد کیا ہے' اس میں فرضی تاریخ کے خیالی افسانوں سے قرآن کے احکام یا بلفظ صحیح خود قرآن کو بھی بدلا جا سکتا ہے' اس لئے اس کے قبول کرنے کی جسارت لوگوں کو مشکل ہی ہو سکتی ہے۔

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

اس سلسلہ میں موصوف نے اس طریقہ تحریف کے قبولیتی امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے :

"اگر ایسا نہ ہوا تو راقم السطور اسلام کا اس کے سوا اور کوئی مستقبل نہیں دیکھتا کہ وہ کچھ عرصے بعد محض چند مذہبی رسوم بن کر رہ جائے گا جن سے کہ کچھ آنے والے وقت تک لوگوں کی جذباتی وابستگی قائم رہے۔" (صفحہ ۲۸)

موصوف خواہ مخواہ پریشان ہیں' ان سے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ صرف حکومت پاکستان کی مدد سے نہیں بلکہ اگر ان سے ہو سکے تو امریکہ اور روس اور "وسیع تر جدید" دنیا جس کے غم میں وہ پگھل پگھل کر کانٹا ہو رہے ہیں' کی مدد سے بھی اسلام کو بدلیں اس کے لئے جس قسم کے نظریات چاہیں اختراع کریں۔ اور جتنے بندوں کو

بہکایا جا سکتا ہے بہکائیں :

واستفزز من استعطت منهم بصوتک واجلب علیهم بخیلک ورجلک و شارکهم فی الاموال والاولاد وعدهم وما یعدهم الشیطان الا غرورا۔

(بنی اسرائیل ٦٤)

الغرض آپ سے جو ہو سکتا ہے کرلیں، لیکن یاد رہے کہ اللہ دین کا حافظ ہے دین محمد ﷺ کا ہی چلے گا، اور تعبیرو تشریح امام ابو حنیفہ اور شافعی رحمتہ اللہ علیہ وغیرہم ہی کی چلے گی، اور آپ کے رفقا آسمان سے سورج اور چاند بھی لا کر رکھ دیں، تب بھی مسلمان آپ لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی جگہ شارع تسلیم نہ کریں گے، نہ ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور شافعی رحمتہ اللہ علیہ ماننے کے لئے تیار ہوں گے۔

یہ اس مقالہ کے چند اقتباسات تھے، موصوف نے اسلامی حکومتوں، بالخصوص حکومت پاکستان کے دو رخاپن اور منافقت اور متجددین کی بھیڑمیں ذہنی بصیرت کے فقدان اور ان کی مسلسل ناکامیوں کا ذکر بھی بڑی دلسوزی سے کیا ہے، مگر ہم بغرض اختصار انہیں قلم انداز کرتے ہیں۔ البتہ ہمارا خیال ہے کہ موصوف نے اس طویل مقالہ کی نوشت و خواند پر اپنا اور معزز شرکائے کانفرنس کا قیمتی وقت ناحق ضائع کیا، کیونکہ اگر وہ چاہتے تو وہ اس تمام مقالہ کا خلاصہ پیش کر سکتے تھے، مثلاً وہ اتنا لکھ دیتے۔

" جناب صدر محترم! و معزز حاضرین کانفرنس! آپ حضرات یہاں اپنے اپنے مذاہب پر مقالات پڑھیں گے، لیکن فقیر بد قسمتی سے جس مذہب کا وکیل بن کر حاضر

ہوا ہے۔ اس کا ماضی سیاہ' حال پریشان اور مستقبل خطرناک حد تک تاریک ہے' ماضی کا یہ حال کہ تمام اسلامی عقائد مثلاً معجزہ' کرامت' شفاعت' معراج وغیرہ شروع ہی سے توہم پرستی کا پلندہ رہے ہیں' اور اسلامی قانون اور معاشرت کا یہ حال ہے کہ تعدد ازواج' مسئلہ غلامی' جزیہ اور اقلیتوں کے حقوق جیسے موٹے موٹے مسائل میں بھی ہمارے تیرہ صدیوں کے علما قرآنی روح سمجھنے' اسے اپنانے اور اسے رنگ آمیزی سے بچا رکھنے سے محروم رہے' اب ان کی کس بات پر اعتماد کرلیا جائے۔ اور اسلام کا حال یہ ہے کہ موجودہ دور کی تمام مسلم حکومتیں دو رخے پن اور منافقت کی شکار ہیں' تجدد پسند بصیرت کے فقدان میں مبتلا ہیں اور قدامت پسند اپنے طرز عمل سے سیکولرزم کے داعی ہیں' اس پریشان کن صورت حال سے گھبرا کر ہمارے صدر محترم نے اسلام کو تعبیر و تاویل اور تحریف و ترمیم کے ذریعے زمانہ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ادارہ تحقیقات اسلامی کی تنظیم میں فقیر اور فقیر کے ہم مسلک رفقا کو مامور فرمایا ہے۔ ہم نے اس "انقلابی تعبیر" کا ذریعہ بھی تلاش کرلیا ہے۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ قدیم و جدید دونوں حلقوں کی جانب سے اس کی مخالفت کی جائے گی' اس لئے' شرکائے کانفرنس! خدارا دنیا جہان کے مسلمانوں سے اپیل کرو کہ وہ ہماری ان "بری بھلی تحقیقوں" کا اثر قبول کرلیں ورنہ اسلام کا مستقبل خطرہ میں ہے۔"

بتلایئے! کیا اس خلاصہ میں تمام مقالہ نہیں آگیا۔؟ مدیر فکر و نظر راوی ہیں' دروغ برگردن راوی کہ اس مذاکرہ میں ایک مقالہ چینی مذاہب پر پڑھا گیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمان اس مقالہ پر تبصرہ کرنے والوں کے بورڈ کے ایک رکن تھے' چینی مذاہب کے ضمن میں چین کے موجودہ کمیونزم کا بھی ذکر آیا' اس سلسلہ میں ڈاکٹر فضل الرحمان نے چینی کمیونزم کے بارے میں کہا کہ آج یہ تمام مذاہب کے لئے سب سے بڑا اور کامیاب چیلنج ہے' "مدیر فکر و نظر" بے چارے سیدھے آدمی ہیں' ڈرتے ڈرتے چبا چبا

کر بات کرتے ہیں۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کو اسلام سے جس قسم کی عقیدت اور وابستگی ہے، جس کا اظہار اسی مقالہ کے مندرجات سے بخوبی ہو جاتا ہے، اسے سامنے رکھئے تو اسلام کے مقابلہ میں ڈاکٹر صاحب چینی کمیونزم کو کیا بھارت کے سکھ ازم اور سیکولرزم کو بھی بڑی آسانی سے "سب سے بڑا اور کامیاب چیلنج" قرار دے سکتے ہیں، کیونکہ ان میں بھی مشکلات بہرحال اتنی نہیں جتنی ڈاکٹر صاحب کو اسلام میں پیش آ رہی ہیں، کیونکر نہ ہو ڈاکٹر صاحب جیسے ذہین آدمی کو اپنے مذہب کی اتنی ہی کامیاب وکالت کرنی چاہئے تھی۔

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیوان کنند
ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویران کنند

(ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک رجب ۱۳۸۶ھ)

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے تحقیقاتی فلسفہ کے ضمنی اصول

حامداً و مصلیاً و مسلماً:۔ اما بعد:

ہم اس سے پہلے مقالہ میں ان "بنیادی اصول اربعہ" سے بحث کر چکے ہیں جن پر ڈاکٹر صاحب کے "تحقیقاتی فلسفہ" کی بنیادیں اٹھائی گئی ہیں، وہاں ہم نے یہ وضاحت بھی کی تھی کہ یہ فلسفہ اور اس کے "ارتقائی اصول" استاذ فرنگ کے کافرانہ مزاج، ملحدانہ ذوق اور منتقمانہ ذہنیت کی پیداوار ہیں، ان کا اصل مقصد ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت حقہ، شریعت کاملہ، اور آپ کی "ماموریت من اللہ" کے انکار کو نئی شکل میں پیش کرنا، "ارتقا" کی فرضی کڑیوں سے اسلام کو "زمانہ مابعد" کی مخلوق ثابت کرنا، اور اسلام اور کلیسائیت میں مشابہت دکھلا کر اسلام کی "گرفت" کو کمزور کرنا، اور اسلامی معاشرہ کو اسلام سے بدظن کر کے مسلمان نسل کو حرص و آز، ہواؤ ہوس اور خودرائی و نفس پرستی کے اسی جہنم میں دھکیل دینا، جس میں مغربی معاشرہ بھسم ہو کر انسانیت کے تمام بلند تصورات اعلیٰ اخلاق اور اقدار کو یورپ میں تباہ کر چکا ہے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب اور ان کے مکتب فکر نے شاطر فرنگ کے دام تزویر میں آکر اپنے اساتذہ کے اگلے ہوئے نوالہ، فلسفہ ارتقاء، کو وحی آسمانی کی طرح خوش آمدید کہا

اور قبول کر لیا' وہ اس فلسفہ کے "جادو" سے ایسے مسحور ہوئے' کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لے کر آج تک کے تمام "خضر صفات" علمائے حق پر ناروا حملے کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے' لیکن انہیں کبھی بھول کر بھی یہ سوچنے کی توفیق نہ ہوئی کہ یہ سارا افسانہ محض خیالی یا فرضی تو نہیں ہے؟ الغرض یہ "مشرقی شاگرد" اپنے 'مغربی استاذ" کے پوری طرح نقش قدم پر چلے فضلوا واضلوا (خود بھی گمراہ ہوئے' اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا)

ان سطور میں ان "ضمنی اصول" سے بحث کی جائے گی' جنہیں "فلسفہ ارتقاء" کے مختلف مراحل میں استعمال کیا جاتا ہے' ان سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈاکٹروں 'اور ان کے مغربی اساتذہ کرام' کا انداز نگارش اور طرز تحقیق کیا ہے۔

پہلا اصول : فرضی تاریخ کی سنگ باری :.....

ڈاکٹر صاحب موصوف 'پہلے اپنے اساتذہ مغرب کے نظریاتی "ملغوبہ" سے ایک "ارتقائی خاکہ" تیار کرتے ہیں' پھر اس کی بنیاد پر ایک خیالی "شیش محل" تعمیر کرتے ہیں' پھر اس میں بڑے اطمینان کے ساتھ فروکش ہونے کے بعد ظن و تخمین' قیاس و وہم کے "دور مار میزائل" سے خدا و رسول 'کتاب و سنت' وحی و رسالت' فقہ و عقائد اور صحابہ و تابعین' فقہاؤ محدثین' علما و صوفیاء اسلام پر "فرضی تاریخ" کی ایسی شدید گولہ باری کرتے ہیں کہ انسانیت لرز جاتی ہے' روح اسلام کانپ اٹھتی ہے' اور عقل و دانش سر پیٹ لیتی ہے۔ وہ "گرے پڑے مواد" کے ذریعہ اسلام کی مصنوعی' لیکن نہایت مکروہ اور بھونڈی' تصویر کشی میں ایسے ماہر فنکار واقع ہوئے ہیں' کہ اسلام اس تصویر کو دیکھ کر بیساختہ پکار اٹھتا ہے کہ:

بخندید وگفت ایں نہ صورت من است

و لیکن قلم در کف دشمن است

ترجمہ :"ہنسا اور کہا : یہ میری تصویر تو ہرگز نہیں' لیکن کیا کیجئے' قلم دشمن کے ہاتھ میں ہے۔"

ان کے مقالات میں آپ کو "قیاس یہ کہتا ہے" "اغلب یہ ہے" "معلوم یہ ہوتا ہے" "درحقیقت جو شہادت موجود ہے" "زبردست شہادت" "معلوم حقیقت" "غالباً" "اغلباً" "لازماً" "یہ امر واضح ہے" "شاید کہ" قسم کے الفاظ برابر ملتے چلے جائیں گے۔ یہی سائنٹیفک گولے اور تحقیقی ایٹم بم ہیں' جن کا وجود خارج میں مطلق نہیں ہوتا' لیکن موصوف اسلام کی آہنی دیواروں کو مسمار کرنے کے لئے ان ہی فرضی گولوں کی مسلسل بارش کئے چلے جاتے ہیں۔ لطف یہ کہ انہیں کبھی یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کی اس "گولہ باری" کی زد میں کون کون آسکتا ہے؟ یوں تو موصوف کے تحقیقی "اسلحہ خانہ" میں مفروضاتی گولہ بارود کی اتنی بھرمار ہے کہ ان کا ہر قاری اس سے واقف ہے' لیکن موصوف کے اس اصول کی مزید وضاحت کے لئے چند ابھرتی ہوئی مثالوں کا پیش کردینا مناسب ہوگا:

ا ـــــ موصوف کی تحریک چونکہ اسلام کی آزادانہ مرمت' تغیر و تبدیل' اور ہر طرح کی تحریف و تصرف کی داعی ہے۔ اس لئے وہ کھل کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ :

" زمانہ حال کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اسلام کی آزادانہ تعبیر و تشریح' اور اسلام کے قطعی اور منصوص مسائل میں قطع و برید اور تحریف و تغییر نہ صرف یہ کہ جائز ہے' بلکہ وقت کا اہم ترین فریضہ ہے۔"

ان کے اس نظریہ پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ شریعت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کے مقابلہ میں وہ ایک نئی شریعت ایجاد کرنا چاہتے ہیں، آخر اسلام میں اس کی گنجائش کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کس پر وحی آئی ہے؟ یا آپ خود وحی آسمانی کے مدعی ہیں کہ جس کے ذریعہ خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ احکامات کو منسوخ قرار دینے کی جسارت کر رہے ہیں؟ یہ سوال یقیناً بڑا دقیع تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب کی "یہودی تعلیم" بھی کچھ "یوں ہی سی" نہ تھی، وہ میک گل یونیورسٹی کے صرف متعلم ہی نہیں، بلکہ معلم اور پروفیسر بھی رہ چکے تھے، اس لئے انہوں نے سب سے پہلے "سنت" کے مفہوم کی بحث چھیڑ دی اور اس کی تان یہاں آکر ٹوٹی کہ انہوں نے صریح طور پر شریعت نبویہ کا انکار کرتے ہوئے لکھا :

(۱) "درحقیقت جو شہادت موجود ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم" اساسی طور" سے بنی نوع انسان کے اخلاقی مصلح تھے۔"

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۱۶)

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آج کل کی اصطلاح کے مطابق وسیع معنوں میں ایسے قانون ساز، شارع، نہ تھے کہ دین و دنیا کی ہر بات کی تفصیلات مرتب فرماتے ہوں۔"

(حوالہ بالا صفحہ ۱۷)

اب ذرا غور فرمائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ دعویٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اساسی طور پر صرف ایک اخلاقی مصلح تھے اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وسیع معنوں میں شارع یا آج کی اصطلاح میں قانون ساز نہ تھے کتنا

یہ اور کتنا اہم دعویٰ ہے۔ قرآنی اعلانات کے خلاف، تاریخ نبوت کے مناقض، منصب نبوت کی ضد، اجماع امت کے منافی، اوصاف نبوی کی نقیض، خالص افتراء، عظیم بہتان سراپا طوفان، لیکن ڈاکٹر صاحب اس زہر تلخ کو "در حقیقت جو شہادت موجود ہے" کے کیپسول میں بند کر کے ملت اسلامیہ کے حلق سے نیچے اتار دینے کے درپے ہیں، ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں، کہ یہ حقیقت ہے یا افسانہ؟ اور یہ شہادت کہاں موجود ہے؟ جناب کی عدالت عالیہ میں یہ شہادت کس نے پیش کی ہے؟ اور اس کا شاہد کون ہے؟ صرف جناب کا وہم، یا استاذ محترم کا ارشاد؟ آپ نے دیکھ لیا کہ دعویٰ ہے اس زمانہ میں نفی شریعت و نبوت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کا اور دلیل ہے فرضی "حقیقت" اور خیالی "شہادت"!

۲ ــــــ اسی سلسلہ کی دوسری مثال یہ ہے کہ جب آپ کو احساس ہوا کہ "در حقیقت جو شہادت موجود ہے" کی خالی فائرنگ سے تشریع نبوی علیہ الصلوۃ والسلام کا قصر محکم مسمار نہیں کیا جا سکتا، تو موصوف نے اس کے لئے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی استعمال کر ڈالا۔ یعنی :

> "قیاس یہ کہتا ہے کہ آنحضرت جو وقت وفات تک اہل عرب کی اخلاقی اصلاح (۱) کی شدید جدوجہد میں مصروف، اور اپنی قومی

---

(۱) واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی تحریر میں "نفاق" اور "الحاد" کا زہر اس قدر خفی اور معصومانہ انداز میں ملانے کے عادی ہیں کہ وہاں تک عام نظر کا پہنچنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے، یہاں مصروفیات نبوی کے ذیل میں "اصلاح امت" اور "خلافت الہیہ کی تنفیذ" یا کوئی اور لفظ جو اسلامی ذوق کے مناسب ہوتا۔ کی بجائے" عرب کی اخلاقی اصلاح" اور "

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

ریاست کی تنظیم میں مشغول رہے۔ ان کو اتنا وقت کہاں مل سکتا تھا کہ وہ زندگی کی جزئیات کے لئے قوانین مرتب فرماتے"۔

(فکر و نظر جلد ا ش ا ص ۱۷،۱۸)

ان کے اس "قیاس یہ کہتا ہے" پر ہم پہلے مقالہ میں کسی قدر بحث کر چکے ہیں' یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ ایک طرف ان کے "سنگین ادعاء" کو رکھئے اور دوسری طرف ان کے استدلال اور ثبوت کو ملاحظہ فرمایئے' چاہتے ہیں کہ صرف "قیاس یہ کہتا ہے" کی "پھونکوں" سے نبوت محمدیہ کے آفتاب عالمتاب کی شمع فروزاں کو گل کر دیں' گویا خدا ورسول' وحی و نبوت جیسے حقائق واقعیہ کو میک گل یونیورسٹی کے "ڈاکٹر" کے دائرہ قیاس میں آنا چاہئے' بد قسمتی سے اگر کچھ محکم حقائق ان کے "قیاس مقدس" کے دائرہ میں نہ آ سکیں تو ان کا وجود نہ صرف مشکوک ہو جائے گا بلکہ ڈاکٹر صاحب بالقابہ اس کی قطعی "نفی" کا دعویٰ بھی کر ڈالیں گے' پھر ان کے "قیاس یہ کہتا ہے" کی گہرائی' گیرائی اور وسعت کا اندازہ بھی کیجئے جب ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی زد میں لایا جا سکتا ہے' اور محض قیاس آرائی کے بل بوتے پر نفی تشریع کا طوفان برپا کیا جا سکتا ہے' تو اسلام کے دوسرے مسائل قطعیہ اور اسلامی تاریخ کی دوسری بلند پایہ "شخصیات" کے بارے میں یہ "قیاسی منجنیق" کیوں نصب نہ کی جائے گی' اندریں صورت اب تو اسلام کا "وجود"

اپنی قومی ریاست کی تنظیم" کے الفاظ خالص دجل و نفاق اور الحاد و زندقہ کی قطعی دلیل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی ایسا تصور (یا عقیدہ) مشکل ہی سے برداشت کر سکتے ہیں جو ان کے مغربی آقاؤں کے لئے گرانی طبع اور ناگواری خاطر کا باعث بن سکتا ہو (م ی)

صرف ڈاکٹر صاحب کے "قیاس یہ کہتا ہے" کے رحم و کرم پر ہے' اسلام کے جس مسئلہ پر بھی ان کے قیاس کو طیش آجائے' (خواہ اس کی حقانیت پر بیسیوں دلائل موجود ہوں) بس سمجھنا چاہئے کہ اب اس کی خیر نہیں' چنانچہ شرح زکواۃ حرمت ربوا' حرمت شراب' حدود اللہ وغیرہ ان کے اسی قیاسی طیش کا نشانہ بن چکے ہیں' آئندہ خدا ہی جانتا ہے کہ اور کون کون سے مسائل پر یہ مشق ستم جاری رکھی جائے گی۔

۳۔۔۔ اب اس قیاسی اصول کی تیسری مثال دیکھئے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ ایک مغربی مفکر 'ڈارون' نے انسان اور بندر کی بعض مناسبات کو سامنے رکھ کر قیاس کی کڑیاں کچھ اس طرح سے ملائیں کہ انہیں انسان میں' بندر ہی کی ارتقائی شکل نظر آئی' اور انہوں نے بڑی شد و مد اور نہایت بلند بانگی سے یہ اعلان کر دیا کہ انسان کا مورث اعلیٰ اور جد امجد حضرت بندر ہیں' یعنی بندر ہی نے جسمانی ارتقائی مراحل کے تحت ترقی کرتے کرتے انسانی روپ دھار لیا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ہمارے ڈاکٹر صاحب نے پہلے (اپنے ذہن ہی ذہن میں) یہ فرض کر لیا' کہ "وحی الٰہی' اور نبوت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام) نے غریب اسلام کو (چند اخلاقی اصولوں کے علاوہ) کسی قسم کا کوئی اعتقادی' عباداتی' معاشی' معاشرتی' اخلاقی اور سیاسی نظام نہیں بخشا' اسلام اپنے اصل منبع سے بالکل خشک لب اور تہی دامن نکلا تھا' اسلام کی خوش قسمتی تھی کہ قرون وسطیٰ کے فقہا' محدثین' متکلمین' اور سلف صالحین نے اسلام کی تشکیل و تکمیل کا بیڑا اٹھا لیا۔ چنانچہ اسلامی عقائد' عبادات' اخلاق' اور سیاسیات وغیرہ کا تمام ذخیرہ' ان کے بقول' اسی دور کے شخصی آرا و افکار کی پیداوار ہے' گویا کوئی اس خوش فہمی میں نہ رہے کہ اسلام کا سلسلہ سند (یا سلسلہ نسب) ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم اور ذات خداوندی سے

وابستہ ہے' اس لئے کہ بقول ان کے اسلام کے مورث اعلیٰ اور جد امجد تو قرون وسطیٰ کے مفکرین کے شخصی نظریات' باہمی نزاعات' نیز ایرانی' اور باز نطینی روایات ہیں' (ڈارون کے لفظوں میں یوں کہئے کہ کوئی اس خوش فہمی میں نہ رہے کہ انسان کے جد امجد حضرت آدم ہیں انسان کے مورث اعلیٰ تو حضرت بندر ہیں' صرف دم مرور ایام سے گھستے گھستے غائب ہو گئی ہے)۔

اس نظریہ کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ احادیث نبویہ تھیں' جن میں قرآنی آیات بینات کی علمی اور عملی تعبیرو تشریح اور تشکیل کو ہر پہلو سے متعین کر دیا گیا ہے' اور انسانی زندگی کے تمام دینی اور دنیوی معاملات سے متعلقہ اصول و فروع کی تفصیل اور عملی صورت اس معجزانہ انداز میں بیان کر دی گئی ہے کہ کسی جائر کے لئے جور و انحراف کی' کسی مووّل کے لئے تاویل کی اور کسی زندیق کے لئے زندقہ پھیلانے کی مطلق گنجائش باقی نہیں رہنے دی گئی۔ ایمان و عمل کی بحث ہو یا جبرو قدر کی' اطاعت امیر کا مسئلہ ہو یا سلطان جائر کے خلاف آواز اٹھانے کا' امر بالمعروف کے حدود ہوں یا نہی عن المنکر کے' صلح و آشتی کے اصول ہوں یا حرب و پیکار کے' الغرض قیامت تک پیدا ہونے والی تمام ضرورتوں سے متعلقہ ہر قسم کی ہدایات (اجمالاً یا تفصیلاً) احادیث نبویہ میں امت کو دیدی گئی ہیں۔ قرآن کریم نے اس امت کو امت وسط' معتدل امت' کا خطاب دیا تھا۔ اسی لئے حدیث نبوی علیہ الصلوۃ والسلام نے ہر معاملہ میں اعتدال پر مبنی ہدایات و احکام امت کے لئے متعین فرما دیئے اور تفصیلاً (کھول کھول کر) بتلا دیا' کہ فلاں فلاں مسئلہ میں افراط یا تفریط کے حدود یہ ہیں' اور نقطہ اعتدال یہ ہے۔

حاصل یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے تجدد پسندانہ اجتہاد کی بڑی روک احادیث نبویہ تھیں' جو اصطلاحاً متواتر' مستفیض اور مشہور ہیں' یا کم از کم صحیح اور مقبول اسانید کے

ساتھ کتب حدیث میں جمع کر دی گئی ہیں' اور جہاں تک انسانی وسائل کی رسائی ہو سکتی تھی ان کو روایت اور درایت کے ہر پہلو سے چھان پھٹک کر امت نے قبول کیا ہے اور اس بارے میں حق تعالیٰ کی تائید غیبی (۲) نے خارق العادۃ طریق پر حضرات محدثین رحمہم اللہ کو حفظ و ضبط' نقد و انتقاد' جرح و تعدیل اور فہم و بصیرت کی وہ محیرالعقول صلاحیتیں عطا فرمائیں کہ انہیں سامنے رکھ کر ایک لمحہ کے لئے بھی عقل سلیم یہ تسلیم نہیں کرتی کہ علوم نبوت کی حفاظت میں کسی قسم کی بھی غفلت' کوتاہی اور تساہل کی گنجائش رہی ہوگی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب بھی معمولی دل گردے کے آدمی نہ تھے' وہ برسہا برس تک مغرب کے "ڈارون صفت ارتقائی" فلاسفہ کی آغوش شفقت کے پروردہ تھے' آپ ہمت مردانہ اور جرأت رندانہ سے کام لے کر آگے بڑھے اور قیاس و وہم' ظن و تخمین کی کڑیاں ملا کر' بزعم خود' ثابت کر دیا کہ انسان کا مورث اعلیٰ بندر ہے' یعنی "یہ تمام احادیث بھی عمل ارتقا کا کرشمہ ہیں' اور سیاسی جنگوں اور نزاعی بحثوں کی پیداوار ہیں' دیکھو شہادت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد جو خانہ جنگی شروع ہوئی اس میں اس وقت کے لوگوں نے (جو صحابہ اور تابعین ہی ہو

---

(۲) یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے مکتب فکر کے لوگ' جب بھی اسلام کے کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس سے پہلے وہ دو مفروضے سامنے رکھ لیتے ہیں ایک یہ کہ خدا تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی کوئی حفاظت نہیں کی' نہ اس کے لئے کوئی ایسا انتظام فرمایا جسے خدائی انتظام' غیبی انتظام' یا تائید خداوندی کا نام دیا جا سکے' دوم یہ کہ جن ہاتھوں کو دین کی امانت اور اس کی حفاظت سپرد کی گئی تھی اور مشیت الٰہیہ جن کو حفاظت دین کے لئے آلہ اور "جارحہ" (کارکن) کی حیثیت سے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی' ان کے علم و فہم اور عقل و بصیرت کی سطح' موجودہ دور کے "بندگان شکم" کی سطح سے کچھ نیچی تو ہو سکتی ہے لیکن اس سے بلند بہرحال نہیں تھی۔ معاذ اللہ (م۔ی)

سکتے ہیں) فلاں فلاں احادیث وضع کیں اور ان کا فرضی سلسلہ سند ذات نبوی علیہ الصلوۃ والسلام سے منسوب کر دیا' اس لئے فرض کرنا چاہئے کہ یہ احادیث اسی ارتقائی فتنہ کی پیداوار ہیں اور دیکھو فلاں موقعہ پر خوارج کا فتنہ کھڑا ہوا' اس موقع پر فلاں قسم کی احادیث کی نشرو اشاعت ہوئی' اس لئے یقین کرو کہ اس سلسلہ کی تمام احادیث کا جد امجد بھی فتنہ ہے' لیکن حدیثیں پیش کرنے والے ان میں قوت پیدا کرنے کے لئے "یوں ہی" ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے رہے' اور دیکھو فلاں موقع پر فتنہ اعتزال کی وجہ سے ایمان و عمل اور جبرو قدر کی بحثیں چھڑیں اس موقع پر فلاں نوعیت نو کی احادیث کا نشو و نما ہوا اور اس وقت کے اکابر محدثین نے مصالحانہ حدیثیں بنا بنا کر۔ ان میں تقدس کی شان پیدا کرنے کے لئے انہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا' وقس علی ھذا۔

احادیث نبویہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا تحقیقی شاہکار یہی ہے کہ وہ کسی خاص "نوعیت" کی احادیث کے مناسب تاریخ اسلامی کے کسی مرحلہ کا انتخاب کر لیتے ہیں' (جو احادیث پر کسی بھی طرح منطبق ہو سکے اور احادیث بھی اس پر منطبق ہو سکیں) اس کے بعد حدیث اور واقعہ کی باہمی مناسبت ان کے اسی قیاسی دعویٰ کے لئے کافی ہو جاتی ہے' کہ یہ احادیث اس واقعہ میں ظہور پذیر ہوئیں' اس لئے مان لینا چاہئے کہ محدثین نے ان معاصرانہ واقعات کو ماضی کی طرف موڑ دیا ہوگا' اس سلسلہ میں خود ان کی اپنی تصریحات ملاحظہ فرمایئے اور اس ضمن میں ان کی قیاس آرائی کی داد دیجئے :

"معلوم یہ ہوتا ہے" کہ راویان حدیث کی سرگرمیاں قاضیوں اور فقیہوں کے عمل اور طریق کار سے نہ صرف غیر متعلق

تھیں، بلکہ بسا اوقات ان کے علی الرغم جاری تھیں، فقہا اپنے فقہی امور "زندہ اور جاری سنت" کی بنا پر طے کرتے تھے اور فقہ کی توسیع کی غرض سے اپنی "ذاتی رائے" کے ذریعہ حاصل شدہ مواد کی "آزادانہ تعبیر" کرتے تھے اس کے برعکس راویان حدیث اپنا بنیادی کام یہ سمجھتے تھے کہ وہ صرف روایت پر اکتفا کریں، کیونکہ ان کی غرض یہ تھی کہ کسی طرح فقہی نظام میں ثبات و استقرار پیدا ہو۔ اگرچہ قلت مواد کے باعث یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ فقہا اور راویاں حدیث کا ٹھیک ٹھیک کیا تعلق تھا، لیکن "یہ امر یقینی ہے" کہ بالعموم یہ دونوں فریق ایک قسم کے تناؤ کے دوسرے تھے، جن میں ایک فقہ کی نشو و نما اور ترقی کا معاون تھا اور دوسرا اس میں ثبات و استقرار پیدا کرنا چاہتا تھا۔"

(فکر و نظر جلد ا ش ۳، ۴ ص ۱۴، ۱۵)

اس فقرہ میں موصوف نے فقہ اور حدیث کے ربط و تعلق کی جو فرضی تصویر کھینچی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ذرا اس کا جائزہ لیجئے، بد قسمتی سے ان کے مغربی اساتذہ اتنا مواد فراہم نہیں کر سکے جس سے انہیں فقہا اور راویان حدیث کے مابین ٹھیک ٹھیک اور صحیح صحیح تعلق کا سراغ مل جانا ممکن ہوتا، لیکن اس ناممکن صورت حال میں بھی "سروش مغرب" کی جانب سے ان کے کان میں "معلوم یہ ہوتا ہے" اور "یہ امر یقینی ہے" کا القاء کر دیا گیا کہ :

۱۔ راویان حدیث فرضی احادیث بنانے اور انہیں ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں سرگرم تھے۔

۲۔ فقہا اپنے فقہی امور "اپنے اپنے علاقہ کے رسم و رواج" جس کا

خوبصورت لقب ان کی اصطلاح میں "زندہ اور جاری سنت" ہے۔ کی بنیاد پر طے کیا کرتے تھے' اور فقہ کی توسیع اور ترقی کے لئے ان کا سارا زور اپنی ذاتی رائے سے حاصل شدہ مواد کی آزادانہ تعبیر پر صرف ہوتا تھا' (یعنی قرآن اور سنت نبوی علیہ السلام کی طرف وہ کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔)

۳۔ گویا نہ تو راویان حدیث اور ان کی سرگرمیوں کو فقہا اور ان کے طرز عمل اور طریق کار سے کوئی ادنیٰ تعلق تھا' نہ فقہا نے محدثین کی طرف التفات کی کبھی زحمت گوارا کی تھی' بلکہ دونوں فریق ایک دوسرے کے علی الرغم اپنا اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے' یوں یہ دونوں فریق ایک ڈوری کے تناؤ کے دو سرے بن کر رہ گئے تھے' جن کے درمیان' مقصد' عمل' اور طریق کار کے اعتبار سے کوئی نقطہ اتحاد' اور جہت وحدت نہیں پائی جاتی تھی۔ اس سے قطع نظر کہ "قلت مواد" کے باوجود موصوف نے یہ فرضی تاریخ کیسے مرتب کرلی' اور اسلامی تاریخ کے کون سے سن میں یہ ہولناک واقعہ پیش آیا؟ اور اس فرضی تاریخ کے دور میں اسلام کا کیا بنا؟

لیکن کیا کوئی ڈاکٹر صاحب سے دریافت کر سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف بلکہ بالکل ضد' اور علی الرغم اپنی اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے والے دونوں فریق پھر کب سے متحد ہوئے؟ بالآخر ان میں ملی بھگت کا مرحلہ کیونکر پیدا ہو گیا؟ اور فقہی احکام و مسائل کے نکر قرآن و حدیث کے موافق کیسے مرتب ہونے لگے؟ ان دونوں فریقوں کو ضد و عناد کے طرز عمل سے کس نے ہٹایا؟ اور ان دونوں کے فطری مزاج' مختلف مقاصد' اور الگ الگ طریق کار میں کس چیز نے تبدیلی پیدا کر دی؟ وہ کون سے عوامل تھے جو بالآخر فقہا و محدثین کو ایک ہی سطح پر کھینچ لائے؟

ہم جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ان سوالات کا پیش کرنا لغو ہے' ان کا مقصد تو صرف یہ ہے' کہ اسلامی تاریخ سے ناواقف متجددین' جدت پرستوں کو

الو بنا کر اسلام کے عظیم الشان ذخیرہ' فقہ و حدیث کا رشتہ ذات نبوت صلی اللہ علیہ وسلم سے کاٹ دیا جائے' اس کے لئے انہوں نے یہ سارا فرضی افسانہ تراش لیا' ان کی بلا جانے کہ اس لایعنی افسانہ نگاری سے کسی قسم کے سوالات ابھر سکتے ہیں' مزید سنیئے:

"یہ امر واقعہ ہے' کہ دوسری صدی ہجری کی جو تصانیف ہم تک پہنچی ہیں ان کا سلسلہ روایت صحابہ بلکہ تابعین اور تبع تابعین تک آخر ختم ہو جاتا ہے' لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا
"معلوم ایسا ہوتا ہے" گویا حدیث کی تحریک نے داخلی تقاضے سے مجبور ہو کر سلسلہ روایات کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے اس کے فطری مرکز و محور یعنی ذات رسالتمآب تک پہنچا دیا"

(فکر و نظر ج ۱ ش ۳'۴ ص ۱۵)

یہاں بھی آپ دیکھ رہے ہیں' کہ ڈاکٹر صاحب نے "یہ امر واقعہ ہے" اور "معلوم ایسا ہوتا ہے" کے دو فرضی بم گرائے اور تمام ذخیرہ حدیث کو بھسم کر کے رکھ دیا' فرضی تاریخ کا طوفان برپا کیا' اور محدثین کی پوری جماعت کی تمام محنت پر پانی پھیر دیا' اگر آپ ڈاکٹر صاحب سے یہ سوال کریں گے تو وہ فوراً بگڑ جائیں گے کہ یہ واقعہ کہیں خارج میں بھی موجود ہو سکتا ہے؟ یا یہ صرف جناب اور جناب کے مغربی اساتذہ کا خانہ ساز واقعہ ہے۔

یا یہ سوال کیا جائے کہ دوسری صدی کی کتنی تصانیف جناب تک پہنچ سکی ہیں؟ اور ان میں مرفوع احادیث کا اوسط کیا ہے؟ اور موقوف احادیث کا اوسط کیا ہے؟ اور یہ کہ تحریک حدیث کا مفہوم آپ کے تحقیقاتی ادارے میں کیا ہے؟ اور اس کے داخلی تقاضے کیا تھے؟ اور یہ کہ سلسلہ روایات کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے فرضی طور پر ذات

رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دینے کا افسانہ کس ناول میں آپ نے پڑھا ہے؟ اور کس ماخذ سے آپ کو اس "پراسرار تحقیق" کا انکشاف ہوا ہے۔؟

ڈاکٹر صاحب کے "اساطیری افسانہ" کو واقعات کی ترازو میں تولنا چاہو' تو دوسری صدی کی تصنیف "الموطا" کی مرفوع اور موقوف احادیث کی الگ الگ فہرست مرتب کرکے ان دونوں کا اوسط نکالو' اس کے بعد دوسری صدی کے بعد کی تصنیف "مصنف ابن ابی شیبہ" میں درج شدہ مرفوع اور موقوف روایات کا اوسط نکالو' پھر الموطا اور مصنف ابن ابی شیبہ سے حاصل کردہ اوسط کا تقابلی جائزہ لو' آسانی سے یہ معلوم ہو جائے گا' کہ ڈاکٹر صاحب نے کس طرح واقعات سے آنکھیں بند کرکے یہ افسانوی طوفان برپا کیا ہے' اس قسم کے مزید اقتباسات بینات بابت ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۶۶ء میں ملاحظہ فرمایئے۔ اور ڈاکٹر صاحب کی مفروضات تراشی کی داد دیجئے۔

۴۔۔۔۔ اب اس فرضی تاریخ سازی' خیالی افسانہ نگاری اور خانہ ساز مفروضات کی چوتھی مثال ملاحظہ فرمایئے۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا واقعہ قرآن کریم میں مذکور' احادیث (۱)متواترہ سے ثابت اور تمام امت مسلمہ کا مسلمہ عقیدہ ہے۔ حدیث' سیرت اور تاریخ' کی کونسی کتاب ہے جو اس تاریخ نبوت و رسالت کے منفرد اور سرتاپا اعجاز واقعہ کے ذکر سے خالی ہے؟ لیکن چونکہ مغربی یونیورسٹیوں میں اسے شرف پذیرائی حاصل نہیں' اس لئے موصوف کی "اسلامی غیرت" نے پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) میں اعلان کیا۔ (لطف یہ کہ موصوف کا یہ اعلان" مذاہب عالم" کانفرنس میں' پاکستانی

---

(۱) واضح رہے کہ اس واقعہ کے نقل کرنے والے صرف صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعداد کم و بیش تیس تک پہنچتی ہے۔

ممدوح ادارہ تحقیقات اسلامی حکومت پاکستان کے نمائندہ اور اسلام کے وکیل کی حیثیت سے ہے) کہ :

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کو عام طور پر جس طرح پیش کیا جاتا ہے وہ اس توہمات پرستی کی، جس کا قرآن مجید سے کوئی ثبوت نہیں ملتا، ایک مثال ہے۔"

(فکر و نظر جلد ۴ ش ۱ ص ۲۱)

یہ بحث تو اپنی جگہ رہی، کہ واقعہ معراج کے تسلیم کر لینے سے "توہمات پرستی" کا "جن" کیسے چمٹ جاتا ہے؟ اور یہ کہ اس قسم کی "توہمات پرستی" کی مثالوں کا۔ جن میں سے یہ ایک مثال ہے۔ کتنا بڑا ذخیرہ موصوف کے "نہانخانہ دل و دماغ" میں بھرا پڑا ہے، اور یہ کہ انہیں یہ انکشاف کیسے ہوا کہ قرآن مجید معراج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ثبوت سے خالی ہے۔ چونکہ ہم اس مقالہ میں موصوف کے نظریات سے نہیں بلکہ ان کے اصول تحقیقات سے بحث کر رہے ہیں اس لئے یہاں صرف موصوف سے اس عقیدہ کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ موصوف کے نزدیک مسلمانوں میں یہ عقیدہ کیسے پیدا ہوا؟ سنئے ارشاد ہے :

"معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب مسلمان جزیرہ عرب سے باہر نکلے، اور خاص طور سے عراق میں ان کا عیسائیوں سے سابقہ پڑا، تو انہیں مجبوراً عیسائیوں کے اس اعتقاد کے جواب میں کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے جانے کے بعد آسمان کی طرف اٹھائے گئے تھے۔ معراج کو جسمانی شکل میں پیش کرنا پڑا"۔

(حوالہ بالا)

آپ جانتے ہیں، کہ مسلمان بے چارے خلافت صدیقی کے دور ہی سے جزیرہ،

عرب سے باہر نکل پڑے تھے' اور اب تک عرب و عجم اور مشرق و مغرب میں ان کی آمد و رفت جاری ہے اور عیسائیت سے سابقہ تو انہیں عرب کے اندر ہی پڑ رہا تھا اور وہ بھی عہد نبوی علیہ السلام میں' لیکن چونکہ موصوف کا "معلوم یہ ہوتا ہے" کسی خاص دور کی نشاندہی کرنے اور اس کے لئے کسی ماخذ کا حوالہ دینے کے تکلف کا عادی نہیں' بلکہ فرضی افسانہ نگاری سے حقائق کا مقابلہ کرنے کا خوگر ہے اس لئے ہم اور آپ کو اس "فرضی تاریخ" کے متعلق اتنا دریافت کرنے کا بھی حق نہیں' کہ اگر یہ عقیدہ عیسائیت کے جواب میں بنایا گیا تھا تو حدیث' سیر اور تاریخ کی تمام کتابوں کے علاوہ یہ واقعہ قرآن مجید میں کس نے درج کر دیا۔ (کیا ڈاکٹر صاحب کے اس مفروضہ کو کوئی بھی عقل باور کر لے گی؟ کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم و تابعین رحمتہ اللہ علیہم' اسلامی عقائد' "عیسائیت" سے در آمد کیا کرتے تھے۔؟ اور کیا اس قماش کے لوگوں کے واسطہ سے نقل شدہ اسلام اور قرآن پر اعتماد کر لینے کی کوئی گنجائش رہ سکتی ہے؟ استغفراللہ) اسی سلسلہ کی ایک دو مثالیں اور سنتے جایئے :

۱۔........

> "اسی طرح مسلمانوں کے ہاں شفاعت کے مشہور عام عقیدے نے (جس کی بنیاد متعدد آیات قرآنی اور متواتر احادیث نبویہ اور اہل حق کے اجماع پر ہے' ناقل) جو شکل اختیار کی (ہے) وہ عیسائیوں کے کفارے کے عقیدہ کا جواب تھا" (حوالہ بالا)

۲۔___

> "جب اپنے زمانے کی سیاسی زندگی میں عوام الناس نے اپنی روحانی امنگوں اور باطنی تمناؤں کی تکمیل کا سرو سامان نہ پایا تو ان میں تیزی سے یہ تصور پھیلا کہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

نجات دہندہ کے انتظار کی ایک شکل مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی (۱) کا عقیدہ تھا جو عیسایت سے "مستعار" لیا گیا' اور کچھ عرصہ بعد اہل سنت والجماعت کے عقائد کا جزو بن گیا"

(فکر و نظر جلد ا ش ۱۲ ص ۱۱)

.....

"اس کی دوسری شکل وہ تھی جس نے شیعی حلقوں میں جنم لیا اور " شروع کے صوفیا" کی کوششوں سے "اہل سنت" کے عقائد میں جگہ پائی یہ تھا "مہدویت" کا عقیدہ" (حوالہ بالا)

الغرض ڈاکٹر صاحب کی فرضی تاریخ سازی' بے سروپا سخن آرائی' لایعنی افسانہ نگاری' ان کا ایسا تحقیقی شاہکار' اور ان کے فلسفہ ارتقا کا ایسا ضمنی اصول ہے جس کے ذریعہ وہ خدا اور رسول حدیث و سنت 'فقہ و تصوف' عقائد و کلام' پر برابر سنگ باری کرتے چلے جاتے ہیں اور کسی واقعہ کا صحیح بیان تو ان کے مزاج ارتقا و تجدید و تعمیر اسلام کے بالکل ہی منافی ہے' کسی مسئلہ پر علم و یقین کی روشنی میں بحث کرنا ان کے "تحقیقی" معیار (سائنٹیفک ریسرچ) سے بہت ہی فروتر ہے' اور کسی بحث میں راست روی' راست بینی' اور راست گوئی تو ان کی لغت سے بالکل ہی خارج اور مہمل الفاظ

---

(۱) اس مسئلہ پر ضرورت کے بقدر اکابر علما کرام بہت کچھ تفصیل فرما چکے ہیں یہ عقیدہ بقول امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری (نور اللہ مرقدہ' و نفعنا بعلومہ) "تقریبا دو صد احادیث مواترہ سے ثابت' اور ضروریات دین میں داخل ہے اس سے انکار یا اس کی تاویل قطعی کفر ہے (ملاحظہ ہو "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" "عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام" اور "اکفار الملحدین فی ضروریات دین)"

ہیں ان کے "معلوم یہ ہوتا ہے" کی منطق "اتنی ہمہ گیر" واقع ہوئی ہے کہ اس کے ذریعہ جب چاہیں کسی بھی قطعی مسئلہ کو رد و انکار کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔

(آئندہ ان کے دوسرے ضمنی اصولوں پر بحث کی جائے گی واللہ الموفق والمعین)

(بینات رمضان ۱۳۸۶ھ)

ادارۂ تحقیقات اسلامی کا ماڈرن اسلام
ایک نظر میں

صرف نغمے ہی نہیں لے بھی بدلنی ہو گی
باغبانوں نے سنا ہے کہ چمن بیچ دیا
نام دے کر جسے "مذہب" کا رکھا تھا محفوظ
دور حاضر نے وہ "منشور کہن" بیچ دیا

آج سے ساڑھے گیارہ سو سال پیچھے کا منظر تاریخ کی دوربین سے ماضی کے جھروکے میں جھانک کر دیکھو تمہیں اس وقت کے "عقلیت پرستوں" کا کھڑا کیا ہوا ایک فتنہ عریاں ناچتا نظر آئے گا۔ اس فتنہ نے کتنے اہل اللہ کا خون اپنے سر لیا۔ خدا کے کتنے مقبول بندوں کو آزمائش میں ڈالا۔ علم و عمل اور زہد و تقویٰ کی کتنی شمعیں گل کیں۔ تاریخ کے پارینہ اوراق سے دریافت کرو، وہ تمہیں یہ تمام دردناک داستان ہوے کربناک انداز میں سنائیں گے۔ یہ فتنہ جسے فلسفہ یونان کے توشہ دان سے غذا مہیا کی جاتی تھی اور طرح طرح کے رنگین عنوانات سے جس پر کفرواسلام اور ایمان و شرک کے فتوے صادر کیے جاتے تھے اور مطلق العنان خلافت کی پوری قوت جس

کے نافذ کرنے اور زبردستی لوگوں کے سر منڈھنے میں مصروف تھی' اس کا نام فتنہ "خلق قرآن" تھا۔ اور اس فتنہ سے پنجہ آزمائی کے امتحان میں کامیاب ہونے والوں کے سرخیل حضرت امام احمد بن حنبلؒ تھے۔ اپنے تمام جبروتی جاہ و جلال کے باوجود اس فتنہ کو اپنی موت آپ مرتے ہوئے دیکھا گیا' اور وہ اہل حق جنہیں جبر و تشدد کی چکّی میں پیس دینے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا سب نے دیکھا کہ ان کی "حق کوشی" نے انہیں ابدی زندگی کا وارث بنادیا ع

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کی بڑی مدت سے عادی ہو چکی ہے' آج اسی عقلیت' اسی فلسفہ' اسی رنگینی' اسی آب و تاب اور اسی قوت و جبروت کے ساتھ ایک فتنہ تمام ممالک اسلامیہ میں کھڑا کیا گیا ہے اور جسے خلق قرآن نہیں بلکہ بعد میں آنے والا مورخ "فتنہ خلق اسلام" کا نام دے گا اور جسے فلسفہ یونان سے نہیں بلکہ "فلسفۂ مغرب" کے علمی ذخائر سے غذائی رسد مہیا کی جاتی ہے' میں آج چراغ تمنا لے کر کسی احمد بن حنبل کی تلاش میں نکلا ہوں جو اپنے نحیف بدن پر کوڑوں کی ضربیں برداشت کرجائے' لیکن اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے موت کے گھاٹ اتار دے' آج کسی احمد بن نصر کو ڈھونڈنے چلا ہوں جس کی لاش تختۂ دار پر مسلسل چھ سال تک لٹک کر یہ اعلان کرسکے کہ :

"اسلام حادث نہیں قدیم ہے' یہ قرون وسطیٰ کی پیداوار نہیں' خدا کا نازل کردہ ہے"۔

اس کے ساتھ میں ان دوستوں کو جنہوں نے اس فتنہ کے قبول کرلینے پر آمادگی اختیار کرلی ہے یا اس کے خلاف سکوت مصلحت آمیز کا پُرامن راستہ تجویز کرلیا ہے'

کسی کا یہ پیغام دینے چلا ہوں ـــ فریق اول کو یہ کہ :

تم نے مغرب سے خریدے ہیں اندھیروں کے جہاز
تم نے خود کوکب تقدیر وطن بیچ دیا

اور فریق دوم کو یہ کہ :

کوئی دیوانوں سے پوچھے یہ خموشی کیسی!
کیا کہیں نعرہ "بت خانہ شکن" بیچ دیا

دور جدید کے جس فتنہ کا ذکر آپ کے سامنے لایا گیا' اسے جدید اصطلاح میں تجدد پسندی کہا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں اس تجدد پسندی کا تنظیمی مرکز ادارہ تحقیقات اسلامیہ (راولپنڈی) ہے۔ خبر ملی ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامیہ نے "اسلامی قانون" کے موضوع پر ایک جامع کتاب کی تدوین کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس لئے وقت کی نزاکت کے پیش نظر ہمیں چند مختصر لیکن ذرا صاف صاف باتیں عرض کردینی چاہئیں۔

(۱)
ادارہ تحقیقات اسلام

اگر یہ صحیح ہے کہ کسی ادارہ کے اعتماد یا بد اعتمادی' مقبولیت یا مردودیت' افادیت یا لغویت اور کشش یا نفرت کا مدار اس کی عمارتی نمائش' در ودیوار' فرش فروش ساز وسامان اور کتاب خانہ یا لائبریری پر نہیں ہوتا' بلکہ اس بارے میں اصل چیز اس کے اقدار' اس کی روایات' اس کا طرز فکر اور طرز عمل ہوا کرتا ہے۔ اور پھر ان تمام امور کا انحصار اس کے رجال کار' عملہ اور مجلس ادارت پر ہوا کرتا ہے تو ہمیں اعتراف کرنا چاہئے کہ ادارہ تحقیقات اسلامیہ کی پنج سالہ کارکردگی اور اس کی اقدار وروایات' امت

مسلمہ کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ اس ادارہ نے جن ڈاکٹروں' پروفیسروں اور مفکرین کی جماعت اپنی ادارتی تشکیل کے لئے منتخب کی ہے نہ ان کو امت پر اعتماد ہے' نہ امت کو ان پر اعتماد ہے۔ نہ ان کے نزدیک امت کا اسلام صحیح ہے' نہ امت کے نزدیک ان کا "جدید اسلام" قابل قبول ہو سکتا ہے۔ وہ امت کے تمام عقائد کو بیک جنبش قلم غلط اور توہم پرستی قرار دیتے ہیں اور امت ان کے نظریات کو "استاذ مغرب" سے حاصل کردہ بتلانے پر مجبور ہے۔ ان کے نزدیک پوری امت کا فہم حجت نہیں' اور پوری امت اس فیصلہ میں اپنے آپ کو حق بجانب تصور کرتی ہے کہ خود ان ہی کا فہم مسخ شدہ ہے۔ القصہ وہ امت کی کسی چیز کو صحیح ماننے کے لئے تیار نہیں اور امت کے نزدیک ان کی تحقیق ناقابل تسلیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارہ کی طرف سے "ترجمانی مغرب" کے مظاہرے تو بارہا ہوتے رہے ہیں لیکن "ترجمانی اسلام" کے بارے میں اس کی روش انتہائی حد تک مایوس کن بلکہ تباہ کن رہی ہے۔ اس ادارہ کے "ارباب فکر و نظر" نے تجدد پسندی اور اسلام کی نئی تشریح و تعبیر کی دریافت کے لئے تحریف و الحاد کا جو وسیع جال پھیلایا ہے' اور اس کے لئے قرآن و سنت کے علاوہ اسلام اور اسلامی تاریخ کو جس بھونڈے انداز میں مسخ کیا ہے اگر اسے یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب التحریف والالحاد مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس مختصر مقالہ میں اس "دفتر تحریف" کا اجمالی تعارف بھی آسان نہیں' لیکن پھر بھی بحکم "مالا یدرک کلہ لایترک کلہ" (جس چیز کو بتمامہ حاصل نہ کیا جاسکے اسے بالکلیہ ترک بھی نہیں کیا جاسکتا) ضروری ہے کہ چند تحریفی نمونے امت مسلمہ کے سامنے رکھ دیئے جائیں تاکہ امت اس فتنہ "خلق اسلام" سے پوری طرح آگاہ ہوسکے اور علمائے امت کے لئے "قدیم اسلام" کو یکسر مشکوک قرار دینے والے "پنج سالہ کودک نادان" کے بارے میں ایمان و کفر کے شرعی فیصلہ میں آسانی پیدا ہو جائے۔

اسلام کا مفہوم

سب سے پہلے خود "اسلام" کو لیجئے۔ ادارہ تحقیقات اسلامیہ کا آرگن "فکر و نظر" اٹھاکر دیکھئے "چودہ سو سالہ اسلام" کے بارے میں آپ کو جگہ جگہ "روایتی اسلام" "راسخ العقیدہ گروہ کا اسلام" "تشکیلی دور کے بعد کا اسلام" "روایتی طرز فکر" "قدامت پسندی" اور روایت پرستی کے الفاظ ملتے چلے جائیں گے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ادارہ سرے سے اس اسلام کا قائل ہی نہیں' بلکہ اسے قرون وسطیٰ کی مخلوق تصور کرتا ہے۔ اسی مناسبت سے ہم نے اس فتنہ کا نام "خلق اسلام" رکھا۔

پھر اسی پر اکتفا نہیں' بلکہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے دارالافتاء سے اس "پارینہ اسلام" کے بارے میں یہ فتویٰ صادر کیا جاتا ہے :

> " مسلمہ عقاید کے حامیوں کے پاس اسلام ضرور بچ رہا مگر کس حال میں؟ محض پوست' مغز سے محروم' ایک ظاہری رسمی ڈھانچہ روح سے عاری"۔
>
> (فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۳)

اور یہ کہ :

> "اسلام غلو (انتہاپسندی) کے دو پاٹوں میں پس گیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قانون مبرم تھا جو راسخ العقیدہ گروہ کو اس بات پر مجبور کررہا تھا کہ وہ ثبوتی (سائنسی) فکر کو نیست ونابود کردے"۔
>
> (حوالہ بالا ص ۱۵۶)

مزید برآں یہ کہ :

> "اگر قدامت پسندی اپنی روشن ضمیری سے محروم ہوجائے .....تو تمام تمدنی ڈھانچے کا تباہ ہوجانا یقینی ہے۔ بدقسمتی سے اسلام پر

یہی بپتا گزری"۔ (جلد ۲ ش ا ص ۱۸)

چونکہ یہ چہاردہ صد (۱۴۰۰) سالہ پیر کہن اسلام تجدد پسند ادارہ تحقیقات کے نزدیک "آزاد بیمانہ زندگی" میں حارج ہوتا ہے۔ اس لئے زندگی پر سے اسے اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے اور لادینیت (سیکولرازم) کی دعوت دی جاتی ہے :

"اگر روایتی مذہبی تصورات واعمال' خالص دنیوی جدید عقلیت اور سائنسی ذہنیت سے نہایت سختی سے الگ رکھے جائیں تو وہ کتنی دور تک اور کتنی گہری قابل قبول ہوسکتی ہے۔ یہ سوال کافی سوچ میں ڈالنے والا ہے۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ کبھی قابل قبول نہیں ہوسکتی جب تک کہ مذہب کو قطعی طور سے زندگی پر اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کی اجازت نہ دی جائے"۔

(فکر و نظر جلد ۴ ش ا ص ۱۵)

گویا جب تک مسلمان مسلمان رہیں گے اس وقت تک وہ جدید ترقی سے محروم رہیں گے البتہ جب مذہب اسلام کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا اس دن انہیں ترقی نصیب ہوگی۔ اس مقصد کے پیش نظر ادارہ تحقیقات اسلامی نے "روایتی اسلام" کی جگہ "ماڈرن اسلام" پیش کیا اور اس کی ماڈرن تفسیر بھی کر ڈالی یعنی :

"اسلام چند مثالی معیارات اور نصب العینوں کا نام ہے جن کو مختلف معاشرتی مظاہر اور احوال میں ترقی پسندانہ طور پر عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے اپنے عملی اظہار کے لئے ہمیشہ نوبنو اور تازہ بہ تازہ شکلیں تلاش کی ہیں اور وہ اسے ملتی رہی ہیں"۔

(فکر و نظر ۲ ش ۱۱ ص ۶۹۶)

یہی بپتا گزری"۔ (جلد ۲ ش ۱ ص ۱۸)

چونکہ یہ چہاردہ صد (۱۴۰۰) سالہ پیر کہن اسلام تجدد پسند ادارہ تحقیقات کے نزدیک "آزاد بیمانہ زندگی" میں حارج ہوتا ہے۔ اس لئے زندگی پر سے اسے اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے اور لادینیت (سیکولرازم) کی دعوت دی جاتی ہے:

"اگر روایتی مذہبی تصورات واعمال' خالص دنیوی جدید عقلیت اور سائنسی ذہنیت سے نہایت سختی سے الگ رکھے جائیں تو وہ کتنی دور تک اور کتنی گہری قابل قبول ہوسکتی ہے۔ یہ سوال کافی سوچ میں ڈالنے والا ہے۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ کبھی قابل قبول نہیں ہوسکتی جب تک کہ مذہب کو قطعی طور سے زندگی پر اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کی اجازت نہ دی جائے"۔

(فکرونظر جلد ۴ ش ۱ ص ۱۵)

گویا جب تک مسلمان مسلمان رہیں گے اس وقت تک وہ جدید ترقی سے محروم رہیں گے البتہ جب مذہب اسلام کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا اس دن انہیں ترقی نصیب ہوگی۔ اس مقصد کے پیش نظر ادارہ تحقیقات اسلامی نے "روایتی اسلام" کی جگہ "ماڈرن اسلام" پیش کیا اور اس کی ماڈرن تفسیر بھی کرڈالی یعنی:

"اسلام چند مثالی معیارات اور نصب العینوں کا نام ہے جن کو مختلف معاشرتی مظاہر اور احوال میں ترقی پسندانہ طور پر عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے اپنے عملی اظہار کے لئے ہمیشہ نوبنو اور تازہ بہ تازہ شکلیں تلاش کی ہیں اور وہ اسے ملتی رہی ہیں"۔

(فکرونظر ۲ ش ۱۱ ص ۶۹۶)

یہ گرگٹ کی طرح ہر لمحہ نو بنو اور تازہ بتازہ شکلیں تبدیل کرنے والا اسلام' ادارہ تحقیقات اسلامی کے مفکروں نے کہاں سے ڈھونڈھ نکالا؟ کیا قرآن' سنت سے' یا کسی امام وفقیہ یا کسی صحابی و تابعی کے قول سے؟ جی نہیں' بلکہ تاریخ ثقافت اسلامی کے بعض نامور غیر مسلم محققین نے جیسے کہ جی فان گرو مبون ہیں' یہ نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

(جلد ۲ ش ۱۲ ص ۷۷۹)

اور ان ہی بعض نامور غیر مسلم محققین سے سیکھ کر ادارہ تحقیقات اسلامی نے اسے تجدد پسندی کے نقار خانہ میں شامل کر لیا تاکہ دور حاضر کے جس نظریہ حیات کی شکل میں دل چاہے اسلام کو تبدیل کیا جاتا رہے گویا :

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

(۲)

خدا تعالیٰ' وحی اور قرآن

عقل الٰہی :

اب اس اسلام جدید یا ماڈرن اسلام کے چند اصول و فروع ملاحظہ فرمایئے :

" خدائے عالم الغیب والشھادۃ کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا کہ اسے صرف اسی قسم کی پیش گوئی کا حق ہے جس قسم کی پیش گوئی ایک عام آدمی اپنی دانش و بینش اور تاریخی بصیرت کی بنا پر کر سکتا ہے۔ اس سے بالاتر پیش گوئی چونکہ خدا کی طرف سے قبول نہیں

یہ گرگٹ کی طرح ہر لمحہ نوبنو اور تازہ بتازہ شکلیں تبدیل کرنے والا اسلام' ادارہ تحقیقات اسلامی کے مفکروں نے کہاں سے ڈھونڈھ نکالا؟ کیا قرآن' سنت سے' یا کسی امام وفقیہ یا کسی صحابی و تابعی کے قول سے؟ جی نہیں' بلکہ تاریخ ثقافت اسلامی کے بعض نامور غیر مسلم محققین نے جیسے کہ جی فان گرو مبون ہیں' یہ نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

(جلد ۲ ش ۱۲ ص ۷۷۹)

اور ان ہی بعض نامور غیر مسلم محققین سے سیکھ کر ادارہ تحقیقات اسلامی نے اسے تجدد پسندی کے نقار خانہ میں شامل کرلیا تاکہ دور حاضر کے جس نظریہ حیات کی شکل میں دل چاہے اسلام کو تبدیل کیا جاتا رہے گویا :

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

(۲)
خدا تعالیٰ' وحی اور قرآن

عقل الٰہی :

اب اس اسلام جدید یا ماڈرن اسلام کے چند اصول و فروع ملاحظہ فرمایئے :

" خدائے عالم الغیب والشہادۃ کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا کہ اسے صرف اسی قسم کی پیش گوئی کا حق ہے جس قسم کی پیش گوئی ایک عام آدمی اپنی دانش و بینش اور تاریخی بصیرت کی بنا پر کرسکتا ہے۔ اس سے بالاتر پیش گوئی چونکہ خدا کی طرف سے قبول نہیں

کی جاسکتی اس لئے وہ تمام احادیث صحیحہ جن میں صراحتاً" یا ضمناً" پیش گوئی کی نوعیت پائی جاتی ہے انہیں ادارہ تحقیقات رد کردیتا ہے"۔

(ملاحظہ ہو فکر ونظر جلد ا ش ۵ ص ۱۶)

۲۔۔۔۔وحی اور نبی:

وحی اور نبی کے بارے میں ادارہ تحقیقات کی جانب سے یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ:

"وحی ہو یا نبی کا عمل' وہ تاریخ کے ان واقعات سے بے نیاز نہیں ہوسکتے جو فوری طور پر انہیں پیش آتے ہیں۔ چہ جائیکہ وہ خالص نظریاتی کلیات کے استنباط کی طرف توجہ دے سکیں"۔

(جلد ا ش ا ص ۱۷)

۳۔۔۔۔قرآن وسنت:

قرآنی اور نبوی فیصلوں کے بارے میں ادارہ تحقیقات اسلامی کی عدالت عالیہ سے فیصلہ صادر ہوتا ہے کہ:

"چنانچہ وحی ہو یا نبی کا عمل' وہ تاریخ کے ان واقعات سے بے نیاز نہیں ہوسکتے جو فوری طور پر انہیں پیش آتے ہیں' چہ جائیکہ وہ خالص نظریاتی کلیات کے استنباط کی طرف توجہ دے سکیں"۔

(فکر ونظر جلد ا ش ا ص ۱۷)

۴۔۔۔۔قانون نہیں' ایک گونہ نظیر:

" اس قسم کے واقعات کو (جن میں قرآن کریم اور نبی

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی فیصلہ فرمایا' ناقل) نبی کا معیاری نمونہ اور ایک گونہ نظیر تو سمجھا جاسکتا ہے اسے متشددانہ طور پر حرف بحرف قانون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا"۔

(فکر و نظر جلد ا ش ا ص ۱۸)

۵۔۔۔۔۔قرآنی احکام زمانہ نزول کے ساتھ خاص تھے:

"خود قرآن مجید میں بھی اسلامی تعلیمات کا بہت تھوڑا سا حصہ ہے جس کا تعلق عام قانون سازی سے ہے لیکن خود قرآن مجید کا قانونی یا قانون نما حصہ اپنی اس حیثیت کو پورے طور پر واضح کردیتا ہے کہ اس کا تعلق خاص حالات و کوائف سے ہے۔" (بعد کی امت ان سے فارغ' ناقل)

(حوالہ مذکور ص ۱۶)

۶۔۔۔۔۔نصوص شرعیہ:

"ان کے ہاں نصوص قرآن کو بھی اجتہاد کی زد میں لایا جاسکتا ہے اور بدلا جاسکتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"سب سے اہم بات یہ ہے کہ اجتہاد کا دائرہ دراصل بہت محدود کر دیا گیا ہے' یہ کہا جاتا ہے کہ جو چیزیں قرآن و سنت کی نصوص سے طے شدہ ہیں ان پر تو کوئی اجتہاد چل نہیں سکتا۔ اجتہاد کا دائرہ دراصل وہ امور ہیں جہاں قرآن و حدیث کی کوئی نص نہیں ملتی' لیکن حقیقت یہ ہے کہ معدودے چند امور کو چھوڑ کر جو بالکل موجودہ زمانہ کی پیداوار ہیں۔ قرآن و سنت کی کوئی نہ کوئی نص ہر

بات کے لئے موجود ہے"۔ (اب اگر پابند نصوص کو لازمی نظریہ کے طور سے تسلیم کرلیا جائے تو بیچارے "ماڈرن اسلام" کو ہمیشہ نوبنو اور تازہ بتازہ شکلیں کہاں سے ملیں گی اور نامور غیر مسلم محقق "جی فان گروم بون" کی روح کیسے خوش ہوگی۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۴ ص ۲۳۳)

۷ .... ابدیت قرآن

"در حقیقت ابدیت ان علل اور غایات کو حاصل ہے جو قرآنی احکام کی تہ میں ہیں اور جو ہمیشہ قرآن سے صراحتاً" یا کنایتاً" یا سیاقاً" اخذ کی جاسکتی ہیں"۔

(حوالہ بالا ص ۲۳۷)

"نصوص قرآن پر تبدیلی کئے بغیر اڑے رہنے سے ان کی علت غائی اور مقصد حقیقی کا فوت ہوجانا یقینی ہے"۔

(فکر و نظر جلد ا ش ۷ ص ۷۶)

۸ ـــــ نسخ قرآن

"قدامت پسندوں کی اصطلاح میں جس طرح دور نبوی میں ناسخ و منسوخ کا سلسلہ جاری تھا ضروری ہے کہ اب بھی جاری رکھا جائے ورنہ کیا تاریخ کے حالات جم کر رہ جائیں گے؟"۔

(ملخصا" فکر و نظر جلد ا ش ۷، ص ۸۷، جلد ۲ ش ۴ ص ۲۴۰)

(۳)

مقام نبوت

اب ذرا اس طرف توجہ فرمایئے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے "ماڈرن اسلام" میں ذات رسالت مآب ﷺ کا کیا مرتبہ ہے، سنت نبویہ کی کیا حیثیت ہے، اور احادیث مقدسہ کی کیا پوزیشن ہے؟

ا ـــــ " آنحضرت ﷺ کے بارے میں شارع ہونے کا تصور قرون وسطیٰ کی رنگ آمیزی ہے :

"اگر ہم آنحضرت ﷺ کی سیرت کو اس "رنگ آمیزی" سے الگ کرکے دیکھیں جو "عہد وسطیٰ کے فقہاء" نے پیش کی ہے، تو ہمیں یقینی طور سے ایسا کوئی رجحان نظر نہیں آتا کہ رسول اپنے وسیع ترین مفہوم میں صرف ایک قانون ساز تھے، جو انسانی زندگی کے لئے جملہ دقیق تمام تفصیلات یعنی انتظامی معاملات سے لے کر خالص "مذہبی مراسم" تک مہیا کر رہے تھے"۔

(فکر و نظر جلد ا ش ا ص ۱۶)

۲........ نبی نہیں بلکہ اخلاقی مصلح

"درحقیقت جو شہادت موجود ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت "اساسی طور" سے بنی نوع انسان کے "اخلاقی مصلح" تھے (یعنی آپ کی اساسی حیثیت نبی کی نہیں بلکہ اخلاقی مصلح کی تھی، ناقل) (حوالہ بالا)

۳......وقتی فیصلے

"وقتاً" فوقتاً" کچھ انفرادی فیصلوں کو چھوڑ کر جن کی حیثیت "محض ہنگامی واقعات" کی ہوتی تھی۔ آپؐ نے اسلام کی ترقی کے لئے بہت کم ہی عام قانون سازی کی طرف توجہ فرمائی ہے"۔

(فکر و نظر جلد ا ش ا ص ۱۶)

۴. اصطلاحی قانون ساز نہ تھے

"ابتدائی اسلامی روایات سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج کل کی اصطلاح کے مطابق وسیع معنوں میں ایسے قانون ساز نہیں تھے کہ دین و دنیا کی ہر بات کے لئے آپ قانونی تفصیلات مرتب فرماتے ہوں"۔

(جلد ا ش ا ص ۱۷)

۵ اور قومی ریاست، قیاس کہتا ہے

"قیاس یہ کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو وقت وفات تک اہل مکہ اور عرب کی اخلاقی اصلاح کی شدید جدوجہد میں مصروف اور اپنی "قومی ریاست" کی تنظیم میں مشغول رہے ان کو اتنا وقت ہی کہاں مل سکتا تھا کہ وہ زندگی کی جزئیات کے لئے قوانین مرتب فرماتے"۔ (فکر و نظر جلد ا ش ا ص ۱۸)

۶......زبردست شہادت

"اس امر کی (کہ نبوی فیصلے قانون کا درجہ نہیں رکھتے بلکہ صرف ایک گونہ نظیر ہیں جنہیں ہر طرح بدلا جاسکتا ہے، ناقل)

ایک زبردست شہادت یہ ہے کہ اوقات نماز اور ان کی جزئیات کے بارے میں آنحضرت نے امت کے لئے کوئی غیر لچکدار اور جامد انداز نہیں چھوڑا (اوقات نماز کو بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ناقل)"۔

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۱۸)

۷......بڑی بڑی پالیسیاں

"محض مذہب یا حکومت سے تعلق رکھنے والی بڑی بڑی پالیسیوں کو طے کرنے یا اہم اخلاقی اصولوں کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرنے ہی میں آنحضرت نے کوئی اقدام فرمایا ہے"۔ (بحوالہ بالا)

۸......وہ بھی صحابہ کے مشورہ سے

"لیکن اس کے لئے بھی آپ اکابر صحابہ سے مشورہ فرمالیا کرتے تھے۔ یعنی ان کا مشورہ تنہائی میں یا پبلک میں حاصل کرلیا جاتا تھا"۔

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۱۸)

ان تمام فرضی مقدمات کا نتیجہ ظاہر ہے کہ اسلام میں خالص "وحی الٰہی" کے فیصلوں کا سرے سے وجود ہی نہیں' کیونکہ اول تو آپ کو "قومی ریاست کی تنظیم" کے دھندوں سے (معاذ اللہ) فرصت ہی کہاں تھی کہ اسلام کی ترقی کے لئے آپؐ کچھ اصول و فروع کی تشریع فرماتے اور پھر جو بڑی بڑی پالیسیاں یا اہم اخلاقی اصول آپؐ نے طے فرمائے بھی' وہ وحی الٰہی اور فراست نبوت سے نہیں بلکہ سب کے سب صحابہ

کرامؓ کے نجی یا پبلک مشورہ سے فرمائے۔ مزید برآں یہ کہ وہ بھی محض وقتی اور ہنگامی تھے۔ اس لئے بعد کی امت ان کی مکلف نہیں۔ ہم آگے چل کر بتلائیں گے کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اسی عقیدہ کے بارے میں فرمایا :

لعنة اللہ والملائکة والناس اجمعین علیٰ هذه العقیدة الباطلة۔

ترجمہ :" اس عقیدہ باطلہ پر خدا کی لعنت' فرشتوں کی لعنت اور تمام انسانوں کی لعنت"۔

(۴)
سنت نبویؐ

سنت نبوی علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام کے بارے میں ادارہ تحقیقات اسلامی نے وقتاً" فوقتاً" جو فتاویٰ صادر فرمائے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ :

(الف) "سنت نبوی کوئی متعین چیز نہ تھی نہ اس نے انسانی زندگی کی کوئی تفصیلی راہنمائی کی' جیسا کہ عہد وسطیٰ کے اسلامی لٹریچر (حدیث وفقہ) سے سمجھ میں آتا ہے"۔

(فکرو نظر جلد ا ش ا ص ۱۶)

(ب) "سنت صرف کسی خاص جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وہ منضبط قوانین کا کوئی سلسلہ پیش نہیں کرتی"۔

(جلد ا ش ا ص ۱۹)

(ج) "پہلے سے فیصلے تیار کرلینے کا اصول رسولؐ کی اجمالی

تعلیمات کے خلاف ہے"۔

(حوالہ بالا)

(شاید رسول کی مخالفت ہی کے جذبہ سے ادارہ تحقیقات جامع کتاب مرتب کرنا چاہتا ہے)۔

(د) "سنت ایک عمومی محیط تصور اور تعالمی اصطلاح ہے"۔

(جلد ا ش ا ص ۱۸)

(ہ) "سنت کے مشمولات کا بڑا حصہ ما قبل اسلام کے رسوم ورواج کے تسلسل پر مشتمل ہے، جس میں عربوں کا بڑا حصہ ہے"۔

(جلد ا ش ا ص ۱۱)

(و) "سنت کا ایک بڑا حصہ قدیم فقہائے اسلام کے "آزادانہ غور وفکر" کا نتیجہ ہے"۔

(حوالہ بالا)

(ز) "قدیم فقہا نے نئے نئے بیرونی عناصر کو بھی سنت میں شامل کر دیا جو یہودی روایات اور بازنطینی وایرانی انتظامی معاملات سے ماخوذ تھے"۔

(جلد ا ش ا ص ۱۲)

(ح) "سنت کا اطلاق صدر اول میں سنت نبوی پر ہی ہوتا تھا۔ تاہم مسلمانوں کا عمل سنت نبوی کے تصور سے الگ نہ تھا بلکہ اس میں داخل تھا۔"

(جلد ا ش ا ص ۳۵)

(ط) "صدر اول کی سنت کا مجموعہ بڑی حد تک مسلمانوں کا پیدا کردہ تھا" (اسلام مخلوق مسلمانان ہے۔ ناقل)

(ظ)"سنت کی تخلیق پیدائش کا ذریعہ شخصی اجتہاد تھا"۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ناقل)۔

(۵)

حدیث نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام

قرآن حکیم کے بعد شریعت اسلامیہ کا مدار حدیث نبوی پر ہے، اس لئے کہ احادیث مقبولہ اسی مشکوٰۃ نبوت سے صادر ہوئی ہیں، جس پر قرآن کریم کا نزول ہوا اور ان میں قرآن کریم کی تفسیر و تشریح اس شرح وبسط سے فرمادی گئی ہے کہ اس سے الحاد و تحریف کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تمام امت مسلمہ نے حجیت حدیث کو ضروریات دین میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ شرح تحریر میں ہے:

"سنت خواہ مفید فرض ہو یا واجب یا فرض وواجب کے علاوہ کیلئے مفید ہو اس کا دینی حجت ہونا دین اسلام کا ایسا بدیہی اور واضح مسئلہ ہے کہ جس کو ذرا بھی عقل و تمیز ہوگی، عورتوں اور بچوں تک بھی، وہ جانتا ہے کہ جس کی نبوت ثابت ہو وہ نبی برحق اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو خبر بھی دے گا وہ اس میں قطعاً صادق ہو گا، اور اس کی پیروی لازم ہوگی"۔

(تقریر التحریر جلد ۳ ص ۲۲)

اور دوسری طرف ہر دور کے ملاحدہ نے اپنے اپنے رنگ میں احادیث نبویہ کو

نشانہ بنایا' اور ان میں طرح طرح سے کیڑے نکالنے کی کوششیں کیں' یہ سلسلہ خوارج سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے' ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ارباب فکر و نظر نے اپنے "خلق اسلام" کے نقطہ نظر سے تمام احادیث نبویہ کو یکسر زمانہ مابعد کی پیداوار، اور "خلق اسلام" کے نقطہ نظر سے تمام احادیث نبویہ کو یکسر زمانہ مابعد کی پیداوار' اور حضرات محدثین کی "تاریخ سازی" قرار دے کر زمانہ گزشتہ کے تمام ملاحدہ کا قرض ادا کردیا' ستم بالائے ستم یہ کہ ان کے نظریہ "خلق اسلام" کی زد سے نہ احادیث متواترہ کو بچ نکلنے کی گنجائش دی گئی نہ احادیث مشہورہ کو' صحیحین کی احادیث کو معاف کیا گیا' نہ دیگر احادیث صحیحہ کو قابل معافی تصور کیا گیا' احادیث نبوت کے بارے میں ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے طوفانی طومار کے کچھ اجزا نقل کرنے سے پہلے لسان الحکمت شاہ ولی اللہ الدہلوی کا ایک حکیمانہ فقرہ نقل کردینا ضروری ہوگا' تاکہ اس ادارہ کے معاملہ میں ناظرین کو صحیح فیصلہ کا موقع مل سکے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں :

"اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علی ان جمیع ما فیہما من النقل المرفوع صحیح بالقطع' وانہما متواتران الی مصنفیہما وانہ کل من یہون امرہما فہو مبتدع غیر سبیل المومنین۔"

(حجتہ اللہ ص ۱۳۴ ج ۱ امیریہ)

ترجمہ :" صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بارے میں علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ ان دونوں میں جس قدر متصل مرفوع حدیثیں ہیں وہ قطعاً صحیح ہیں اور یہ کہ یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفوں تک متواتر ہیں' اور یہ کہ جو شخص ان کے مرتبہ کو بے وزن کرنا چاہتا ہے وہ

مبتدع ہے' اہل ایمان کے راستہ سے ہٹ کر کسی دوسرے راستہ پر چل رہا ہے۔"

اب حدیث نبوی کے بارے میں ادارہ تحقیقات اسلامی کا نقطہ فکر ملاحظہ فرمایئے' یہ طویل عبارتوں کا خلاصہ ہوگا :

۱...... دوسری صدی تک :

الف" : دوسری صدی کی تصانیف کا سلسلہ روایت صحابہ' تابعین اور تبع تابعین پر ختم ہوجاتا تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا حدیث کی تحریک نے داخلی تقاضے سے مجبور ہوکر سلسلہ روایت پیچھے ہٹاتے ہٹاتے ذات رسالت مآب تک پہنچادیا"۔

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۱۵)

ب" : دوسری صدی کے وسط تک زمانہ مابعد کے پیدا کردہ اکثر مذہبی عقائد اور فقہی آراء آنحضرت کی طرف منسوب کئے جانے لگے تھے۔"

(حوالہ بالا)

۲...... اخبار احاد :

"امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ ایسی تمام حدیثوں کو رد کر دیتے تھے' جنہیں بعد میں اخبار احاد سے موسوم کیا گیا۔ سبحانک ھذا بھتان عظیم۔"

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۱۶)

۳...... احادیث میں احتیاط کے باوجود :

"امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کی تمام احتیاطی تدابیر کے

باوجود اس زمانہ تک متعدد احادیث کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ملایا جا چکا تھا۔ مثلاً (اس کے بعد کتاب الآثار کی چار حدیثیں مثالی ذکر کی گئی ہیں)۔"

(فکرو نظر جلد ا ش ا ص ۱۸)

۴.....—— دوسری صدی کے دوران :

"دوسری صدی کے دوران ذخیرہ احادیث میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔"

(فکرو نظر جلد ا ش ۵ ص ۷)

۵.....—— حدیث کا فطری تقاضا :

" تحریک حدیث جس کا ایک اہم سنگ میل فقہ اور فقہی احادیث کے دائرہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی جدوجہد تھی، کی فطرت متقاضی تھی کہ حدیث میں مسلسل توسیع ہوتی رہے، اور نئے حالات کے پیدا کردہ تازہ مسائل سے نمٹنے کے لئے نئی احادیث منظر عام پر آتی جائیں"۔ (گویا جب بھی کوئی مسئلہ پیش آئے اس کے لئے کوئی حدیث گھڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جائے۔ یہ فریضہ تھا جو امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین انجام دے رہے تھے۔ معاذ اللہ۔ ناقل ـ)

(فکر و نظر جلد ا ش ۵ ص ۱۳)

۶.....------بہتان عظیم :

"قدما محدثین خود تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اخلاقی امثال' پند و نصائح اور جوامع الکلم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا۔ خواہ یہ انتساب درست ہو یا نا درست' البتہ فقہ و عقائد کی احادیث کے متعلق سلسلہ روایت کا پوری صحت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچانا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ اب قابل غور یہ ہے کہ ترک صحت کے اصول کو کسی سطح پر بھی تسلیم کر لیا جائے' تو اسے کسی خاص دائرہ تک محدود رکھنا دشوار بلکہ نا ممکن ہوگا۔" (حاصل یہ کہ اخلاقی امثال' پندو نصائح اور جوامع الکلم کی احادیث تو معاذ اللہ خود محدثین کے اقرار سے مشکوک ہیں' اور فقہ و عقاید کی احادیث "قابل غور" تکنیک سے مشکوک ہو گئیں۔ لہٰذا تمام احادیث کو زمانہ ما بعد کی مخلوق فرض کرنا چاہئے)۔

(فکرو نظر جلد ا ش ۵ ص ۱۲)

۷..... سلسلہ سند کا اضافہ :

" احادیث کا بیشتر حصہ در حقیقت قرون اولی کی ذاتی اجتہادی انفرادی آرا "سنت جاریہ" ہیں۔ جن کو حدیث کے آئینے میں عکس پذیر کر دیا گیا' اور اس میں راویوں کے سلسلہ اسناد کا اضافہ ہو گیا۔ (یعنی جس طرح معاذ اللہ احادیث کی فرضی نسبت ذات محمدی کی طرف کر دی جاتی تھی۔ اسی طرح راویوں کا فرضی سلسلہ سند بھی اس پر آویزاں کر دیا جاتا تھا)۔" (فکرو نظر جلد ا ش ا ص ۱۴)

۸۔۔۔۔۔۔۔۔مؤید حدیث احادیث :

"سب سے پہلی حدیث جو حدیث کی تائید میں ملتی ہے۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے روایت کی ہے، یعنی نضر اللہ عبدا سمع مقالتی" الحدیث۔ ایک اور روایت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے روایت کی ہے "لا الفین احدکم متکا علی اریکتہ" آخر میں ایک اور حدیث آتی ہے۔ "حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج وحدثوا عنی ولا تکذبوا علی" یہ تینوں حدیثیں آنحضرت کے ارشاد کی حیثیت سے قابل قبول نہیں، بلکہ انتہائی مشکوک قرار پاتی ہیں۔" (اس لئے فرض کرنا چاہیے کہ یہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے یا ان کے کسی استاذ نے بنائی ہوں گی۔)۔

(فکرو نظر جلد ا، ش ۵ ص ۱۶ تا ۱۹)

۹۔۔۔۔۔۔۔۔پیشین گوئی والی احادیث :

"یہاں ہم ایک عام اصول پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ جس حدیث میں آئندہ واقعات کے بارے میں صراحتاً یا ضمناً پیش گوئی کی گئی ہو۔ یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا سلسلہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہے۔ بلکہ یہ سمجھا جائے گا۔ کہ وہ زمانہ مابعد میں ظہور پذیر ہوئی جب کہ اس حدیث میں ذکر کردہ واقعہ پیش آیا۔"

(فکرو نظر جلد ا ش ۵ ص ۱۵-۱۶)

۱۰۔۔۔۔۔۔۔۔تاریخ سازی :

"حدیث کا کام تاریخ نویسی نہیں بلکہ "تاریخ سازی" بن گیا

تھا جس کے نتیجہ میں معاصرانہ واقعات کو بشکل حدیث ماضی کی طرف پھر دیا جانے لگا۔"

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۵ ص ۱۷)

۱۱..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی بصیرت اور پیش گوئی والی احادیث میں کوئی میل نہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملہمانہ بصیرت اور منزل من اللہ اخلاقی نظام کو ترقی دینے اور کامیاب بنانے والی عمیق تاریخی بصیرت برحق، لیکن اس عظیم تاریخی بصیرت اور اس سے پیدا ہونے والی پر عزم قوت فیصلہ میں اور اس قسم کی پیشگوئی میں جو مثلاً مسلیمہ کذاب کے خروج یا معتزلہ' خوارج اور شیعہ فرقوں کے ظہور سے متعلق حدیثوں میں پائی جاتی ہے' زمین و آسمان کا فرق ہے" (بالکل یہی فرق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ادارہ تحقیقات کے تاریخی بصیرت کے تصور میں۔ اور اسلام کے پیش کردہ تصور نبوت میں بھی پایا جاتا ہے۔ ناقل) ۔

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۵ ص ۱۷)

۱۲..... ضمنی پیش گوئی والی احادیث :

"لیکن پیش گوئی والی احادیث سے مراد صرف وہ احادیث نہیں جن میں صراحتًا کوئی پیشین گوئی ہو' بلکہ وہ حدیثیں بھی مراد ہیں جن میں بالواسطہ یا ضمناً کوئی پیشین گوئی کی گئی ہو۔ مثلاً یہ

حدیث "القدریۃ مجوس ھذہ الامۃ"

(حوالہ بالا)

۱۳......احادیث اجماع :

"امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے اجماع کے اصل شرعی ہونے پر دو حدیثیں پیش کی ہیں۔ "ثلاث لا یغل علیھین قلب مسلم" الحدیث اور "اکرموا اصحابی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" والی حدیث امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے پیشرو تصور اجماع سے خالی نہ تھے۔ لیکن ان کے زمانہ تک یہ بالکل فطری طور پر نشو و نما پاتا رہا۔ اور اس پر حجت لانے کی کوشش اس مرحلہ پر عمل میں نہیں آئی تھی۔ حتی کہ امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ اور امام محمد رحمتہ اللہ علیہ اجماع کے زبردست حامی ہونے کے باوجود کوئی حدیث نبوی پیش نہیں کرتے' متقدمین فقہا کا اجماع پر اصرار کے باوجود کوئی حدیث پیش نہ کرنا حدیث کی نوعیت اور اس کی نشو و نما پر ایک معنی خیز تبصرہ ہے۔" (اس لئے فرض کرنا چاہیئے کہ احادیث اجماع بھی معاذ اللہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے تصنیف کیں' یا ان کے کسی معاصر نے۔ ناقل)"۔)

(فکر و نظر جلد ا ش ۵ ص ۱۹ تا ۲۱)

۱۴......امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے بعد :

"امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے اجماع کی حمایت میں فرمایا

تھا۔ ونعلم ان عامتہم لا یجتمع علی خلاف لسنۃ رسول اللہ ولا علی خطاء انشاء اللہ"۔امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے بعد جب حدیث کی اشاعت اور زیادہ کثرت سے ہونے لگی تو ان کا یہ بیان ایک حدیث بن گیا اور مسند امام احمد بن حنبل، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں لفظی ردو بدل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو گیا۔"

(فکر و نظر جلد ا ش ۵ ص ۲۲)

۱۵۔۔۔۔ بعد کی صدیوں میں :

" ان ہی بعد کی صدیوں میں 'یداللہ علی الجماعۃ" والی حدیث بہت مشہور ہوئی' اس تصور کو بعض دوسری حدیثوں میں بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ (الغرض اس مضمون کی تمام احادیث امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے بعد کے اکابر محدثین کی بناوٹ ہیں)۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔ ناقل)۔"

(فکر و نظر جلد ا ش ۵ ص ۲۳)

۱۶ :.... لغت اور حدیث کے مجموعے :

"لغت کی نپی تلی تعریف اگر احادیث کے مجموعوں میں راہ نہ پاتی تو مقام حیرت تھا۔"

(فکر و نظر جلد ا ش ۵ ص ۷۷)

۱۷۔۔۔۔۔لغت کی جنتری اور حدیث کے بل :

"لغت کی جنتری کے ذریعہ سے غیر قطعیت کے بل نکل

جانے کے بعد سیوطی کی جامع صغیر میں "کل قرض جر منفعة فھو ربا" کی صورت میں یہ حدیث موجود ہے"(اور اس عرصے میں عمل ارتقاء نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا، اور حضرت علی سے مروی ہو کر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بن گیا۔)

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۵ ص ۷۸)

۱۸۔۔۔۔۔۔۔۔ فقہی احادیث اور ارتقائی عمل :

" فقہی احادیث میں ارتقائی عمل نے ان کے استناد کو مشکوک اور مشتبہ بنا دیا ہے۔"

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۵ ص ۸۷)

۱۹۔۔۔۔۔۔۔۔ احادیث الفتن :

"حضرت عثمان کے بعد کی سیاسی جنگوں اور کلامی بحثوں کے نتیجہ میں اس قسم کی احادیث کا نشو و نما ہوا جن میں پیش گوئی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس قسم کی احادیث کو احادیث الفتن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔" (ان فرضی احادیث الفتن کو بنانے والے اس وقت کے صحابہ یا اکابر تابعین ہی ہو سکتے ہیں۔ ناقل)۔"

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۸)

۲۰۔۔۔۔۔۔ حاوی حدیثیں :

"ان احادیث کی وجہ جواز کے لئے ایسی احادیث کی اشاعت کی گئی جو اس نوع کی تمام احادیث پر حاوی ہیں۔ مثلاً حضرت حذیفہ

کی یہ متفق علیہ روایت : قام فینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مقاما ما ترک شیئا الحدیث۔"

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۸)

۲۱۔۔۔۔۔۔مثالی نمونہ :

"حدیث فتن کا ایک مثالی نمونہ بخاری و مسلم کی حسب ذیل روایت جو ان ہی حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے : کان الناس یسئلون رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن الخیر و کنت اسئلہ عن الشر الحدیث ان دونوں حدیثوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعی ارشادات کی حیثیت سے تسلیم کرنا ممکن نہیں۔"

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۹ تا ۱۱)

۲۲۔۔۔۔۔۔احادیث اجماع :

"اجماع (تمسک بالجماعت) سے متعلقہ احادیث بھی اسی زمانہ کے شدید سیاسی تقاضے پر مبنی ہیں۔"

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۵ ص ۱۱)

۲۳۔۔۔۔۔۔ خارجیت کا توڑ :

"خارجیت کی مخالف احادیث کی نمائندہ حدیث، جو خارجیوں کی باغیانہ فطرت کے بالمقابل مکمل انفعالیت سکون پسندی اور دنیا سے کنارہ کشی کی تعلیم دیتی ہے۔ صحیح مسلم کی یہ حدیث ہے : عن ابی بکرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

ستکون فتن القاعد فیہا خیر من القائم الحدیث۔یہ حدیث خارجیوں کی فعالیت اور سیاسی امور سے ان کی دلچسپی کا توڑ کرتی ہے۔" (یہ بھی صحابہ یا اکابر تابعین میں سے کسی نے بنائی ہو گی' کیونکہ خارجی فتنہ کا زور اسی زمانہ میں تھا۔ناقل)۔

(حوالہ بالا ص ۱۲)

۲۴...... عقیدہ اجماع باطل :

"بعض اوقات ایسی احادیث جن میں دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی تعلیم دی گئی ہے' عقیدہ اجماع کو باطل کر دیتی ہیں۔ مثلاً ترمذی شریف میں عبداللہ بن عمرو بن عاص کی صحیح حدیث" : کیف بک اذا بقیت فی حثالۃ من الناس"

(حوالہ بالا)

۲۵......خارجی الاصل :

"لیکن سنیوں کی تمام احادیث یکسر مخالف خوارج نہیں۔ امام احمد' ابو داؤد' ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت کردہ ایک حدیث جس میں ایک ایسے سیاسی عقیدہ کا نفوذ پایا جاتا ہے جو بلاشبہ خارجی الاصل ہے" : اوصیکم بتقوی اللہ الحدیث"

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۱۳)

۲۶......مرجئیہ عقاید کا بہترین نمونہ :

"صحیحین کی مشہور و معروف حدیث "وان زنی وان سرق" جو خوارج کے عقیدہ تکفیر بالکبائر کے مقابلہ میں بنائی

گئی۔ مرجئیہ عقائد کا بہترین نمونہ ہے۔"

(حوالہ بالا صفحہ ۱۵' ۱۶)

۲۷...۔۔۔۔۔۔اعتدال پسندانہ خیال :

"مندرجہ بالا حدیث سے اس بات کا قوی احتمال تھا کہ بعض طبائع کی اخلاقی حس کو دھچکا لگتا اس کی جزوی ناگواری کو رفع کرنے کے لئے ابو داؤد اور ترمذی کی ایک حدیث میں نسبتاً اعتدال پسندانہ خیال پیش کیا گیا : عن ابی ھریرۃ اذا زنی العبد خرج منہ الایمان الحدیث' صحیحین میں اس مضمون کی حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہ الفاظ ذیل مروی ہے : لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن۔ الحدیث"

(جلد ا ش ۶ ص ۱۷)

۲۸...۔۔۔۔۔۔اعتزال کی مخالف احادیث

"معتزلہ چونکہ خوارج کے وارث تھے' نیز مذہبی ذہنیت کے لئے "معتزلی عقلیت" انسانیت پرستی کی بھدی شکل تھی۔ "غالباً" ان ہی دو خطرات کے پیش نظر کثیر تعداد میں ایسی احادیث کی تعلیم دی جانے لگی جن میں ارادہ' نیت اور عمل تینوں سطحوں پر جبر کی تعلیم دی گئی' جبر کی تعلیم پر مشتمل حدیث کی نسبتاً ابتدائی صورت کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اس نوع کی احادیث میں چند در چند اضافہ ہوتا گیا۔ مثلاً مسند احمد کی یہ حدیث القدریۃ مجوس ھذہ الامۃ" اس میں فلسفیانہ استدلال کا ایک ایسا

پیچیدہ طرز اختیار کیا گیا ہے، جسے ساتویں صدی کے عربوں (صحابہ) کی طرف منسوب کرنا نادرست ہوگا، ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا" : لاتجالسوا اهل القدر ولاتفاتحوهم- ابو داؤد"

(جلد ا ش ٦ ص ١٥-١٩)

"مسلم اور بخاری میں ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث "ان اللہ کتب علی ابن آدم حظه من الزنی" اس زمرہ میں شامل ہے۔"

(حوالہ بالا ص ١٩)

۲۹......احادیث تقدیر :

"بہت سی احادیث میں بڑے تعین اور بڑی وضاحت کے ساتھ روحوں کی تخلیق کے وقت بعض کے لئے جنت اور بعض کے لئے دوزخ کی تقدیر، اور بعض احادیث میں انسانی سعادت و شقاوت کے بارے میں خدا کی بے پرواہی کا اعلان کیا گیا ہے۔ مثلاً بخاری و مسلم میں عبداللہ بن مسعود کی حدیث : حدثنا رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو الصادق الصدوق ان خلق احدکم- الحدیث"

(جلد ا ش ٦ ص ٢٠)

۳۰......خلاف جبریت :

" اوپر کی بحث سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ احادیث صرف

جبریت' تقدیر' پر مشتمل ہیں' اہل سنت کی بعض احادیث' اگرچہ ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ اس مسئلہ پر بالکل مختلف زاویئے سے روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً بخاری و مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث "کل مولود یولد علی الفطرۃ" یا ترمذی ابن ماجہ اور احمد بن حنبل کی روایت کردہ "ھی من قدر اللّٰہ" والی حدیث یا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد "نعم من قدر اللّٰہ الی قدر اللّٰہ" اس دوسری قسم کی حدیث کے باوجود' "جو جبر کی احادیث کے بالمقابل ایک توازن پیدا کرنے کی کوشش سے عبارت تھی" جبری احادیث سے اہل سنت بہت زیادہ متاثر ہوتے۔ (یعنی عقیدہ تقدیر کے قائل رہے۔ ناقل)۔"

(جلد ۱ ش ۶ ص ۲۲)

۳۱..... احادیث تصوف :

"تصوف کی موافقت اور مخالفت میں روایت شدہ احادیث سے بھی ظاہر ہوتا ہے' کہ اہل سنت ایک درمیانی راہ اختیار کرنے اور انتہاپسندی کے رجحانات کو بڑھنے سے روکنے میں کوشاں تھے۔ (گویا اسی کوشش کے سلسلہ میں یہ احادیث بنائی گئیں۔ ناقل)۔"

(حوالہ بالا)

۳۲..... صوفی تحریک کا اثر و نفوذ اور اہل سنت کا جذبہ باہمہ :

"صحیح بخاری کی کتاب الجہاد میں یہ حدیث جو درج ہے:

قیل یا رسول اللہ ای الناس افضل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مومن یجاھد فی سبیل اللہ بنفسہ ومالہ۔ الحدیث۔اس سے اس امر کا نمایاں ثبوت ملتا ہے' کہ صوفی تحریک کا اثر و نفوذ کس قدر بڑھ گیا تھا' اور اہل سنت میں باہمہ ہونے کا جذبہ کس حد تک کارفرما تھا'
(گویا فرض کرنا چاہئے کہ بخاری کی یہ حدیث صوفی تحریک کے اثر و نفوذ اور اہل سنت کے "جذبہ باہمہ" کی پیداوار ہے۔ ناقل)۔

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۲۳)

۳۳...۔۔۔۔۔۔چبھتی ہوئی مثال :

"گوشہ نشینی اور ترک دنیا کے رجحان کے خلاف احادیث بھی ہمیں ملتی ہیں' جو تاثیری قوت میں پہلی قسم کی احادیث سے کسی طرح کم نہیں' صوفیاء کے نظریہ توکل کی انتہائی تعبیرات کے برعکس کسب معاش کی احادیث' اور غالی زہد و تقشف کی مذمت کی احادیث اپنی شہرت کی وجہ سے محتاج مثال نہیں۔ (یہ تمام بھی اہل سنت کے جذبہ اعتدال کی پیداوار ہیں۔) البتہ اس مضمون کی چبھتی ہوئی مثال یہ حدیث ہے۔ "رھبانیۃ ھذہ الامۃ الجھاد فی سبیل اللہ عز و جل۔"

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۲۴)

۳۴...۔۔۔۔۔۔انمل' بے جوڑ' مصنوعی :

"نسائی شریف کی یہ حدیث "حبب الی من الدنیا

النساء والطیب و قرة عینی فی الصلوة" اس کے تینوں عناصر الگ الگ سنت نبوی کی نمائندگی کرتے ہیں' لیکن دنیوی مسرت اور دینی عبادت کے دو مختلف النوع اقدار کو ایک ہی سانس میں جس انمل اور بے جوڑ طریقے سے مربوط کیا گیا ہے وہ یقیناً ایک مصنوعی ترکیب ہے۔ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہرگز منسوب نہیں کیا جا سکتا' یقیناً اس سے صوفیاء کی غیر موتلف روحانیت کو نشانہ بنانا تھا اور بس۔"

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۲۴)

۳۵...........اصولی احادیث :

"ہم نے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ ان احادیث کی ہیں جنہیں ہم "اصولی" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی وہ احادیث جن پر مبادیات دین کی ساری عمارت کی بنیاد قائم ہے۔ اگر اجماع اور حدیث جیسے بنیادی اصولوں کے بارے میں احادیث تاریخی طور پر غیر صحیح ثابت ہوجائیں تو دوسری بیشتر احادیث کی صحت یقیناً معرض خطر میں پڑ جاتی ہے (بلکہ بلفظ صحیح اسلام کی بنیاد اکھڑ جانے سے خود اسلام ہی کا قصر بلند مسمار ہو کر رہ جاتا ہے' اور یہی ادارہ تحقیقات اسلامی کے فتنہ خلق اسلام کا مقصد ازلی اور ہدف اصلی ہے۔ اور یہی درس حریت ادارہ کے مفکرین نے اپنے مغربی آقاؤں سے سیکھا ہے۔ ناقل)۔"

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۷ ص ۱۰)

۳۶____اکثر و بیشتر کا گورکھ دھندا

"ہم نے یہاں لفظ "بیشتر" اور پہلے "اکثر و بیشتر" استعمال کیا' ہم نے تمام احادیث پر شک نہیں کیا' بیشتر اور تمام کا یہ فرق اہم ہے' لیکن صرف نظریاتی حیثیت سے' فی الحال ہمارے پاس اس فرق کی تعیین کے وسائل نہیں (لہذا تمام احادیث کو مشکوک فرض کرتے ہوئے۔ ناقل) ہمیں اب ہر حدیث کو (خواہ وہ متواتر ہو یا مستفیض' صحیحین کی ہو یا ان کے علاوہ کی' اس کی صحت پر امت کا اتفاق ہو یا نہ ہو۔ناقل) فرداً" جانچنا ہوگا اور تاریخی لحاظ سے اس کی صحت کو پرکھنا ہوگا...."۔ (فکر و نظر جلد ا ش ۷' ص ۱۰)

۳۷____صحت اسناد حجت نہیں بلکہ کائناتی اور شاخت کی بحثیں اس کا فیصلہ کریں گی کہ وہ حجت ہے یا نہیں

"علم الرجال مسلمانوں کے عظیم کارنامہ کی حیثیت سے مسلم' محدثین کا اسنادی صحت اور صحیح اور غیر صحیح کے چھاننے میں انتھک محنت کرنا ہم پر بہت بڑے احسان کی حیثیت سے بسرو چشم' الغرض اسناد کی منفی حیثیت تو مسلم' لیکن اسے مثبت قطعی حجت قرار نہیں دیا جاسکتا' مانا کہ زید' مثلاً امام شافعی' ایک ثقہ راوی ہے' اور بکر مثلاً امام مالک بھی' اور یہ بھی تسلیم کہ زید کی بکر سے ملاقات ہوئی تھی' لیکن یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ زید نے بکر سے فلاں حدیث ضروری ہی روایت کی تھی"۔ (سبحان اللہ کیا شان تحقیق ہے' اگر زید نے بلا تحقیق بکر سے روایت کرڈالی تو وہ ثقہ کیسے رہا۔ناقل)

" اسناد کے مثبت قطعی حجت ہونے کے خلاف سب سے "قوی اور قاطع دلیل" یہ ہے کہ خود اسناد کا استعمال پہلی صدی ہجری کے اختتام سے شروع ہوا"۔ (اس قوی اور قاطع دلیل کی سند؟ ناقل)

" نتیجہ یہ کہ مثال کے طور پر بخاری اور مسلم کی پیشین گوئی والی حدیثوں کے اسناد

خواہ کیسے ہی قوی کیوں نہ ہوں ہم ان کی صحت کو قبول نہیں کرسکتے"۔ (ورنہ فتنہ "خلق اسلام" کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ ناقل) کیونکہ ان کی داخلی شہادتیں اس کے خلاف ہیں۔

(ان داخلی شہادتوں کا خلاصہ یہی تو ہے' کہ حضور ﷺ اور عقل الٰہی ان پیش گوئیوں کی صلاحیت نہیں رکھتی' اس لئے فرض کرنا چاہئے' کہ یہ احادیث زمانہ مابعد کی پیداوار ہیں جن کے ذریعہ سے معاصرانہ واقعات کا رخ یوں ہی تاریخ ساز محدثین نے ماضی کی طرف موڑ دیا' معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی جان سکتا ہے' کہ یہ شہادتیں اپنے اندر کتنا وزن رکھتی ہیں جن کی بنا پر تمام احادیث متواترہ' مشہورہ اور صحیحہ کو رد کیا جاتا ہے' اور اکابر ائمہ کو "تاریخ ساز" کا مقدس لقب دیا جاتا ہے۔ ناقل)

(نوٹ) "اسناد پر دو نامور مستشرقین کائتانی اور شاخت کی بحثیں قابل توجہ ہیں"۔ (جی ہاں دین اسلام کی صحیح بصیرت "نامور مستشرقین" کی بحثوں کو قابل توجہ قرار دیئے بغیر حاصل ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ اسلام کی تعریف سے لے کر اس کے تمام اصول و فروع کے لئے ان ہی "نامور مستشرقین" کی زلہ ربائی فرض ہے' نعوذ باللہ من سوء الفہم۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۷ ص ۱۰)

۳۸ ــــــ اساطیر الاولین

"درحقیقت بیشتر (بلکہ گزشتہ تحقیق کے پیش نظر تمام) احادیث مجموعہ ہیں ان کہاوتوں جیسے مقولوں کا جن کی تراش خراش خود قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائی مگر انہیں رسالت مآب ؐ کی طرف منسوب کردیا گیا"۔ (قال الذین کفروا ان ھذا الا اساطیر الاولین۔ ناقل)"۔

۳۹ ــــــ اجتماع نقیضین

"یہ نسبت سراسر بے بنیاد نہ تھی' اگرچہ ان مقولوں میں کہاوتوں کا اسلوب پایا

جانا خود اس بات کی شہادت ہے کہ یہ نسبت تاریخی صحت سے محروم ہے"۔ (گویا یہ نسبت صحیح بھی ہے اور صحت سے محروم بھی۔ناقل)۔"

"الغرض یہ احادیث ایک وسیع الذیل اور عظیم المرتبت شرح ہیں سنت نبوی کی جس کے شارح قرون اولیٰ کے مسلمان ہیں"۔ (لیکن یہ شرح اپنی وسعت اور عظمت کے باوجود صحت سے محروم' اور شارحین کرام غیر صحیح روایات ذات نبوی پر تھوپنے والے۔ ناقل)۔"

چنانچہ سنت نبوی پر مبنی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ یہ سلف صالحین کے بصائر و حکم کا مجموعہ بھی ہیں۔ (لیکن اس مجموعہ "بصائر و حکم" میں جگہ جگہ کیڑے بھی موجود ہیں' جن کو صاف کرنے میں ادارہ تحقیقات کے علمبردار خود اسلام ہی کا صفایا کررہے ہیں۔ ناقل)۔"

(فکر و نظر جلد ا ش ۷ ص ۱۷)

۴۰ ـــــ مرا نہیں اکڑا ہے

"اگرچہ ہم مجموعی طور پر احادیث کی تاریخی صحت کو مشکوک جانتے ہیں' لیکن ہم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ یہ جھوٹی یا جعلی ہیں"۔ (گویا مرا نہیں اکڑا ہے' لیکن ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے فتنہ "خلق اسلام" کی دعا سے یہ قرض بھی ادا ہوجائے گا۔ ناقل)۔"

۴۱ ـــــ تاریخ کی جنتری

"حدیث عائشہؓ تزوجنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا بنت ست' الحدیث۔ یہ حدیث صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداود' سنن نسائی اور دوسری تمام کتب حدیث میں (مختلف اسانید کے ساتھ۔ ناقل) مروی ہے' لیکن چونکہ

تاریخی جنتری اس کی تائید نہیں کرتی اس لئے یہ روایت کسی طرح قابل قبول نہیں ٹھہرتی"۔

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۹ ص ۳۳ ومابعد)

۴۲ـــــ ایمان سے محرومی

"ابن ماجہ کی حدیث عمرؓ ان آخر ما نزلت آیۃ الربا" الحدیث' اس حدیث کو حدیث صحیح سمجھنے والا نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان صحیح رکھتا ہے' نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر' نہ آپ کی رسالت پر' اور روایت پرستی نے اس کی بصارت وبصیرت کی آنکھوں پر "رواۃ پرستی" کی پٹی باندھ دی ہے کہ ان کو اس "افترائی حدیث" کے سوا کچھ نہیں سوجھتا"۔

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۱۲ ص ۶۴)

۴۳ـــــ کوفے کی ٹکسال

"بخاری شریف کی حدیث ابن عباس آخر آیۃ نزلت علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الربوا یہ حدیث کوفے کی ٹکسال میں گھڑی گئی"۔

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۱۲ ص ۷۱)

۴۴ـــــ بصرہ کی ٹکسال

"غرض ربوا کے متعلق حدیثوں میں جو اختلاف واضطراب ہے' اس پر اگر کوئی معترض ہو تو اس کی زبان بندی کے لئے بطور عذر لنگ کے یہ بہتان عظیم حضرت عمر فاروق اعظم پر باندھا گیا (استغفر اللہ۔ ناقل) یہ بہتان بصرے کی ٹکسال میں گھڑا گیا"۔ (حوالہ بالا)

۴۵ ــــــ رواۃ پرستی اور بخاری میں کذب صریح

"یہ سمجھنا کہ صحیح بخاری کی ہر حدیث صحیح ہے' غایت روایت پرستی ہے' صحیح بخاری میں تو "کذب صریح" تک موجود ہے' جس سے ہر بخاری کا پڑھنے والا واقف ہے' زبان سے اقرار نہ کرے یہ اور بات ہے"۔ (لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ا ش ۱۲ ص ۷۵)

۴۶ ــــــ کتب صحاح چولہے میں

"صحاح تک کی ہر کتاب میں قرآن مجید کی محفوظیت ولاریبیت' اور خلق عظیم نبوی پر حرف لانے والی احادیث پاکر ان کتابوں کو پھاڑ ڈالنے اور چولہے میں جھونکنے کو جی چاہتا ہے"۔ (یریدون لیطفؤا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۲۷)

۴۷ ــــــ بخاری' نسائی' ترمذی

"ایسی گمراہ کن حدیثیں منافقین نے ان کتابوں میں داخل کردیں' جس طرح بخاری میں جمع قرآن کا پورا باب بناکر داخل کردیا' اور مختلف مقامات پر اس کی حدیثیں ٹھونس دیں' یہی حال ترمذی' نسائی کا بھی کیا"۔ (یہ توجیہہ بھی ممکن ہے کہ کتابیں اپنی اصل حالت پر ہوں جیسا کہ ان کا تواتر خود اس کا شاہد ہے' مگر ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے "خالقین اسلام" پر الحادی صفراء کا چونکہ غلبہ ہے اس لئے انہیں قند' زہر ہلاہل نظر آتا ہے۔ ناقل)

(حوالہ بالا ص ۲۷۳)

یہ ہیں ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ڈاکٹروں' پروفیسروں اور ارباب فکر و نظر کے الحادی نظریات' جن کا حاصل یہ ہے کہ احادیث بالکلیہ مشکوک' ناقابل اعتبار' جعلی

اور زمانہ مابعد کی پیداوار' اور اسلام قرون وسطیٰ کی مخلوق۔

(۶)
امت مسلمہ اور اجماع امت

دین اسلام کی تیسری بنیاد "اجماع امت" ہے' اجماع امت کی دین اسلام میں کیا اہمیت ہے؟ اس پر غور کرنے کے لئے ہمیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ہوگی کہ دین اسلام خدا تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ ہے' اور قیامت تک کے لئے یہ تمام انسانیت پر حجت قائمہ ہے' اس لئے حکمت الٰہیہ کا تقاضا ہے' کہ یہ قیامت تک کے لئے صحیح حالت پر محفوظ رہے' اور جن واسطوں سے یہ نقل ہوتا ہم تک پہنچا یا قیامت تک پہنچے گا' ان تمام درمیانی کڑیوں کو اس کی فہم اور حفاظت میں منزہ عن الخطا تسلیم کئے بغیر نہ اس کی حفاظت کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے' نہ اسے قیامت تک کے لئے حجت قائمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اب اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ امت مسلمہ کے کسی دور نے اسلام کو صحیح نہیں سمجھا' یا یہ کہ اس کی حفاظت کا حق ادا نہیں کیا' یا کسی غیر اسلامی نظریہ کو اسلام بنا ڈالا' تو اس مفروضہ کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ دین اسلام کے تسلسل کا رشتہ ٹوٹ گیا' اور یہ بعد والوں کے لئے اللہ کی حجت نہ رہا' یہ نکتہ ہم پر واضح ہے تاہم اس کی تائید کے لئے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی شہادت پیش کی جاتی ہے' شاہ صاحب نوراللہ مرقدہ آیت "هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله" پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> این آیت حکم است درمیان اہل سنت واہل بدعت' خدائے تعالیٰ ہدی ودین حق را بر آنحضرۃ صلی اللہ علیہ وسلم نازل فرمود' ووے

صلی اللہ علیہ وسلم آں را ،صحابہ تبلیغ نمود وصحابہ آں معنی کہ مراد حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بود فہمیدند وبقرن تابعین رسانیدند ثم وثم۔

زیراکہ ارادہ الٰہی نہ محض تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ونہ خروج آنجناب از عہدہ تبلیغ، اگرچہ سامعاں نہ فہمند، بلکہ مراد ظہور دین حق است قرنا بعد قرن۔

پس کسیکہ گوید کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دین حق را ،صحابہ رسانیدند، لیکن ایشاں معنی کہ مراد بود نہ فہمیدند، یا فہمیدند اما غرض نفسانی حامل شد ایشاں را بر کتمان آں، وے مبتدع است۔"

(ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۱۷۵)

ترجمہ :"یہ آیت اہل سنت اور اہل بدعت کے درمیان "فیصلہ کن" ہے، خدا تعالیٰ نے ہدایت اور دین حق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صحابہ کرام تک پہنچایا، اور یہ امانت تابعین تک پہنچائی، اور تابعین نے تبع تابعین تک اور تبلیغ اور فہم کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، (اور بغیر کسی انقطاع کے قیامت تک چلتا رہے گا۔)

اس لئے کہ ارادہ الٰہیہ نہ تو محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی، نہ یہ کہ آپ فریضہ تبلیغ سے سبکدوش ہو جائیں، خواہ سننے والے سمجھیں یا نہ سمجھیں بلکہ مراد الٰہی یہ تھی کہ ہر قرن میں دین حق کے ظہور اور غلبہ کا سلسلہ جاری رہے، لہٰذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین حق صحابہؓ کو پہنچادیا

تھا' لیکن صحابہؓ نے اسے نہیں سمجھا' یا انہوں نے سمجھ لیا تھا لیکن غرض نفسانی کی وجہ سے اسے چھپالیا (یا' اسلامی تاریخ کے کسی دور کے متعلق کوئی شخص دین کو نہ سمجھنے یا ظاہر نہ کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔) وہ بدعتی ہے' (اور اہل ایمان کے راستہ سے ہٹا ہوا ہے۔")

اس سے واضح ہوگیا ہوگا کہ امت مسلمہ کی محفوظیت اور اعتماد کا مسئلہ محفوظیت اسلام کی فرع کو "لا تجتمع امتی علی الضلالۃ" میں بیان فرمایا گیا ہے' (یعنی میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی) گویا جس طرح حرکت اصالۃً کشتی کی صفت ہے' لیکن تبعاً "کشتی نشین" بھی اس سے موصوف ہوتا ہے اسی طرح خطا سے محفوظ ہونا اصالۃً اسلام کی صفت ہے' اور تبعاً اس صفت سے امت مسلمہ مشرف ہے' پس اسلام اور امت مسلمہ کے درمیان رشتہ ملازمت ہے۔

یہاں ایک باریک نکتہ اور بھی قابل توجہ ہے' وہ یہ کہ بعض دفعہ ایک ہی چیز ایک اعتبار سے مقدم ہوتی ہے' اور دوسرے اعتبار سے مؤخر ہوتی ہے' مثلاً سلسلہ انسانیت میں حضرت آدم علیہ السلام جد اول ہیں' لیکن اگر سلسلہ نسب کو بیان کیا جائے تو آدم علیہ السلام کا نام سب سے آخر میں آئے گا۔ (مثلاً زید بن بکر بن عمرو بن محمود الیٰ آخر السلسلہ) یا مثلاً مسئلہ توحید اور مسئلہ رسالت میں سے اول الذکر اپنی ذات کے اعتبار سے مقدم ہے' اور تصدیق کے اعتبار سے مؤخر ہے' جب تک نبی کی تصدیق نہ کی جائے اور اس کی رسالت پر ایمان نہ لائے توحید کی تصدیق ممکن نہیں' اس لئے جب تک ہم تبع تابعین پر اعتماد نہ کریں گے تابعین پر اعتماد بے معنی ہوگا' اور جب تک تابعین پر اعتماد نہ کیا جائے' صحابہؓ پر اعتماد کی کوئی صورت نہیں' اور صحابہؓ پر اعتماد کے بغیر ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد ممکن نہیں' اور آپؐ پر اعتماد کئے بغیر وحی اور فرشتہ وحی پر اعتماد نہیں ہوسکتا اور وحی پر اعتماد کئے بغیر خدا تعالیٰ کی ذات

بابرکات پر اعتماد نہ ہوا' الغرض جس طرح باپ کے واسطہ کے بغیر دادا کی طرف اور دادا کے بغیر پردادا کی طرف سلسلہ نسب میں انتساب غیر معقول ہی نہیں' ناممکن بھی ہے' اسی طرح پچھلی صدی پر اعتماد کئے بغیر پہلی صدی کی طرف زقند لگانے کی حماقت بھی غیر معقول ہوگی' اس سے یہ معلوم ہوا کہ دینی معاملات میں سلف پر اعتماد نہ کرنا' ان کی اغلاط کو اجاگر کرنا اور فرضی تاریخ کی ان پر سنگ باری کرنا الحاد کا اصل سرچشمہ ہے۔

اب تک کی چودہ صدیوں کا باہمی تعلق سلسلہ عدد کا سا سمجھو' سلسلہ اعداد کی ایک کڑی کو غائب کردیا جائے تو سلسلہ کا آگے جاری رکھنا ناممکن ہے' ۲ اور ۴ میں سے ۳ کا عدد گم کردینے کے بعد نہ ۲ سے ۴ تک پہنچا جاسکتا ہے نہ ۴ سے ۲ تک لوٹا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی چودہ صدیوں میں ایک لمحہ بھی اگر ایسا فرض کرلیا جائے جس میں اسلام کو نہیں سمجھا گیا' تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسلامی تاریخ کے اول حصہ و آخر حصہ میں ایسی وسیع خلیج واقع ہوگئی جسے پاٹنا ناممکن ہے' اب فرض کرنا ہوگا کہ نہ اسلام وسیع خلیج کو عبور کرکے آگے بڑھ سکا' نہ بعد کی امت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رابطہ قائم رکھ سکتی ہے' یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اتباع سبیل المومنین پر زور دیا ہے' اور یہی وجہ ہے کہ "خرق اجماع" (اجماع امت کے توڑنے) کو امت مسلمہ کے ہر دور میں فطرت اسلامیہ کے خلاف قرار دیکر "حجیت اجماع" کو ضروریات دین میں شمار کیا گیا ہے' "اجماع امت" کے بارے میں موجودہ دور کے ملاحدہ نے جو مشاغبات اور "ہزلیات" کا طوفان کھڑا کیا ہے' یہ براہ راست ختم نبوت اور اسلامی تاریخ کے خلاف ایک سازش ہے۔

نام نہاد ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے "فتنہ خلق اسلام" کی تمام تر بنیاد امت مسلمہ کو جھٹلانے پر رکھی گئی ہے' اس فتنہ کا اصل منبع یہی ہے کہ امت مسلمہ کی ایک دو صدیاں نہیں بلکہ اس کی پوری تاریخ ہی اسلام کی صحیح فہم وبصیرت سے محروم رہی'

اور چاہا جاتا ہے کہ تمام ضروریات دین اور مسلمات دینیہ کو روند کر فرضی تاریخ کی سیڑھی سے تمام مسائل اسلام کا فرضی "شان نزول" مرتب کیا جائے' پھر اس خود ساختہ شان نزول کو سامنے رکھ کر اسلام کے نئے کل پرزے تیار کئے جائیں۔ اب اجماع امت' امت مسلمہ' عقائد اسلامیہ اور اجماعی مسائل کے بارے میں ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ملاحدہ کے تصورات کا خلاصہ ملاحظہ فرمایئے :

اجماع امت

۱۔۔۔" ہم یہ واضح کرچکے ہیں کہ اجماع کے بارے میں جو احادیث مروی ہیں ان کی تاریخی صحت ناقابل یقین ہے"۔

(فکر و نظر جلد ا ش ۷ ص ۱۷)

۲۔۔۔۔"اگر اس آیت سے (یا قرآن کی کسی دوسری آیت سے۔ ناقل) اجماع کا اصول مستنبط ہو سکتا تھا تو امام شافعیؒ وغیرہ اسے اجماع کی دلیل کے طور پر ضرور پیش کرچکے ہوتے"۔

(فکر و نظر جلد ا ش ۷ ص ۱۸)

۳۔۔۔۔"ایک اجماع کو بعد کا اجماع بدل سکتا ہے"۔ (حوالہ بالا)

۴۔۔۔۔"اجماع ایک رواجی امر ہے' نہ کہ نظریاتی شی' جس میں حق وباطل کی بحث ہوسکے' اجماع درست نادرست یا قدرے درست اور قدرے نادرست ہوسکتا ہے' اس کے حق یا ناحق ہونے کی بحث عبث ہے"۔ (حوالہ بالا)

۵۔۔۔۔"اجماع امت جو مروجہ عقاید کے حامیوں کے یہاں

"فقہی اصل الاصول" ہے' کا تجزیہ کر کے معلوم کیا جائے کہ آیا اپنی موجودہ شکل میں یہ اصل الاصول شرک کے خطرہ سے کافی طور پر محفوظ ہے یا نہیں؟ اگر محفوظ نہیں ہے تو امت کے بری عن الخطا ہونے کے عقیدہ پر مزید کون سی تحدید عائد کی جائے"۔

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۹ ص ۲۶)

۶۔۔۔۔ " اسلامی قانون اور فقہ کی تعبیر و ترجمانی کے کام میں امت کی کلیت کو بحیثیت مجموعی اس کے کسی دوسرے گروہ یا طبقہ پر جس میں "ماہرین" بھی شامل ہیں' تفوق اور برتری حاصل ہے"۔

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۹ ص ۲۷)

۷۔۔۔۔ " تلخ تجربات کی بنا پر ہمیں معلوم ہے علم اور راست کرداری ہمیشہ ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں' نہ ان میں سے کوئی صفت دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہے"۔ (للذا فرض کرنا چاہئے کہ اہل علم چونکہ راست کرداری سے خالی ہوتے ہیں اس لئے ملاحدہ مغرب کے شاگردان عزیز کو قانون فقہ کی تعبیر و ترجمانی کا حق ملنا چاہئے۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۹ ص ۲۸)

۸۔۔۔۔ "قرآن و سنت کے ان احکام کے فہم کی صلاحیت کا معیار کیا ہے؟ اسے متعین کرنے کے لئے محض بعض مدرسوں کی سندوں کو معیار قرار دینے پر مسلمان نہ اب تک متفق ہوئے

ہیں نہ آئندہ ہوں گے"۔ (لیکن ادارہ تحقیقات کے ڈاکٹروں اور مفکروں کی بھیڑ جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مغرب کے کاسہ لیس ہیں' ان پر تمام مسلمان شاید متفق ہو چکے ہیں اسی لئے "قانون کی جامع کتاب" مرتب کی جارہی ہے۔ناقل)۔

(حوالہ بالا)

۹۔۔۔۔۔"قرآن کی وہ آیت اور حدیث جس پر اجماع کا عقیدہ مبنی ہے' دونوں کا تعلق تمام امت مسلمہ سے من حیث الکل ہے' کسی خاص گروہ یا طبقہ سے ہرگز نہیں اور ان کی رو سے نہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کے فہم کی سند اور اس کا اختیار امت مسلمہ کو من حیث الکل مل جاتا ہے بلکہ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قرآن و سنت کی تعبیر و تاویل کا اہل کون ہے' اور کون نہیں' اس کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک انتخابی بنیاد مستنبط کی جائے' امت مسلمہ فوراً" اس امر کا انتخاب کے ذریعہ فیصلہ کرے کہ اس فقہی تعبیر کے اہل کون ہیں' تب ہی اہل رائے کے اجماع کے عامتہ المسلمین کے ساتھ ارتباط کا کوئی ٹھوس اور قابل عمل حل نکل سکے گا"۔

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۹ ص ۳۹)

۱۰۔۔۔۔۔"اسلامی طریق انتخاب کی بنیاد مسجد پر ہے جو مسلمانوں کا ابتدائی اور اعلیٰ ترین انتخابی حلقہ ہے' جس میں اشخاص کی سیرت و کردار کی جانچ پڑتال ہوتی ہے' اور اسلامی علم پر زور دیا جاتا ہے"۔

(حوالہ بالا)

(۷)
اہل حق سلف صالحین

۱۔۔۔شدید تفکر و تعمق

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دار فانی سے تشریف لے جانے کے تقریباً ایک سو سال بعد، اس اخلاقی عملی رجحان کی جگہ شدید تفکر و تعمق نے لے لی۔ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی کیونکہ ہر مذہب پر ایسا دور آتا ہے، جب کہ اس کا عالمی نظریہ اس کے ماننے والوں کے صرف اعمال میں متضمن نہیں رہتا بلکہ ان کی بنیاد پر عقائد کی تشکیل بھی ہوتی ہے"۔ (گویا جو کچھ ہر مذہب پر گزری وہی کچھ اسلام پر بھی گزری۔ناقل)۔

(فکر و نظر جلد ا ش ۱۰ ص ۸)

۲۔۔۔غلو اور تشدد

"لیکن افسوسناک بات یہ ہوئی کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری کے دوران اسلام کے فکری ارتقاء میں ایک مقام ایسا آگیا جہاں معتزلہ اور ان کے مخالفین (اہل سنت۔ ناقل) دونوں فریقوں نے اپنی اپنی جگہ تجاذب اور تناؤ کے اس اصول کو یکسر فراموش کر دیا جس پر اخلاق کی عمارت کے قیام کا انحصار ہے اور جس کی قرآن نے بہ تاکید تعلیم دی ہے ان دونوں نے

اس تجاذب اور تناؤ کے ایک ہی سرے پر سارا زور صرف کیا ..... لیکن ان مخالفین معتزلہ نے بھی صرف ایک ہی سرے پر سارا زور صرف کیا اور وہ تھا مشیت وقدرت الٰہی کا سرا۔ انہوں نے اس معاملے میں اس قدر غلو اور تشدد سے کام لیا کہ یہ بھی اپنے عقائد کے ہاتھوں گویا خود ہی گروی ہو گئے' اور امتداد زمانہ کے ساتھ انہوں نے جبریت کو روایتی عقائد کا جزو لاینفک بنادیا"۔

((فکر و نظر جلد ا ش ۱۰ ص ۸)

۳۔۔۔۔۔راہ اعتدال سے ہٹ کر

" اس یک طرفہ جھکاؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی نظام کی طرح اخلاقی اصول کے بارے میں بھی اہل سنت والجماعت کو راہ اعتدال چھوڑ کر انتہا پسندانہ موقف اختیار کرنا پڑا"۔

(حوالہ بالا ص ۹)

۴۔۔۔ اہل سنت کا مقصد وجود

"بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا' کہ اہل سنت والجماعت وجود میں آئے ہی اس مقصد کو لے کر کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور انسان کی بیچارگی محض کو جزو عقیدہ بنا کر رہیں گے"۔

(حوالہ بالا)

۵۔۔۔۔بدقسمتی سے شریعت کے پاسبان

"لیکن جب اسلام کا پہلا توسیعی دور ختم ہوا تو بدقسمتی سے شریعت کی پاسبانی ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئی جنہوں نے

اسلام کے بنیادی' اور مثبت رخ سے بالکل بے اعتنائی برتی"۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۹۱)

۶۔۔۔۔۔مسلمانوں کا قانونی نظام

"ان کے قانونی نظام میں صرف تعزیریں اور پابندیاں ہی نظر آتی ہیں' ان میں حیات آفرینی کا کہیں پتہ نہیں چلتا"۔

(حوالہ بالا)

۷۔۔۔۔۔مسلمانوں کا نظام عقائد

"یہ حقیقت کہ اہل سنت والجماعت نے اپنے عقیدہ میں بعض عناصر دائیں بازو اور بعض بائیں بازو سے لے کر داخل کرلئے ہیں' صرف محولہ بالا حدیث تک محدود نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ امتزاج واعتدال کی یہ حکمت عملی ہی اہل سنت والجماعت کا اصل الاصول ہے۔"

(فکر و نظر جلد ا ش ۶ ص ۴۱)

درمیانی راستہ (صراط مستقیم) پر چلنے والی اکثریت (سواد اعظم) کا یہ تصور اگرچہ اپنے ابتدائی مرحلہ میں سیاسی تقاضہ کی پیداوار تھا' لیکن جب سیاسی دھڑے بندیوں کو عقائد' فقہ اور اخلاق کی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش ہونے لگی تو اس تصور نے دینی عقیدہ اور فقہی مسلک کی شکل اختیار کرلی"۔ (حوالہ بالا)

۸۔۔۔۔۔مسلمانوں کا سیاسی نظام

"(اطاعت امیر کی احادیث کا ذکر کرنے کے بعد) لیکن

جب یہ جذبہ (اطاعت امیر) ایک عقیدہ بن گیا' اور یہ فرض کرلیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے اس کی تائید ہوتی ہے' تو یہ عقیدہ تسنن کی عمارت کا ستون بن گیا' اور سنی مسلمان ہمیشہ کے لئے حزب اقتدار کے حامی ہو کر رہ گئے' خواہ اقتدار کیسے ہی ہاتھوں میں کیوں نہ ہو"۔

(جلد ۱ ش ۹ ص ۱۰)

۹ــــــ مسلمانوں کی ابن الوقتی

"بہ ایں ہمہ اگر خالص سیاسی اطاعت وانقیاد کے عقیدہ کو بعض دوسرے قوی اخلاقی اور روحانی عوامل سے تائید نہ ملتی تو یہ عقیدہ کھلی سیاسی ابن الوقتی نہ بن جاتا' لیکن بدقسمتی سے بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عقیدہ کی بنا پر نہ صرف سیاسی بلکہ اخلاقی بے عملی کی تلقین ہونے لگی ـــ لیکن بایں ہمہ یہ ایک حقیقت رہی ہے' اور تاریخ اسلام کی اب بھی یہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ ایک طرف سیاسی اطاعت پذیری کے جذبے کو عمداً" پروان چڑھایا گیا' دوسری طرف عام اخلاقی بے عملی اور بے حسی کو فروغ دیا گیا' اور ان دونوں اسباب کے اجتماع سے نہ صرف یہ کہ سیاسی ابن الوقتی کے مواقع فراہم ہوئے بلکہ ایسا نظر آنے لگا کہ یہی عقیدہ راسخ ہے' اور اسی میں نہ صرف دنیوی بلکہ اخروی سلامتی کی ضمانت بھی ہے۔"

(حوالہ بالا ص ۱۰۔ ۱۱)

۱۰۔۔۔۔ مسلمانوں کا جامد فکری نظام

"سچ تو یہ ہے، کہ اسلام کی مذہبی تاریخ کی ایک بہت نمایاں حقیقت جسے اسلامی معاشرہ کے حقیقی احیا کا متمنی کوئی مسلمان نظر انداز نہیں کر سکتا۔۔۔۔ یہ ہے کہ اسلام ہمیشہ نہ صرف سیاسی لحاظ سے بلکہ عقائد اور اخلاق کے لحاظ سے بھی انتہا پسندانہ نظریات کا شکار رہا ہے اہل سنت والجماعت اعتدال، مصالحت اور تطبیق کے نام پر ہی وجود میں آئے تھے۔۔۔۔۔۔ لیکن جب ان کا فکری نظام پورے طور پر مرتب ہو گیا، تو یہ خود جامد، جابر، اور جارحانہ ذہنیت کے مالک بن گئے، اور اعتدال و تطبیق اور جذب و انجذاب کی بجائے خود تحزب کا شکار ہو گئے۔

(حوالہ بالا ص ۱۲)

۱۱۔۔۔۔ مردہ کا ورثہ

" راسخ العقیدہ گروہ کا نظام تعلیم اور ان کا نظام فکر محض مردہ کا ورثہ بن گیا، ان میں زندگی کی حرارت باقی نہیں رہی"۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۳)

۱۲۔۔۔۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم

" قرون اولیٰ (بشمول دور نبویؐ دور صحابہؓ۔ناقل) میں راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اعلیٰ تعلیم کا کوئی باقاعدہ نظام نہیں ترتیب دیا۔ (میک گل یونیورسٹی نہیں کھولی۔ ناقل) ان کی درس گاہیں محض ابتدائی درجہ کی تھیں، جن میں بچوں کو قرآن

مجید نوشت و خواند اور ساتھ ہی ساتھ اکثر حساب کی مبادیات کی تعلیم دی جاتی تھی، اعلیٰ تعلیم کا محور اس زمانہ میں درس گاہیں نہیں بلکہ ذی علم شخصیتیں تھیں، طالب علم ایک مشہور ومعروف شیخ سے کسب فیض کرکے دوسرے شیخ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے اور ان سے سندیں حاصل کرتے تھے، سارے کے سارے درسی مضامین روایتی نوعیت کے ہوتے تھے، تنظیم کے فقدان کی وجہ سے ابتدائی مدارج سے اعلیٰ مدارج تک طالب علموں کے پہنچنے کا کوئی انتظام نہ تھا، یہ دونوں مدارج بالکل جداگانہ تھے، بلکہ انہیں مدارج کہنا بھی درست نہیں کیونکہ درجہ بندی کا اس وقت کوئی تصور نہ تھا"۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۲)

۱۳۔۔۔۔۔ مسلمانوں کے "مدارس"

"مدرسہ ہی وہ جگہ تھی جہاں عالم اسلام کے مفکر تیار کئے جاسکتے تھے، لیکن یہاں تو یہ مضمون تھا کہ :

مری تعمیر میں مضمر ہے صورت اک خرابی کی

چنانچہ عالم اسلام میں مدرسوں کی باقاعدہ تشکیل کے ساتھ ہی فکر خالص کا اخراج عمل میں آیا"۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۱ ص ۱۹)

۱۴۔۔۔۔۔ علمائے اسلام کی مثال

"سارا زور علوم یا ان کے موضوعات کی تحصیل پر

نہیں، بلکہ کتابوں کی تدریس پر صرف کیا جاتا تھا، مثلاً طالب علم فقہ کی تعلیم حاصل نہیں کرتا تھا وہ تو کنز الدقائق یا ہدایہ کا درس لیتا تھا، وہ تفسیر کا علم حاصل نہیں کرتا تھا بلکہ جلالین یا بیضاوی پڑھتا تھا، بلکہ ان کا "دورہ" کرتا تھا، اس تعلیمی نظام کے پیدا کردہ ماحول کی ذہنی سطح کے لئے یہ طریقہ تعلیم حسب حال ضرور تھا، لیکن اس سے علوم کے سمجھنے، ان کی تنقید اور تجزیہ کرنے کی صلاحیتیں نہیں ابھر سکتیں ہیں، بلکہ اس سے تو محض چند کتابوں کے رٹ لینے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، جس کی مذمت کرتے ہوئے قرآن نے "یحمل اسفارا" (چند موٹی کتابوں کے ڈھوئے پھرنے) کا بلیغ طنز استعمال کیا ہے"۔ (جلد ۲ ش ۳ ص ۱۶۰)

۱۵ ـــــ علمائے امت کی انسانیت سے روگردانی

"اگر فارابی اور ابن سینا نے بعض مسائل میں کلامی عقاید سے انحراف کیا ـــــ تو دوسری طرف غزالی اور ان کے بعد آنے والے تمام علمبرداران راسخ العقیدگی نے سارے فلسفہ اور فلسفہ کے آلہ لازمی یعنی عقل انسانی کی مذمت کرکے تمام انسانیت سے روگردانی کی"۔ (ملخصاً)
(ج ۲، ش ۱، ص ۱۸)

۱۶ ـــــ امام غزالیؒ، شاطبی، ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی اور تمام مشاہیر اسلام کی خودکشی

"امام غزالی، شاطبی، امام ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی، اور

تمام مشاہیر اسلام جن جن کی مہریں فلسفہ کے خلاف فتویٰ پر لگی ہوئی ہیں، ان کی فلسفہ پر تنقید برحق، لیکن جب مسئلہ عقائد کے حامیوں نے پشت در پشت اور پے درپے انسانی عقل کو ہی ساقط الاعتبار قرار دیا تو یہ انتہاپسندانہ اور چوطرفہ حملہ نہ صرف غیر صحت مندانہ بلکہ خودکشی کے مترادف تھا"۔

(ملخصاً" فکر ونظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۵)

۱۷۔۔۔ امام شافعیؒ کا اسلام پر ظلم

"امام شافعیؒ کی روشن دماغی اور تیز طبعی نے ایک ایسا مشینی نظام پیدا کردیا جس سے اسلام زندہ طاقت اور اپنی تقدیر کا خود مالک کی حیثیت میں نہیں رہا، بلکہ ایک اثر پذیر وجود کی حیثیت سے زندگی کے تھپیڑوں کی نذر ہوگیا"۔

(فکر ونظر جلد ا ش ا ص ۳۰)

۱۸۔۔۔ امام ابو یوسفؒ

"امام ابو یوسف کا ائمہ فقہا کی نسبت تصور یہ تھا کہ وہ سنت نبوی کی توسیع اور زندہ سنت کی تحقیق کرنے کا کام سرانجام دے رہے ہیں"۔ (سبحانک ھذا بہتان عظیم۔ ناقل)۔

(فکر ونظر جلد ا ش ۳ ص ۱۶)

۱۹۔۔۔ امام مالکؒ

"امام مالکؒ تعامل اہل مدینہ کی تائید میں حدیث ضرور

پیش کرتے ہیں، جو ضروری نہیں کہ مرفوع ہو، لیکن (یعنی محض رسوم ورواج) کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں"۔ (یہ وہی امام مالک ہیں جو مزار نبوی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کرتے تھے :

"کل منا راد ومردود الا صاحب هذا القبر صلى الله عليه وسلم۔" ہم میں سے ہر ایک کی بات رد کی جاسکتی ہے مگر یہ صاحب قبر صلی اللہ علیہ وسلم اس اصول سے مستثنیٰ ہیں، آپؐ کے کسی ارشاد کو رد نہیں کیا جاسکتا، اندریں صورت امام مالک پر اس سنگین افترا کے بارے میں اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا۔ان يقولون الا كذبا۔ یہ لوگ محض جھوٹ کہتے ہیں۔")

(ج ا ش ۳، ۴، ص ۱۶)

۲۰۔۔۔۔۔محدثین کا تعصب اور ان کی غلط بیانی

" محدثین کے واضح تعصب کی مثال محمد بن اسحاق کی تضعیف ہے، اور ان کے جھوٹ کی دلیل امام مالکؒ سے محمد بن اسحاق کی عدم ثقاہت کی فرضی نقل ہے"۔

(ملخصاً" (جلد ا ش ۷ ص ۲۲)

۲۱۔۔۔۔۔سنہ ۱۴۰ھ سے پہلے

" فقہا کی رائے یا سوچی سمجھی رائے کے انتشار اور ناقابل اختتام تضاد آرا کی بنیاد پر ابن المقفع (متوفی سنہ ۱۴۰ھ) نے یہ اعلان کردیا کہ آنحضرتؐ کی کوئی متفق علیہ سنت (امت کے پاس) نہیں ہے، اور خلیفہ کو اپنے اجتہاد کو عمل میں لانے کا

مشورہ دیا' (ابن المقفع کون تھا؟ جس کے ایک ہی حوالہ کو ادارہ تحقیقات کے ڈاکٹر نے وحی الٰہی سمجھ کر بار بار اسے ذکر کیا ہے؟ نیز جب بخاری جیسی متواتر کتاب ادارہ تحقیقات کی تحقیقاتی عدالت میں کتر بیونت' رد وبدل اور تحریف وتبدیل سے پاک ثابت نہیں ہوتی تو ابن المقفع کا مجہول رسالہ "فی الصحابہ" کی قطعیت کی شان کیونکر پیدا ہو گئی۔؟ —

(فکر ونظر جلد ا ش ا ص ۲۱)

۲۲ — علماء امت پر تحقیقاتی ادارہ کے سبّ و شتم کا ایک "ٹکسالی نمونہ":

"۔(حافظ ابن حجرؒ کی ایک عبارت نقل کرنے کے بعد' ناقل) "چور کی گواہی گرہ کٹ کی طرف سے" اسی کو کہتے ہیں"۔

(فکر ونظر جلد ا ش ۱۲ ص ۶۸)

(الحق شعبان' رمضان' شوال' ذوالقعدہ ۱۳۸۶ھ)

۸۔ عقاید اسلامیہ اور مسائل اجماعیہ

۱۔۔۔۔۔فقہ وعقاید کے اعتبار سے شریعت اسلامیہ کا المیہ:

اب ان اسلامی عقاید اور اجماعی مسائل پر غور فرمایا جائے جن کو ادارہ تحقیقات نے بگاڑا ہے۔۔۔۔

"ہم نے اب تک جتنی مثالوں کا انتخاب کیا ہے وہ قانونی و اجتماعی معاملات کی ہیں۔ لیکن عقاید کا دائرہ بھی ان سے کچھ کم نہیں"۔(گویا مسلمانوں کا نہ صرف یہ کہ نظام قانون' نظام اجتماع' اور نظام معاملات غلط ہے بلکہ نظام عقاید بھی' ناقل)۔

(فکر و نظر جلد ۴ ش ۱ ص ۲۰)

۲۔۔۔۔ اسلامی عقاید اور دور جدید:

"دنیا کے متعلق جدید آدمی کا جو تصور ہے' باوجود ان تمام اختلافات کے جو اس میں پائے جاتے ہیں وہ قرون وسطیٰ کے نقطہ نظر اور روائتی طرز فکر سے مختلف ہے' سند کو مان لینا' اور خوش اعتقادی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور یہ سکہ جدید دنیا میں اب چالو نہیں رہا۔" (مطلب یہ کہ دین اسلام کا مدار نقل اور سند پر

ہے' اور دور جدید کی مسخ شدہ عقلیت کو سند کے مان لینے سے خوش اعتقادی کا جن چھو جاتا ہے' اس لئے اسلام دور جدید کے لائق شان نہیں رہا' یہ ہے اصل تحقیق اسلامی)۔ ناقل۔

(حوالہ بالا ص ۲۱)

۳۔۔۔۔ معراج نبوی:

" معراج نبوی جو متواترات دین سے ہے' کے بارے میں فرمایا جاتا ہے یہ ایسی توہمات پرستی کی جس کا قرآن مجید سے کوئی ثبوت نہیں ملتا ایک مثال ہے۔"

(حوالہ بالا)

۴۔۔۔۔ معجزات نبوی:

" سب دنیا جانتی ہے کہ معجزہ صداقت نبوت کی برہان ہوتا ہے' خود قرآن مجید میں بیسیوں معجزات اور آیات بینات کا ذکر موجود ہے' جو انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے۔ لیکن تحقیقاتی ادارہ کے ڈاکٹر صاحبان کا فتویٰ یہ ہے کہ "غرض قرآن مجید کی واضح تعلیمات کے برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کثیر التعداد معجزات منسوب کر کے آپ میں ایک حد تک شان ایزدی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔"

(حوالہ بالا)

۵۔۔۔۔ مسئلہ شفاعت:

" اسی طرح مسلمانوں کے ہاں شفاعت کے مشہور عام عقیدہ نے جو شکل اختیار کی وہ عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ کا جواب تھا۔"

(گویا مسلمانوں کے عقاید کافروں سے اخذ کردہ ہیں)۔ ناقل۔

(حوالہ بالا)

۶۔۔۔ مسئلہ کرامت:

"جب آپ سند کو مانتے ہیں تو اس کا نتیجہ لازما خوش اعتقادی ہوتا ہے اور خوش اعتقادی ہی اصل مورث ہے ہر قسم کے جادو، ٹوٹکے پر یقین کرنے، کرامات پر زور دینے اور بھونڈی شکل میں روحانی شعبدہ بازی کی"۔

(حوالہ بالا)

۷۔۔۔ اسلام کا نبیؐ اساطیری رنگ میں :

" نبی علیہ الصلوۃ والسلام کو ایک اساطیری رنگ میں پیش کرنے کا یہ عمل، جس کا مصدر و منبع ایک سے زیادہ عناصر تھے، راسخ العقیدہ گروہ بھی برابر اس میں شریک رہا اور اسے اس نے قبول کیا"

(حوالہ بالا)

۸۔۔۔ عقیدہ نزول عیسیٰ علیہ السلام :

"یہ عقیدہ عیسائیت سے مستعار لیا گیا تھا اور کچھ عرصہ بعد اہل سنت والجماعت کے عقاید کا جزو بن گیا"

(فکر و نظر ج۱ ش ۱۲ ص۱۱)

۹۔۔۔ آمد مہدی علیہ السلام :

" اس کی دوسری شکل وہ تھی جس نے شیعی حلقوں میں جنم لیا، اور شروع کے صوفیا کی کوششوں سے اہل سنت والجماعت کے

عقاید میں جگہ پائی' یہ تھا مہدویت کا عقیدہ۔"

(حوالہ بالا)

۱۰۔۔۔ ایمان و عمل کا عقیدہ :

(اہل سنت کا یہ عقیدہ کہ آدمی جب تک ضروریات دین کا قائل ہو صرف گناہ کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا)۔" یہ ایک انتہاء پسندانہ اقدام تھا بالآخر یہ اخلاقی لحاظ سے یہ خودکشی کا سا فعل ثابت ہوا یہ عقیدہ مسیحی عقیدہ استحقاق نجات بہ ایمان کا عین مین چربہ بن گیا۔"

(جلد ا ش ۱۰ ص ۹)

۱۱۔۔۔ نماز' روزہ دیگر احکام قدامت پرستی کے اطوار :

" جب شریعت کے پاسبانوں نے معاشرتی اور اقتصادی پہلو کو نظر انداز کر دیا تو نماز روزہ اور دیگر احکامات جو روحانی اور اخلاقی اقدار پیدا کرنے کے لئے تھے محض قدامت پرستی کے رسمی اطوار میں بدل گئے"۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۹۱)

۱۲۔۔۔ ارکان اسلام کا استہزاء :

" اسلام کے پانچ ستون گنائے گئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے لئے فرش کون سا ہے' دیوار کونسی ہو گی' اور چھت کونسی ہوگی یہ سوالات نہ تو پوچھے جاتے ہیں' نہ ان کا کوئی جواب دیتا ہے' دیوار' فرش اور چھت کا ذکر سننے ہی میں نہیں آتا' جب سنتے ہیں

صرف "ستون" ہی کا نام سنتے ہیں۔" ملخصاً

(حوالہ بالا)

۱۳۔۔۔۔۔ زکوٰۃ ٹیکس ہے :

"اس کا نام بدلنا ضروری ہے، ورنہ سیکولزم کا خطرہ ہے۔"

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۴ ص ۱۲۵ و جلد ۴ ش ۱ ص ۱۷)

۱۴۔۔۔۔۔ سود حلال ہے :

"قرآن کے زمانہ نزول میں صرف وہی جاہلی سود رائج تھا کہ جس سے رأس المال کی مقدار دوچند سہ چند بڑھ جاتی تھی، اس چند درچند سود کے عمل کی وجہ سے ربوا کو حرام کر دیا، ورنہ "مفرد سود" کو حرام نہیں کیا۔ گویا ۱۰۰ روپے پر اگر ننانوے روپے ننانوے پیسے سود لے لیا جائے تو مضائقہ نہیں کیونکہ "دوچند" نہیں، البتہ اگر اس پر ایک نئے پیسے کا اضافہ کر لیا گیا تو چونکہ یہ دوچند ہو گیا اس لئے ایسا کرنے والے کو خدا اور رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔)

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۵ ص ۵۷)

۱۵۔۔۔۔۔ شراب حلال ہے :

ادارہ کے سربراہ کا مشاورتی کونسل سے اختلافی نوٹ ملاحظہ کیجئے۔

۱۶۔۔۔۔۔ شراب کے بارے میں صحابہ کی غلطی :

" خمر کے بارے میں تو قرآن کا واضح حکم نازل ہو گیا، لیکن

دوسرے مشروبات کے بارے میں قطعی فیصلہ نہیں ہوا' چنانچہ بعض صحابہ (؟) نے خود ہی قیاس کرتے ہوئے دوسرے مشروبات بھی لنڈھا دیئے' ان میں "الفضیخ" قابل ذکر ہے۔" (صحابہؓ کی "قیاس آرائی" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکیر نہ فرمانا قابل غور ہے)۔ناقل۔

(جلد ۴ ش ۱ ص ۷۲)

۱۷۔ اگر حکومت سودی کاروبار کی متولی ہو تو وہ ہر طرح جائز ہو جائے گا :

"اگر حکومت تجارتی سود کا تمام نظام اپنے ہاتھوں میں لے لے تو میرے خیال میں اس کے جواز کی گنجائش موجود ہے' کیونکہ فقہ کا اصول ہے "لاربوابین المولی وعبدہ" آقا اور غلام کے درمیان سود جائز ہے۔ حکومت اور رعیت کے تعلق کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ (لیجئے دوچند سہ چند کا فلسفہ بھی دھرا رہ گیا' حکومت اس مقدس کاروبار کو خود کرنے لگے تو بلا کسی شرط اور قید کے جواز کی گنجائش نکل آئی' پھر فقہی عبارت کے ترجمہ اور اس پر "قیاسی عمارت" کا جو تحقیقی شاہکار پیش فرمایا ہے کون کافر ہوگا جو اس کی داد دیئے بغیر رہے۔ ایں چنیں "ارکان دولت" ملک را ویراں کنند ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ۴ ش ۱ ص ۵۷)

۱۸۔ صغرسنی کی شادیاں ناجائز :

"قرآن کی نص صریح نکاح کے لئے بلوغ کو شرط قرار دیتی

ہے' اس لئے اس کے جواز پر اتفاق کنندگان کو تحریف قرآن بلکہ تحریف سے بھی کچھ زیادہ سخت جرم کے مجرم قرار دینا چاہئے۔" ملخصاً (یہ مجرم صحابہ کرام سے لے کر اب تک کے تمام علمائے امت ہیں باستثنائے بعض اقوال شاذہ' بعید نہیں کہ فردجرم عائد کرنے والے کے بعض آباواجداد نے بھی کسی وقت اس ناجائز فعل کی غلطی جائز سمجھ کر کرلی ہو' اس صورت میں کیا کچھ نسبی الجھن پیدا ہو سکتی ہے؟ ناقل۔)

(فکرو نظر جلد ا ش ۷۔۸ ص ۴۲)

۱۹۔۔۔۔۔صغرسنی کے نکاح کا جواز :

"چونکہ تدوین فقہ کے دور میں بیشتر علمی سندوں پر عجمی علماء اور ائمہ قابض ہو چکے تھے' اور چونکہ ان کے اذہان اس عجمیت کی وجہ سے وراثتی طور پر صغرسنی کی شادیوں سے مانوس تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی جرح و تنقید کئے بغیر اس حماقت کے جواز کا فتویٰ صادر فرمادیا' ورنہ اگر وہ جرح و تنقید فرماتے تو کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اس تک ان کی رسائی نہ ہو سکتی۔" ملخصاً (یہ بھونڈی منطق ائمہ اربعہ میں سے امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں فرضاً جاری کرلیجئے لیکن امام مالکؒ' امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں کیا منطق ہوگی؟ ناقل۔)

(فکرو نظر جلد ا ش ۷۔۸ ص ۴۹۔۵۲)

۲۰۔۔۔۔۔مسئلہ تعدد ازواج :

"قرآن حکیم نے چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت دے دی

ہے۔ اور (ساتھ ہی) یہ ارشاد فرمایا ہے کہ عام حالات میں الف۔ ایک مرد کے لئے ایک ہی بیوی کا ہونا ہی مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر چونکہ عرب معاشرے میں تعد د ازواج کی جڑیں گہری تھیں' اس لئے اس وقت کے معاشرے کے ساتھ مصالحت کرنے کے لئے قرآن نے قانونی سطح پر تعداد ازواج کو ممکن حد تک تحدید اور پابندیوں کے ساتھ قبول کر لیا اور یہ صراحت بھی کر دی کہ مثالی اخلاقی معاشرہ وہ ہے جس میں ایک مرد کی ایک ہی بیوی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آرزو تھی کہ مسلمان اس معاشرے کو تدریجاً اپنائیں گے' بہرحال تاریخی لحاظ سے ہوا اس کے برعکس (کیونکہ) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد وسیع پیانے پر مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئیں' جن کے نتیجہ میں مسلم معاشرے میں بہت بھاری تعداد میں باہر سے عورتیں اور لونڈیاں آئیں' اور یہ چیز اس معاملے میں قرآن مجید کے اصل مقصد کے لئے رکاوٹ بن گئی"۔

(حاصل یہ کہ اسلام کی پوری تاریخ میں بشمول دور نبوی نہ ادارہ تحقیقات کا فرضی مثالی اخلاقی معاشرہ کبھی قائم ہوا' نہ تمنائے نبوی بر آئی' نہ قرآن کا اصل مقصد کبھی پورا ہوا' بلکہ اسلامی فتوحات اس کے لئے رکاوٹ بنتی چلی گئیں' اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ۴ ش ا ص ۲۰)

ب۔۔۔۔ "سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اب تک کے تمام اکابر و اسلاف نے چودہ سو سال

تک متواتر تعدد ازواج پر عمل کیا' لیکن کسی نے اسے سنت تو نہیں کہا' تو آج ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ان حضرات کے علی الرغم اسے سنت قرار دیں۔ (واقعی اس بدیع نکتہ تک کسی کا ذہن پہنچا ہی نہیں' ورنہ اس "تحقیق اسلامی" کے بعد کسی کے لئے مجال دم زدن رہ سکتی ہے؟ ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ا ش ۱۱ ص ۱۴)

ج ـــــ "تعدد ازواج کے لئے لغت کی جنتری میں کوئی گنجائش نہیں۔"

(حوالہ بالا ص ۱۶)

د ـــــ تعدد ازواج قانون تخلیق کے منافی ہے (ص ۱۸)

ہ ـــــ یہ مشہور بات کہ اسلام عام حالات میں تعدد ازواج کا حامی ہے' ایک ایسی تہمت ہے جس کا قرآن حکیم متحمل نہیں۔ (فکر و نظر جلد ا ش ۱۲ ص ۲۰) (لیکن اس کا کیا علاج ہے' کہ یہ فرضی تہمت خود قرآن کی قانونی سطح اور تاریخ اسلام کے تسلسل نے لگائی جیسا کہ اقتباس (الف) میں اس کا اقرار خود تحقیقاتی ادارہ کے تہمت تراشوں نے بھی فرمالیا ہے' ایں گنا ہیست کہ در شہر شمانیز شود)۔

ز ـــــ واقعہ یہ ہے کہ تعدد ازواج کا مفہوم آیت مثنیٰ و ثلث و رباع سے جن حضرات نے اخذ کیا' (اور وہ پوری امت ہے) اس میں ان کا کوئی قصور نہیں' قصور اس اصول شکنی کا ہے' جو اس سلسلہ میں سرزد ہو گئی ہے۔ (پس بیچارے مفسرین اور تمام علماء امت جو نہ تو اس اصول کو سمجھ پائے جس کا لحاظ یہاں ضروری تھا' نہ انہیں اتنی عقل آئی کہ یہاں کوئی اصول ٹوٹ تو نہیں رہا۔ وہ تو بلاشبہ بے قصور ہیں۔ البتہ اصول شکنی کو تختہ دار پر کھینچنا چاہیے' کہ

وہ آپ سے آپ اس آیت میں کیوں گھس آئی۔ ناقل۔)

(فکرو نظر جلد ا ش ۱۲ ص ۳۴)

۲۱۔۔۔۔۔مسئلہ طلاق :

"قرآن کریم کی رو سے طلاقیں صرف تین مرتبہ الگ الگ وقفہ کے ساتھ ہو سکتی ہیں۔ اور ایک عدت کے شروع میں ایک طلاق ہو سکتی ہے۔"

(فکرو نظر جلد ۲ ش، ص ۲۲۴)

ب۔۔۔۔"قرآن کریم کی رو سے کئی کئی طلاقیں (دو یا تین) ایک وقت میں نہیں دی جاسکتیں، اور نہ مختصر وقفوں کے ساتھ ہی (ایک ایک طہر میں ایک ایک طلاق کر کے) دی جاسکتی ہے، یہ صورت (جس کے اکثر ائمہ دین، صحابہؓ و تابعین قائل ہیں ادارہ تحقیقات کے بقول) قرآنی حکم کو پامال کرنے اور اس کے استخفاف اور استہزا پر مشتمل ہے۔"

(فکرو نظر جلد ۲ ش، ص ۲۲۴)

ج۔۔۔۔"تمام صحابہ و تابعین اور ائمہ فقہا نے بالاتفاق (سوائے امام شافعیؒ) بیک وقت دو تین طلاقیں دینے کو حرام، ممنوع اور ناجائز کہا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی اکثریت قائل ہے کہ باوجود حرام، ممنوع، اور ناجائز ہونے کے اگر کوئی شخص ایسی حماقت کر بیٹھے تو تین طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں اور بیوی مغلظہ طور پر اس کے لئے حرام ہو جاتی ہے۔"

(جلد ۲ ش، ص ۲۲۵)

د۔۔۔۔اکثریت کا یہ فیصلہ کیوں ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

سے ایسا کوئی فیصلہ ثابت نہیں' اس سلسلہ کی تمام روایات ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔ البتہ خلیفہ راشد حضرت عمرؓ سے یہ فیصلہ ثابت ہے لیکن ان کا یہ فیصلہ (جو ادارہ تحقیقات کی نظر میں قرآنی روح کو پامال کرنے اور اس کے استخفاف و استہزاء پر مشتمل ہے) وقتی ضرورت اور ہنگامی مصلحت کے ماتحت تھا' اور صحابہؓ تابعین اور ائمہ فقہاء کی اکثریت کا فیصلہ دراصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کے ماتحت تھا' چونکہ وہ ضرورت اور مصلحت اب باقی نہیں رہی۔ اس لئے ہمیں شریعت اسلامی کے اصل حکم کی طرف لوٹنا چاہئے۔" (اور حضرت عمر' صحابہ تابعین اور ائمہ فقہا کی اکثریت کے فیصلہ پر عمل کر کے قرآنی روح کو پامال کرنے اور اس کے استخفاف و استہزاء کی مزید غلطی نہیں کرنی چاہئے' بلکہ اس بارے میں اقوال شاذہ کو لے کر مسلم فیملی لاز کی روح کو خوش کرنا چاہئے' اور تین طلاق سے مغلظہ عورتوں کو جو صحابہ' تابعین اور ائمہ فقہاء کی اکثریت کے نزدیک قطعی حرام ہو جاتی ہیں' بدستور ان کے طلاق دینے والوں کے پاس قانوناً ٹھہرا کر حرامکاری کا شرعی جواز ڈھونڈنا چاہئے۔ اور منصوبہ بندی کے طفیل بن باپ کے بچوں کی تعداد میں جو کسر رہ جانے کا اندیشہ ہو اسے یوں پورا کرنا چاہئے۔) ناقل۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۷ ص ۲۲۶)

۲۲۔۔۔۔۔بیٹے کی موجودگی میں پوتے کی میراث :

" بیٹے کی موجودگی میں پوتے کا وارث نہ ہونا اگرچہ اس کے خلاف پوری امت میں سے کسی کا معتد بہ قول منقول نہیں' مگر

چونکہ یہ بھی علم نہیں کہ' اس اجماع کا اعلان۔

الف ـــــ کب اور کس جگہ کیا گیا تھا' اور بعض لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ قرآن و حدیث کی کس "نص" سے مستنبط ہے۔ اس لئے یہ اجماع حجت نہیں بلکہ اسے اسباب تحریف میں شمار کیا جائے گا۔ (اور فرض کیا جائے گا کہ اس مسئلہ کو اپنا کرامت "دینی تحریف" کا فریضہ انجام دیتی رہی' خیرامت اور امت وسط کا یہی مفہوم ہوگا۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۴ ص ۳۰۹۔۳۱۰)

ب ـــــ "واقعہ یہ ہے کہ ہمارا علم و تفقہ اپنی پوری بے مائیگی کے ساتھ اس علم و تفقہ کا پاسنگ بھی نہیں۔ جو ہمارے فقہاء کرام کا حصہ تھا' لیکن وہ حضرات بہرحال انسان تھے' فرشتے اور معصوم نہیں تھے۔" (پوری امت اور امت کے علماء و فقہا گر فرشتے اور معصوم نہ تھے بلکہ انسان ہی تھے تو ان کے اجماعی مسائل کے ٹھکرانے والوں کو وحی ملکیت اور عصمت کا پروانہ کب سے مل گیا' چودہ سو سالہ کروڑوں سلف صالحین کو غلط کار' نافہم' منشائے قرآن و نبوت تک رسائی سے محروم اور تحریف کے مجرم قرار دینے کی نسبت ہمارے لئے مجتہدان عصر حاضر کو نادان فرض کر لینا کیا مشکل ہے۔ ورنہ ومن یتبع غیر سبیل المومنین" کا مصداق کیا ہوگا؟ ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۴ ص ۳۱۱)

ج ـــــ "فقہ کے جب حرمان کا اصول "الاقرب فالاقرب" غلط ہے۔"

(ملخصاً جلد ۳ ش ۴ ص ۳۱۲)

د۔۔۔۔۔"یہ الاقرب فالاقرب کا اصول قرآنی آیت مما ترک الوالدان والاقربون سے مستنبط فرض کیا جاتا ہے۔ لیکن اول تو یہ استنباط صحیح نہیں۔ فقہا کرام اول تو الاقربون کے مفہوم ہی کو نہیں سمجھ پائے' ثانیاً ہمارے فقہاء کرام نے یہ اصول تو مستنبط فرما لیا لیکن اس میں انہوں نے کسی باقاعدگی کا لحاظ نہیں رکھا جہاں جی چاہا اسے نافذ کر دیا اور جہاں ان کا جی چاہا اسے نظرانداز کر دیا۔" (گویا اول تو یہ تمام فقہائے کرام استنباط صحیح کی نعمت سے بے بہرہ تھے' پھر اس کے مواضع استعمال سے بھی ناواقف' بلکہ اس کے نفاذ کا تمام قصہ صرف جہاں جی چاہا کے اصول پر مبنی ہے۔ معاذ اللہ۔ناقل)

(جلد ۳ ش ٦ ص ۴۰۸)

ہ۔۔۔۔۔"لہٰذا ہم نہایت دیانتداری کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یتیم پوتے کی اپنے دادا سے محرومی کسی صحیح بنیاد پر مبنی نہیں۔" (ہمیں کسی کی نہایت دیانتداری پر بحث کا حق نہیں' البتہ یہ ضرور ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کی نہایت دیانتداری تو صرف پوتے کی میراث سے محرومی کو نہیں بلکہ پورے اسلام ہی کو کسی صحیح بنیاد پر مبنی تسلیم نہیں کرتی' بلکہ اسلام کے تمام مجموعہ کو قرون وسطیٰ کی پیداوار تصور کرتی ہے' بعض کی نہایت دیانتداری پورے اسلام کو عجمی سازش کہتی ہے جن میں خود مقالہ نگار بھی شامل ہیں' اب کس کس کی نہایت دیانتداری پر اعتماد کر لیا جائے' کیا ابلیس کی نہایت دیانتداری کی منطق ہی نے ہمیں سب سے پہلے دھوکا نہیں دیا تھا۔؟ وقاسمهما انی لکما لمن الناصحین' فدلٰهما

بغرور)۔ناقل

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۶ ص ۴۱۷)

۲۳۔۔۔۔۔مسئلہ غلامی :

"اور (جو کچھ تعدد ازواج کے اقتباس الف میں بیان ہوا) یہی غلامی کے مسئلہ میں بھی ہوا' جسے قانونی سطح پر تو برداشت کر لیا گیا' لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسا اخلاقی محرک بھی عمل میں لایا گیا کہ اس کی وجہ سے یہ ختم ہو جاتی' اسلامی تاریخ نے اس مقصد کو بھی ناکام کر دیا اور ظاہر ہے کہ اس کے تاریخی وجوہ تھے۔" (یہ وجوہ کچھ بھی ہوں لیکن ادارہ تحقیقات کے ڈاکٹروں نے تاریخ اسلام کے خلاف قرآنی مقصد کو ناکام کر دینے کی فرضی فرد جرم تو مرتب کر ہی لی۔ ناقل۔)

فکر و نظر جلد ۴ ش ا ص ۲۰)

۲۴۔۔۔۔ غنا اور سماع (گانا بجانا) :

"الف۔ غنا اور سماع راگ گانے اور سننے کی شرعی حیثیت میں دو مسلک ہیں' ایک فقہاء کا جو عموماً اس کی حرمت کے قائل ہیں اور دوسرا محدثین کا جو اسے جائز سمجھتے ہیں۔ اور اس باب کی تمام روایات کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۹ ص ۵۶۶)

ب۔۔۔۔۔سماع و غنا کے معاملہ میں فقہاء کی شدت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک زمانے میں مسلمانوں میں یہ چیزیں اس حد کو پہنچ گئیں

کہ ان سے معاشرہ کی اخلاقی حالت دگرگوں ہو گئی' فقہاء کو قانون ساز کی حیثیت سے اس لہوولعب کے افراط کا تدارک کرنا پڑا' ان کے یہ فتاویٰ اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں"

(کیا فقہا کے اس فیصلہ کی کوئی بنیاد قرآن و سنت میں موجود نہ تھی؟ یوں ہی قانون سازی کے شوق میں انہوں نے فتاویٰ صادر فرما دیئے تھے' کیا قینات و معازف نے گھر گھر "ڈوم خانہ" بنا کر نہیں رکھ دیا؟ کیا پھر یہ فتاویٰ اسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کی الٹی منطق اپنے اندر کوئی جان رکھتی ہے۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۹ ص ۵۷۵)

۲۵۔۔۔۔۔۔حدود اللہ :

" حدود کی تفصیلات کا حکم اسلامی حکومت پر چھوڑ دیا گیا' مثلاً شراب کی کون سی قسم حرام ہوگی' کتنی مقدار پینے پر کوئی انسان مجرم ہوگا' اور اس میں کوئی استثناء بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یا مثلاً چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا کتنی مالیت پر جاری ہوگی' اور کس قسم کی چوری جرم قرار پائے گی' یہ سب حکومت کی ذمہ داری قرار دے دیا گیا' حدیث میں کچھ تعیین کی گئی ہے' لیکن تفصیل ہمارے فقہاء نے کی۔" ملخصاً (گویا اسلامی حدود فقہاء کی پیداوار ہیں' اور موجودہ دور کے نام نہاد فقہاء ان میں آزادانہ تبدیلیاں کر سکتے ہیں۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۹ ص ۶۷۳)

۲۶۔۔۔۔۔۔تصویر اور فوٹو :

الف۔۔۔۔۔۔"یہ غلط تصور کہ "اسلام کا مزاج تصویر اور مصوری

کے خلاف ہے" ائمہ مجتہدین کے نقطہ نظر کو نظر انداز کر دینے سے پیدا ہوا' اس لئے ہمارے یہاں فوٹو کو حرام سمجھا جاتا ہے"۔ ملخصاً۔

(فکر و نظر جلد ا ش ۱۰ ص ۵۰)

ب۔۔۔۔۔"حدیث شریف مذاہب اربعہ' اور دوسرے ائمہ مجتہدین کے اقوال سے صرف ایسی تصویر کی حرمت پر اجماع ثابت ہوتا ہے' جس کا سایہ ہو' اگر سایہ نہ ہو تو جائز ہے' اور چونکہ فوٹو کا سایہ نہیں ہوتا' اس لئے وہ بھی اکثر ائمہ کے نزدیک جائز ہے"۔ (پدر نہ کرد پسر تمام خواہد کرد" ادارہ تحقیقات کی یہ تحقیقاتی مہم جاری رہی تو فقہاء کے اقوال سے کیا قرآن مجید سے بھی ہر مورتی کا جواز ثابت کرلیا جائے گا' تصویر کے سایہ دار ہونے یا نہ ہونے کی بحث بھی یقین کرنا چاہئے کہ عبوری قسم کی ہے۔ جہاں فقہاء کے اقوال سے ہر قسم کا سود جائز کرلیا جائے۔ وہاں تصویر اور فوٹو کا جواز تو یقیناً آسان چیز ہے۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ا ش ۱۰ ص ۵۸)

۲۷۔۔۔۔ نسلی منصوبہ بندی :

" امام غزالی سے لے کر ابن عابدین تک تمام فقہاء اور صوفیا اس کے جواز کے قائل ہیں ہم نے اپنی طرف سے کچھ کہے بغیر ائمہ مجتہدین کے اقوال پیش کر دیئے ہیں۔ جس سے شریعت حقہ کا حکم معلوم کیا جا سکتا ہے ملخصاً (واقعی بڑا احسان فرمایا کہ عزل کے بارے میں کچھ اسقاط کے بارے میں آپ نے اقوال نقل کر ڈالے اور

بعض بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کا ذکر بھی فرما ڈالا' لیکن سوال یہ ہے کہ ۲۹ کروڑ روپیہ صرف کرنے اور مردوں کو ٹیکے لگا لگا کر انہیں ناقابل اولاد کر دینے پر ڈاکٹر اور نامرد ہونے والے دونوں کو بیس بیس روپیہ انعام دینے' اور مستورات کے مختلف قسم کے غیر فطری عمل سے رحم کا موںہہ بند کر دینے اور برسرعام اسے ایک مہم کی حیثیت سے پھیلانے اور قومی ذرائع کافی نہ ہوں تو اس کے لئے غیر ملکی امداد طلب کرنے کی تصریح بھی کتابوں کے کسی گوشے سے ڈھونڈ نکالی ہوتی' یا ہم توقع رکھیں کہ یہ کام' اسلام کے آئندہ ایڈیشن' میں سرانجام پائے گا؟ اور کہیں سے یہ عبارت بھی نکال لی ہوتی کہ منصوبہ بندی کی اس مقدس تحریک سے پیدا ہونے والے بن باپ کے معصوم بچوں کے لئے تربیت گاہیں کھولنے کا منصوبہ بھی عین اسلامی مزاج ہے۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۵۔۶ ص ۳۴۴)

۹۔۔۔۔پھر بھی دعوئی ہے کہ مسلمان ہیں ہم :

ادارۂ تحقیقات اسلامیہ کے ملحدانہ نظریات اور بعض صریح کفریات کی کچھ مثالیں جو اوپر ذکر کی گئی ہیں، ہمیں ان پر قطعاً حیرت نہیں، اس لئے کہ ادارۂ کے "رجال کار" جس ذہنی فضا آغوش تربیت اور فیضان نظر سے پروان چڑھے ہیں فطرتاً ان چیزوں کے علاوہ کی توقع ان سے کہاں سے کی جاسکتی تھی لیکن بایں ہمہ ان کا دعوائے اسلام ہمارے لئے سامان صد حیرت ہے، ہم یہ سمجھنے سے معذور ہیں کہ جس دین کا ماضی ان کے بقول اس قدر تاریک اور عبرت ناک ہے،

اس کے نام کے استعمال کا تکلف کیوں فرمایا جاتا ہے؟ گویا ادارہ تحقیقات اور اس کے ارباب "فکر و نظر" کا اسلام بھی نئی تمیزہ کا وضو ہے کہ عقل الٰہی کو عام انسانی بصیرت کی سطح پر لاؤ لیکن اسلام میں فرق نہیں آئے گا، آنحضرت ﷺ کو تشریع اور قانون سازی کے مقام سے معزول کر دو وہ تب بھی باقی رہے گا، قرآن و سنت کے فیصلوں پر "وقتی اور ہنگامی" منطق کے رندے چلاؤ، نصوص کا مذاق اڑاؤ، جس حکم کو چاہو منسوخ کر ڈالو، اور شوق سے مسلمان کہلاؤ، مغربی مفکرین کے کہنے پر اسلام کی تفسیر بدل ڈالو، کتاب خداوندی کو الٹ معنی پہناؤ، اسلام کے ہر مسئلہ کو استشراقی دوربین سے دیکھو، لیکن اسلام پھر اسلام رہے گا- روایتی، اساطیری، قدامت پسندی، روایت پسندی، قسم کی مہذب صلواتیں اسلام کو سناؤ، تمام اسلامی عقائد کو خوش اعتقادی، توہم پرستی اور عیسائیت سے درآمد قرار دو لیکن یہ یقین بھی رکھو کہ اسلام محفوظ رہے گا...... امت مسلمہ کی پوری تاریخ پر طعنہ زنی کرو، امت کے اعمال، امت کے عقائد اور امت کے اجتماعی فیصلوں کو ایک ایک کر کے جھٹلاتے رہو اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی قانون مرتب کرنے کا اعلان بھی کرتے جاؤ، امت مسلمہ کے محدثین پر معاصرانہ واقعات کو ذات نبویؐ سے خواہ مخواہ منسوب کر ڈالنے کی تہمت تراشی کرو، اور ان پر تاریخ سازی کا الزام لگاؤ، فقہائے امت پر ذاتی آراء، یہودی روایات، بازنطینی نظام، اور ایرانی معاملات کو شریعت بنا دینے کا بہتان باندھو، امام شافعیؒ سے لے کر مجدد الف ثانیؒ تک تمام مشاہیر اسلام پر انسانیت سے روگردانی اور اسلام پر ظلم کا الزام لگاؤ، لیکن فرض کرو کہ اسلام کا بال بیکانہ ہو گا، دین اسلام کے ایک ایک شعبہ کو قرون وسطیٰ کی پیداوار اور عہد وسطیٰ کے فقہا کی رنگ آمیزی ثابت کرو، لیکن مجال نہیں کہ

اسلام ٹوٹ جائے، حدود اللہ کا انکار کرو، زکوۃ کو ٹیکس بتلاؤ، سود اور شراب کی حلت کے فتوے صادر کرو، اور ارشادات نبوت کو اَنمل، بے جوڑ اور مصنوعی بتلاؤ، لیکن فرض کرو کہ اسلام بدستور رہے گا، گویا:

ع رند کے رند رہے اور ہاتھ سے جنت نہ گئی

ادارۂ تحقیقات کی "تحقیقی منطق" کو اگر ایک لمحہ کے لئے تسلیم کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ اسلام ہر اعتبار سے صفر ہے۔ معاذ اللہ، موجودہ دور کے لئے خدا اور رسول کا کوئی قطعی حکم نہیں، جسے من و عن سر آنکھوں پر رکھا جائے، اسلامی ذخیرہ میں کوئی عقیدہ اور عمل ایسا نہیں جسے قطعی اور یقینی کہا جا سکے، بلکہ کل اسلامی سرمایہ ظنون واوہام کا ڈھیر ہے، جسے موجودہ دور کے متجددین چھان پھٹک کر اس میں سے اپنے حسب حال کچھ اجزا کا انتخاب کر لیں گے اور ان پر نئے ہزلیات کی عمارت استوار کی جائے گی، یہ ٹھیک وہی نظریہ ہے جس پر لسان الحکمت شاہ ولی اللہؒ نے مندرجہ ذیل تنقید فرمائی ہے:

"بالجملہ درست ماہیچ چیز از شریعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازنوع اول نباشد' وامت مظنون خود با عمل کند' و ثبوت عمل بہ مظنون در جزئیات شریعت ثابت نیست الا باجماع طبقہ اولی' پس آن نیز متحقق نباشد' پس ہیچکس الیوم مکلف بحکم شرعی نیست۔

لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین علی ہذہ العقیدہ الباطلۃ

(ازالۃ الخفاج ۳ ص ۲۱۷ طبع جدید)

ترجمہ: "حاصل یہ ہے کہ اس صورت میں ہمارے ہاتھ میں شریعت محمدیہ کی نوع اول (یعنی علوم یقینیہ) کی کوئی چیز نہیں رہتی' اور

امت اپنے ظنون پر عمل پیرا رہے گی اور جزئیات شرعیہ میں ظن پر عمل کرنا بھی طبقہ اولیٰ کے اجماع سے ہی ثابت ہے جب اجماع ثابت نہ ہوا تو یہ بھی ثابت نہ ہوا' نتیجہ یہ ہوگا کہ آج کوئی شخص بھی کسی شرعی حکم کا مکلف نہیں ہے۔ اس عقیدہ باطلہ پر اللہ کی لعنت' فرشتوں کی لعنت اور تمام انسانوں کی لعنت۔

۱۰۔ حرف آخر

آخر میں ایک تلخ حقیقت کا اظہار ضروری ہے' وہ یہ کہ ادارہ تحقیقات کے مفکرین نے کئی جگہ یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر قرآن و سنت اور دین و شریعت میں تغیرو تبدل کی اجازت نہ دی گئی تو اسلامی حکومتیں ترکی کی طرح مذہب کو قانونی حیثیت سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گی اور ہم اسلام کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

(ملاحظہ ہو فکرو نظرج ۲ ش ۴ ص ۲۳۵) و دیگر مقامات

ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اگر آپ نے شریعت مطہرہ کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے اور قرآن و سنت کے نصوص قطعیہ کو تبدیل کر دینے ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو اطمینان رکھئے آپ کو لامذہبیت کے باقاعدہ اعلان کے تکلف کی کچھ حاجت نہیں' اس نظریہ کو اپنا لینے کے بعد بغیر کسی قسم کا اعلان کئے آپ کو وہ نعمت مل جاتی ہے جس کے آپ دل و زبان سے خواستگار ہیں' پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ اسلام کو ایسے خودغرض' مفادپسند اور مطلب پرستوں کی ضرورت بھی کہاں ہے' جو محض اس بنیاد پر ترک مذہب کے لئے بے چین ہو جاتے ہوں' کہ مذہب ان کی خودروی اور خودرائی پر قدغن کیوں لگاتا ہے' البتہ ہم اتنا ضرور عرض کریں گے' اگر تم اسلام کا نام باقی رکھ کر اسلام کے مفہوم اور

اس کی صحیح تعلیمات کو بدل ڈالو گے تو اپنی ذات اور اسلام دونوں پر ظلم کرو گے' اور اگر ترک مذہب کا راستہ اختیار کرو گے تو اس ظلم کا تعلق تنہا تمہاری ذات سے ہو گا' ہمارے خیال میں آپ کے لئے دوہرے ظلم کی نسبت اکہرے ظلم کا برداشت کرلینا آسان ہو گا۔

حاصل یہ ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامیہ کی موجودہ روش ان الفاظ کی مصداق ہے جو لسان الحکمت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے زنادقہ جاہلیت کے بارے میں لکھے ہیں۔

"والزنادقة یجبلون علی الفہم الابتر لا یستطیعون التحقیق التام الذی قصده صاحب الملة ولا یقلدونه ولا یسلمونه فیما اخبر' فہم فی ریبہم یترددون علی خوف من ملئہم' والناس ینکرون علیہم ویرونہم خارجین من الدین' خالعین ربقة الملة عن اعناقہم' واذاکان الامر علی ماذکرنامن الانکار وقبح الحال فخروجہم لا یضر۔

(حجۃ اللہ البالغۃ جلد ۱ ص ۱۲۵ منیریہ)

ترجمہ :"اور زندیق لوگ فطرۃً "فہم ناقص" رکھتے ہیں اور اس امر کی پوری تحقیق نہیں کرپاتے جو صاحب ملت کا مقصود ہوتا ہے' نہ وہ صاحب ملت کی تقلید کرتے ہیں' نہ ان امور کو تسلیم کرتے ہیں جن کی خبر صاحب ملت نے دی ہے' چنانچہ وہ اپنے شکوک و شبہات میں سرگرداں رہتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ماحول کے لوگوں سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ (اس لئے کھل کر انکار دین کی جرائت نہیں کرتے) اور لوگ ان کو برا جانتے ہیں۔ اور دین سے خارج سمجھتے ہیں' اور جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے مذہب کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا ہے' اور جب ان کے انکار' اور بدحالی کا معاملہ اس

نقطہ پر پہنچا ہوا ہے' جو ہم نے بیان کیا' تو ان لوگوں کا دین سے
خارج ہو جانا قطعاً مضر نہیں۔"

یہ عبارت ہر دور کے ملحدین اور زندیقوں کے طرز عمل' طرز تحقیق' طرز فکر اور انداز اصلاح پر بہترین تبصرہ ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پیش کردہ آئینہ میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے ارباب "فکرونظر" کی اصلی شکل و صورت پوری طرح عکس پذیر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ ادارہ اپنی اور اپنے ادارتی احباب کی بدترین شکل اس آئینہ میں دیکھ کر اصلاح کی کوئی فکر کرے گا۔ یا سیاہ فام حبشی کی طرح اس آئینے ہی کو پھینک ڈالنے پر قناعت کرے گا۔ حق تعالیٰ اسلام کو تمام فتنوں سے محفوظ رکھے---

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(الحق ذوالقعدہ ۱۳۸۶ھ)

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے عائلی قوانین اور علمأ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد'

مدیر بینات کو بعض احباب نے عائلی قوانین کے بارے میں بااخلاص مشورہ دیا کہ :

"عائلی قوانین کے بارے میں عرض ہے کہ اکابر علما سے اس کا بائیکاٹ کرایا جائے' جب تک علما اس کا بائیکاٹ نہیں کریں گے اس وقت تک کام نہیں بنے گا' نہ حکومت توجہ کرے گی' نہ علما کے مشورہ کے مطابق اس میں ترمیم کرے گی' بلکہ یہ قانون اسی طرح ہمارے سروں پر مسلط رہے گا"۔

اس پر مدیر بینات نے ان کے بااخلاص مشورہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا :

سب سے پہلے یہ اصولی بات ذہن میں رکھئے کہ علمائے امت کا اصل مشن اصلاح ہے' تخریب نہیں' وہ نازک سے نازک مرحلہ پر بھی حق کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں' خواہ اس کی وجہ سے انہیں مشکلات ہی میں مبتلا ہونا پڑے' لیکن کسی مرحلہ پر بھی وہ حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کے حق میں نہیں' عائلی قوانین کے سلسلہ میں جہاں تک علما کی ذمہ داری کا تعلق ہے آپ ہمارے ساتھ اتفاق کریں گے کہ علمائے کرام نے ادائے فرض میں کسی ادنیٰ تساہل سے بھی کام نہیں لیا' قرآن وسنت کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت کی خاطر قید وبند کی صعوبتیں بھی انہیں برداشت کرنا پڑی ہیں' حد یہ ہے کہ علما کرام کی مساعی جمیلہ سے صوبائی اسمبلی متفقہ طور پر اس

قانون کو رد کرچکی ہے' اور قومی اسمبلی شرعی نقطہ نظر کے موافق اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس کرچکی ہے' اس کے باوجود بھی یہ قانون اگر ہمارے سروں پر مسلط رہتا ہے تو اسے ہماری بدقسمتی قرار دیا جائے' یا اس کا حساب وکتاب ان لوگوں کے کھاتے میں درج کیا جائے جو اسے تبدیل کرسکتے ہیں مگر نہیں کرتے۔

جہاں تک اس قانون پر عمل نہ کرنے کا تعلق ہے' اس کا اظہار نہ صرف علمائے امت بلکہ عامۃ المسلمین بھی قولاً وعملاً کرچکے ہیں' ذرا اس قانون کی دفعات اور ان پر عمل درآمد کا ہلکا جائزہ لیجئے' تو واضح ہوگا کہ بجز اندراج نکاح ورجسٹرار اس کی کسی شق پر پاکستان میں عمل نہیں ہورہا' بلکہ عملی زندگی میں یہ قانون قطعی بیکار ہے' مثلاً:

"عائلی قوانین کی دفعہ ۴ کی رو سے صلبی بیٹے کی موجودگی میں پوتے پوتی' اور نواسے نواسی کو وارث قرار دیا گیا ہے' جو قرآن کریم' حدیث نبوی اور اجماع امت کی صریح ضد ہے' علمائے امت اس قانون کے نفاذ سے لے کر اب تک یہ اعلان کرتے ہیں' کہ جن لوگوں کو اس قانون کے تحت ان کے دادا کی جائداد مل جاتی ہے' وہ شرعاً غاصب ہیں' یہ جائداد ان کے لئے قطعاً حرام ہے' اور مسلمان قرآن وسنت کے فرمودہ پر عمل کرنے ہی میں اپنی اخروی نجات تصور کرتے ہیں' اس صورت میں ظاہر ہے کہ قانون کی اس شق پر نہ علما کا عمل ہے نہ کسی اور مسلمان کا ہوسکتا ہے۔

دفعہ ۶ کی رو سے تعدد ازواج پر پابندی عائد کی گئی ہے' یہ بھی قرآن کریم' سنت نبویؐ' اور تعامل امت کے قطعی خلاف ہے' لیکن آپ جانتے ہیں' کہ بلا ضرورت شادیوں کا ہمارے یہاں نہ رواج ہے' نہ متوسط طبقہ میں اس کی سکت ہے' اور بوقت ضرورت خود اس قانون میں بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔

اس لئے یہ قانون نظری طور پر قرآن وسنت اور اجماع امت کے خلاف ہونے

کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بے جان بھی ہے' اور پھر چونکہ بلانکاح "داشتہ" رکھنے پر قانون کوئی مداخلت نہیں کرتا اس لئے جو لوگ نکاح ثانی کا "جرم" کر گزرتے ہیں' وہ قانون کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاکر منکوحہ کے لئے بیوی کی جگہ "داشتہ" کی اصطلاح کا سہارا آسانی سے لے لیتے ہیں یہ اس قانون کی دوسری لغویت ہے' اسی نکتہ کے پیش نظر علمائے امت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس قانون کے واضعین کے سامنے نہ تو معاشرہ کی کسی پیچیدگی کی اصلاح ہے نہ قرآن وسنت کی صحیح ترجمانی ان کا مقصد ہے بلکہ صرف صاحب بہادر کی تقلید ہے' مغربی ممالک میں نکاح ثانی جرم ہے' مگر آشنائی جرم نہیں' ٹھیک اسی نظریہ کی ترجمانی ان واضعین نے کر ڈالی ہے' بہرحال پاکستانی مسلمان قانون کی اس شق پر بھی عامل نہیں ہیں۔

دفعہ ۷ کی رو سے طلاق کو چیئرمین کی منظوری کے بغیر غیر موثر قرار دیا گیا ہے' تین طلاق کو (خواہ وہ ایک لفظ سے ہوں' یا ایک مجلس میں' یا ایک عدت میں) ایک رجعی طلاق فرض کرتے ہوئے چیئرمین کی رضامندی کو اس کے موثر ہونے میں ضروری قرار دیا گیا ہے' اور عدت عام حالات میں ۹۰ دن اور حمل کی حالت میں' وضع حمل اور ۹۰ دن میں سے جو مدت زائد ہو بتلائی گئی ہے' یہ تمام امور بھی قرآن وسنت اور اجماع امت کے خلاف ہیں' لیکن علمائے امت اور عامۃ المسلمین کا عمل اب بھی اسلامی شریعت پر ہے' نہ کہ عائلی قوانین پر' چنانچہ کسی دارالافتا میں جاکر دیکھ لیجئے' کہ مسلمان ان مسائل کے بارے میں شرعی حکم دریافت کرتے ہیں' اور اسی پر عمل کرتے ہیں' کیونکہ طلاق اور عدت پر بیوی کے حلال و حرام ہونے کے علاوہ نسب کے صحیح یا غلط ہو جانے کے نتائج بھی مرتب ہوتے ہیں۔

دفعہ ۱۲ میں لڑکے کے لئے ۱۸ سال اور لڑکی کے لئے ۱۶ سال "بلوغ کی عمر" سے پہلے نکاح کو جرم قرار دیا گیا ہے اول تو حسی طور پر لڑکے لڑکی کا اس عمر سے پہلے بالغ

ہو جانا ہی اس قانون کی لغویت کے لئے کافی ہے پھر عمر کے معاملے میں غلط اندراج کا عام رواج اس قانون کی بے بسی کے لئے کوئی معمولی مسئلہ نہیں' مزید برآں یہ کہ قانون کے علی الرغم صغر سنی کی شادیاں بدستور جاری ہیں' اس لئے یہ قانون غلط بیانی کو رواج دینے اور نکاح جیسے خالص شرعی معاملہ میں بھی "چور بازاری" کا دروازہ کھولنے کے علاوہ کسی مفید نتیجہ کا حامل نہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہو گا' کہ اس قانون میں بظاہر کتنی شدت کیوں نہ ہو' لیکن وہ اندر سے اتنا کھوکھلا ہے' کہ اپنی افادیت کے منوانے سے قاصر ہے' کسی قانون کی اصل روح اس کی بے جان دفعات نہیں' نہ اس کی اصل قوت "بزور اقتدار" نافذ ہو جانا ہے' بلکہ قانون کی اصل جان اس کی محبت و عظمت' متانت و رزانت' اور جامعیت اور ہمہ گیری ہے' یہ اوصاف "خدائی قانون" ہی میں پائے جاسکتے ہیں' لیکن جو قانون محض ہوا پرستی کے طور پر بنایا گیا ہو' اور چند بیگمات کی بے جا ہٹ سے اسے نافذ کر دیا گیا ہو' اس کا انجام وہی ہے' جو پاکستان میں عائلی قوانین کا ہوا۔

ان امور کے پیش نظر ہمارا خیال ہے کہ عملی طور پر اس قانون کا مفلوج ہونا خود اس کی لغویت کے لئے کافی ہے' علمائے کرام افہام و تفہیم کے راستے سے اس قانون کو منسوخ کرانے کے لئے آئینی ذرائع استعمال کر رہے ہیں' اور وہ اپنا فرض جاری رکھیں گے' اب یہ ملت اسلامیہ کا اپنا فرض ہے کہ اس قانون پر عمل درآمد یکسر بند کر دیں یا جن نمائندوں کے ہاتھ میں انہوں نے اقتدار کی کنجیاں دی ہیں انہیں اس کے منسوخ کرنے پر مجبور کریں۔

(بینات ذوالحجہ ۱۳۸۶ھ)

ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور انکار قرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد'

ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب جب سے ادارہ تحقیقات اسلامی کے سربراہ کی حیثیت سے پاکستان میں متعارف ہوئے ہیں وقتاً فوقتاً ان کا قلم اسلامی حقائق پر مشق تحریف کرتا رہتا ہے' ملت اسلامیہ بلبلا اٹھتی ہے اور وہ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں' گویا کسی رقیب نے ان کو اطمینان دلا رکھا ہے کہ :

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

ادارہ تحقیقات کے آرگن "ماہنامہ فکرونظر" نے جولائی ۱۹۶۷ء سے ڈاکٹر صاحب کی انگریزی کتاب "اسلام" کا ترجمہ قسط وار شائع کرنا شروع کیا ہے' موصوف نے اس کتاب کے باب اول میں "محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور وحی الٰہی" اور باب دوم میں "قرآن مجید" کے بارے میں اپنے مخصوص نظریات کا اظہار کیا ہے۔ موصوف نے پہلے تو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت' وحی الٰہی اور قرآن مجید کے بارے میں چودہ سو سالہ امت کے تمام عقائد محض افسانہ غلط اور داستان خود تراشیدہ ہیں اور یہ مسلمانوں کی "خام عقلی" کا کرشمہ ہے' موصوف لکھتے ہیں :

"نبوت اور الہام (۱) نبوی کا یہ تصور کہ نبی کے شعور کی سطح معمول کے مطابق ہوتی ہے۔ (۲) ہمارے راسخ العقیدہ علما نے واضح طور پر بہت بعد میں قائم کیا' پھر جب زمانہ مابعد میں نبوت کا یہ تصور قائم کر لیا گیا تو اس کے بعد اس تصور کی قصداً" اشاعت کی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ وحی الٰہی کی معروضیت (خارجی چیز ہونا) اور فرشتہ وحی کی خارجیت کا اثبات کیا جائے' یعنی اس تصور کا کہ یہ وحی الٰہی کوئی داخلی الہام نہ تھا' بلکہ خارج سے ایک آواز آ رہی تھی' یا فرشتہ خدا کی طرف سے پیغام لاتا تھا۔ ممکن ہے آج ہمیں یہ کوشش عقلی (۳) ناپختی پر مبنی معلوم ہو' لیکن ایک ایسے دور میں جب کہ عقائد اسلام زیر تشکیل تھے' بعض حالات کی بنا پر ایسی کوشش عمل میں آنی ضروری تھی' بالخصوص عقلیت ۴) پسندوں سے جو مباحث ہو رہے تھے ان کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری تھا' اسی زمانہ میں بہت سی احادیث (احادیث پر دیکھئے باب سوم) کی اشاعت عمل میں آئی'

---

(۱) الہام نبوی' تو خالص مستشرقانہ تعبیر ہے' وحی الٰہی' کہئے' مدیر۔

(۲) مبہم سا فقرہ ہے' یاد نہیں پڑتا کہ کس نے ایسا کہا ہو۔ ممکن ہے یہ تسامح ڈاکٹر صاحب کی تعبیر یا ان کی کتاب کے اردو ترجمہ میں ہوا ہو۔ (مدیر)

(۳) جی' نہیں' جس ماحول کی ترجمانی آپ ہمیں کے لفظ سے کرتے ہیں' اس میں صرف یہی حقائق نہیں بلکہ "پیٹ اور جیب' اور کرسی کے علاوہ بھی کچھ عقلی' ناپختگی' نظر آتا ہے' خدا' نبی' نبوت' وحی' فرشتہ جیسی چیزوں کو مان کر اس فضا میں ناپختہ عقلی' کا طعنہ کون سنے؟

(۴) خالص فرضی افسانہ! مغرب کے فلسفہ ارتقاء کا نیا ماڈل (مدیر)

جنہیں بعد میں سند قبولیت حاصل ہو گئی' ان حادیث میں یہ بتایا گیا تھا کہ رسول اللہ جبرئیل سے سب لوگوں کے سامنے ہم کلام ہوتے تھے' نیز ان میں جبرئیل کی ظاہری کیفیت کی مرقع آرائی بھی کی گئی تھی' یہ احادیث قرآن سے بالکل متناقص ہیں کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے نزل به الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین اس کو ایک امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ آپ کے قلب پر تاکہ آپ بھی منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں (سورہ الشعراء ۱۹۲) (اس سلسلے میں مزید دیکھئے سورہ بقرہ آیت ۹۷) اس کے باوجود مسلمانوں کے ذہن میں یہ عقیدہ اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ جبرئیل کا وجود خارج میں ہے اور وحی الٰہی خارج سے رسول اللہ پر نازل ہوئی کہ اب وہ حقیقت سے آشنا ہونے پر آمادہ نہیں"

(فکرو نظر اگست ۶۷ء ص ۹۳'۹۴)

خلاصہ یہ کہ امت مسلمہ کا یہ عقیدہ کہ قرآن مجید ایک خارجی وجود رکھتا ہے " بل هو قرآن مجید فی لوح محفوظ" (وحی نبیؐ کے شعور و تخیل کی آواز نہیں' بلکہ وہ قرآن مجید ہے جو لوح محفوظ میں ثبت ہے) اور فرشتہ وحی اسے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے اور یہ وحی حق تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ جبرئیل آسمان سے آپؐ کے پاس بھیجی جاتی تھی" یہ سب غلط اور ناپختہ عقل لوگوں کی بنائی ہوئی کہانی ہے' اسی طرح امت اسلامیہ نے حقیقت حال پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ تمام احادیث متواترہ بھی وضع کرلیں جن میں وحی' فرشتہ وحی اور نزول وحی کی کیفیت بیان ہوئی ہے' ڈاکٹر صاحب اس کی مزید وضاحت اس طرح فرماتے ہیں :

"جب دوسری اور تیسری صدی ہجری میں مسلمانوں میں وحی کی نوعیت کے متعلق سخت قسم کے اختلافات آراء اور بحثیں' جو ایک حد تک مسیحی عقائد سے متاثر تھیں شروع ہوئیں تو نئی نئی ظہور پذیر راسخ العقیدگی (۱) نے' جو اس وقت اپنے معین معتقدات کی تشکیل کی نازک و فیصلہ کن منزل میں تھی' پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی وحی کی خارجیت (یعنی اس کا نزول خارج سے ہوتا تھا) پر بہت زور دیا تھا' تاکہ اس طرح وحی کی ماورائیت' معروضیت اور لفظا نازل ہونے کی حیثیت کو محفوظ و مستحکم کر سکے۔

یقیناً قرآن نے خود وحی کی ماورائیت' معروضیت اور اس کے لفظا" نازل ہونے کا اثبات کیا ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسی طرح اس نے یقیناً وحی کی خارجیت کو یعنی پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات کے مقابلے میں مسترد کیا ہے' وہ کہتا ہے :

وانه لتنزيل رب العالمين نزل به الروح الامين' على قلبك لتكون من المنذرين۔ (۲۶-۱۹۴)

---

(۱) زمانے کی بوالعجبی کی بھی داد دینی چاہئے۔ قرآن کریم نے والراسخون فی العلم کہہ کر راسخ العلم' راسخ الایمان اور راسخ العقیدہ (علم' ایمان اور عقیدہ کے لحاظ سے پختہ) حضرات کی تعریف کی تھی' مگر مغربی فرزانوں نے ان ہی الفاظ کو مہذب "دشنام طرازی" بنا ڈالا۔ دنیا بھر کے عیوب کی فرد جرم جس شخص پر عائد کرنی ہو اس کے لئے بس ایک لفظ کہہ دیجئے "راسخ العقیدہ مسلمان" سبحان اللہ (مدیر)

(یہ رب العالمین (۱) کی طرف سے نازل کی گئی ہے، الروح الامین اسے لے کر تیرے دل پر اترا ہے تاکہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو)۔

نیز قرآن کا ارشاد ہے :

قل من کان عدوا لجبریل فانه نزله علی قلبک

(۲/۹۷) کہہ دو کہ جو جبرئیل (۲) کا دشمن ہے (سو ہوا کرے) بس وہی ہے جس نے (کلام کو تمہارے دل پر نازل کیا)۔

---

(۱) جی ہاں! جو وحی رب العالمین کی طرف سے اتار گئی' ایک امانت دار فرشتہ اسے لے کر آیا' اس فرشتے کا نام قرآن نے جبرئیل بتلایا' اس کے دشمن کو خدا کا دشمن کہا' اس فرشتے کو معلم وحی کہا' اس شان کی وحی اس شان کے فرشتہ وحی کا واقعی خارجی وجود ماننا تو "خام عقلی" ہے' ہاں ان کو وہمی' فرضی اور تخیلاتی چیز ماننا البتہ پختہ عقلی" ہے۔ عجب نہیں کہ کل کو "رب العالمین" کا واقعی وجود راسخ العقیدگی کی "خام عقلی قرار پائے' اور عقلاً مغرب میں تو بہت سے اس کے قائل بھی ہیں۔ (مدیر)

(۲) ڈاکٹر صاحب کی جبرئیل دشمنی کے لئے کیا یہی آیت کافی نہیں؟ ضرورت اگر زیادہ کی ہو تو آگے کی آیت بھی پڑھ لیجئے من کان عدوا" لله وملئکته ورسله و جبریل ومیکال فان الله عدو للکفرین (جو شخص اللہ کا' اس کے فرشتوں کا اس کے رسولوں کا بالخصوص جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو تو (اسے معلوم ہونا چاہئے) کہ اللہ تعالٰی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ اور ذہن میں یہ بھی رکھئے کہ یہ دونوں آیتیں ان یہود کے رد میں نازل ہوئیں جنہوں نے کہا تھا کہ چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے کر جبرئیل آتا ہے اور وہ ہے ہمارا دشمن۔ اس لئے ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی پر ایمان نہیں لاتے' گویا یہود کی' جبرئیل دشمنی' اس سلسلہ عداوت کا مبداء تھا' اور ڈاکٹر صاحب کی جبرئیل دشمنی' اس کا منتہا ہے' تشابهت قلوبهم کی کتنی اچھی مثال خود موصوف کے ترجمہ سے نکل آئی۔ (مدیر)

لیکن راسخ العقیدگی---- اور یقیناً قرون وسطیٰ کا تمام فکری سرمایہ---- ایسے ضروری عقلی ذرائع سے محروم تھی جن سے ایک طرف وہ اپنے نظام معتقدات کی تشکیل میں وحی کی ماورائیت اور لفظاً" نازل ہونے کی حیثیت اور دوسری طرف پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے عمل اور آپ کی مذہبی شخصیت کو ملا سکتی، یعنی یہ راسخ العقیدگی اتنی عقلی استعداد نہ رکھتی تھی کہ یہ دونوں باتیں کہہ سکتی کہ قرآن پورے کا پورا کلام اللہ ہے اور عام معنوں میں یہ اسی طرح پورے کا پورا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بھی ہے۔ یہ واضح ہے کہ قرآن ان دونوں باتوں کو مانتا ہے۔ کیونکہ جب وہ اس پر اصرار کرتا ہے، کہ قرآن کا نزول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر ہوا ہے تو وہ آپ سے ایک خارجی چیز کیسے ہو سکتا ہے---- لیکن راسخ العقیدگی نے حدیث یا رسول اللہ سے مروی روایات کے ذریعہ جو کسی قدر مناسب و موزوں تعبیرات تھیں اور کسی قدر گھڑ لی گئی (۱) تھیں اور علم دینیات کی مدد سے جو زیادہ تر حدیث پر مبنی تھا پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی وحی کو تمام تر کانوں سے سنی جانے والی اور آپ کی ذات سے خارج چیز بنا دیا، اور اس فرشتے اور "الروح الامین" کو جو آپ کے دل پر وحی لے کر نازل ہوتا تھا۔ تمام تر ایک

---

(۱) یہ تو بڑا مبہم سا بیان ہے دعویٰ کتنا سنگین اور دلیل سرے سے غائب؟ صاف بتلانا چاہئے تھا کہ فلاں فلاں "راسخ العقیدہ صاحبان" نے، فلاں تاریخ کو، فلاں حجرے میں بیٹھ کر، فلاں فلاں افسانے گھڑے، اور فلاں فلاں کتاب میں اس کا ریکارڈ موجود ہے، دلیل کے بغیر دعویٰ تو کسی بھی محقق کے لئے روا نہیں، خواہ وہ راسخ عقیدہ کا ہو یا خام عقیدہ کا (مدیر)

خارجی عامل قرار دے دیا، پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی وحی کی آج مغرب (۲) نے جو تصویر کھینچ رکھی، اس کا زیادہ تر انحصار قرآن کے بجائے راسخ العقیدگی کے اس متشکل عقیدے پر ہے جیسے کہ ایک عام مسلمان بھی مانتا ہے"۔ (فکر و نظر اکتوبر ۱۹۶۷ء ص ۲۵۔۲۵۱)

ڈاکٹر صاحب کے اس طویل اقتباس میں جن توضیحات کو سامنے لایا گیا آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ان پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

۱۔۔۔ اسلام کا تصور نبوت، تصور وحی، فرشتہ وحی کا وجود خارجی، آسمان سے آپؐ پر وحی کا نزول اور تمام اسلامی عقائد دوسری اور تیسری صدی کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔

۲۔ اسلام کی چودہ صدیوں کے کروڑوں علما، عقلا، مجدد، فقیہ، متکلم، محدث، مفسر، فلسفی، سب کے سب اتنی عقلی استعداد سے بھی محروم رہے کہ وہ وحی الٰہی کا صحیح مفہوم تک سمجھ سکیں۔ یہ "عقل کل" خوش قسمتی سے صرف ڈاکٹر صاحب موصوف یا ان کے مستشرق اساتذہ کو نصیب ہوئی ہے، ورنہ قرون وسطیٰ سے آج تک پوری کی پوری امت کو علم و عقل سے کیا مس تھی۔ (لعنت آخر هذه الامة اولها) یعنی پچھلوں کے پہلوں پر لعنت کرنے کی یہ کتنی عجیب صورت ہے؟

۳۔۔۔ قرآن مجید صرف کلام اللہ ہی نہیں (جیسا کہ مسلمانوں کا ایمان ہے) بلکہ وہ واقعتاً پورے کا پورا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے (ڈاکٹر صاحب کے نزدیک کلام اللہ ہونے کا مفہوم آگے آتا ہے)۔

---

(۲) لیکن بنیادی فرق "مغرب کی کھینچی ہوئی تصویر" اور تحقیقاتی ادارے کی "مشرقی تصویر" میں بھی تو نمایاں نہیں۔ بلکہ یہ مشرقی تصویر اسی کا "عکسی چربہ" نظر آتا ہے۔ (مدیر)

۴ ----- چونکہ قرآن نے یہ تصریح کرتے ہوئے کہ قرآن رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے' اور جبرئیل امین اسے لے کر آئے ہیں' دو جگہ یہ کہا ہے کہ قرآن کا محل نزول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اطہر ہے' اس لئے فرض کر لینا چاہئے کہ قرآن آپؐ کی ذات سے خارج چیز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ آپ کے ذہن و شعور ہی سے ابھری ہوئی آواز ہے۔ جیسا کہ آگے تصریح آتی ہے۔

۵ ----- وحی و رسالت' قرآن اور فرشتہ وحی سے متعلق تمام ذخیرہ حدیث اور اس پر مبنی علم دینیات (علم عقاید) محض مسلمانوں کی من گھڑت ہے۔

۶ : ----- مغربی مستشرقین نے اسلام' نبی اسلام اور قرآن کے بارے میں جو اعتراضات کئے ہیں ان کا انحصار چونکہ اسلام کے غلط عقاید پر ہے اس لئے یہ اعتراضات صحیح ہیں' ان سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ یہ تمام عقائد جن کو ایک عام مسلمان بھی مانتا ہے' ان سب کا انکار کر دیا جائے (۱)

اسلام' قرآن' نبوت' وحی' فرشتہ وحی کے بارے میں تو ڈاکٹر صاحب کے نظریات واضح ہو گئے جن کا مختصر خلاصہ صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کے تمام بنیادی عقائد غلط اور خام عقلی کا نتیجہ ہیں جن سے ان کو فوراً دستبردار ہو جانا چاہئے' لیکن ڈاکٹر صاحب کے فہم سلیم نے قرآن کے کلام اللہ ہونے کا کیا مفہوم تجویز کیا ہے؟ اس کی وضاحت ابھی باقی ہے' جس کے لئے ڈاکٹر صاحب نے تمہیداً تین مقدمات ذکر کیے ہیں پہلے مقدمہ میں قرآن کے "بنیادی محرک" کو پیش کرتے ہوئے امر اللہ' اسلام اور عبادت کی تفسیر وہ اس طرح فرماتے ہیں :

---

(۱) اس پر افسوس جتنا چاہے کر لیجئے لیکن حیرت ذرا بھی نہیں' آخر مغربی شاطروں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ (مدیر)

"قرآن کا "بنیادی روحانی محرک" اخلاقی ہے' اور اسی سے اس کا توحید اور ساتھ ساتھ اجتماعی عدل پر زور دینے کا سوتا پھوٹتا ہے' اخلاقی قانون غیر متغیر ہے' یہ "امر اللہ" ہے انسان نہ تو اخلاقی قانون بنا سکتا ہے اور نہ اسے ختم کر سکتا ہے' انسان کو اسے تسلیم کرنا چاہئے اس کا اس طرح تسلیم کرنا "اسلام" کہلاتا ہے' اور اس کو زندگی میں عملی شکل دینا "عبادت" سے موسوم کیا جاتا ہے۔"

(فکر و نظر اکتوبر ۱۹۶۷ء ص ۲۵۲)

دوسرے مقدمے میں وہ اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ اخلاقی قانون کی دریافت میں لوگوں کی استعداد نیز ایک ہی فرد کی باطنی زندگی مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے تیسرے مقدمہ میں وہ یہ بتلاتے ہیں کہ پیغمبر کی شخصیت کا عام معیاری اور مجموعی کردار کہیں زیادہ اعلیٰ و برتر ہوتا ہے عام انسانیت کے کرداروں سے وہ ایک ایسی شخصیت ہوتی ہے جو روز اول سے لوگوں بلکہ ان کے اکثر نصب العینوں کے بارے میں بڑی بیتاب ہوتی ہے اور تاریخ کی نئی تخلیق کرنا چاہتی ہے۔

مذکورہ بالا ان تینوں مقدمات کو ایک دفعہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اب سنئے کہ قرآن واقعتاً کلام پیغمبر ہونے کے باوجود محض رسمی طور پر کیوں کلام اللہ کہلاتا ہے۔ فرماتے ہیں :

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسی شخصیت تھے' درحقیقت ایسی شخصیت صرف وہی تھے جس سے کہ صحیح معنوں میں تاریخ واقف ہے اسی لئے آپؐ کا مجموعہ اسوہ مسلمانوں کے نزدیک سنت یا ایک مثالی نمونہ مانا جاتا ہے' لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ ایسے

لمحات بھی آتے تھے' جب کہ آپؐ جیسا (ا) کہ ہوتا تھا اپنے آپ سے پرے گزر جاتے تھے' اور آپ کا اخلاقی عارفانہ ادراک اتنا تیز اور اتنا شدید ہو جاتا تھا کہ آپ کا شعور اور خود اخلاقی قانون ایک ہو جاتے تھے"۔ (ص ۲۵۳)

خلاصہ یہ کہ اخلاقی قدریں "امر اللہ" ہیں اور نبیؐ اپنے لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب کر ان قدروں کا سراغ لیتا ہے' اس "اپنے آپ سے پرے گزر جانے" کی وجہ سے اخلاقی قدریں ـــــ خود بخود الفاظ میں ڈھل کر نبیؐ کے قلب میں وارد ہو جاتی ہیں' اس طرح اخلاقی قدروں کا قلب اطہر پر وارد ہونا "نزول وحی" ہے اور یہ تمام الفاظ اگرچہ نبیؐ کے ذہن و شعور سے پیدا ہوئے' مگر چونکہ ان الفاظ میں اخلاقی قدروں کا نبی کو شعور حاصل ہوا' صرف "اس لحاظ" سے اسے کلام اللہ کہنا چاہئے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں :

" اخلاقی قانون اور مذہبی قدریں اللہ کا امر ہیں اور گو وہ پوری طرح اللہ کی عین نہیں لیکن اس کا حصہ ضرور ہیں" اس لحاظ سے قرآن خالصاً" کلام اللہ ہے"۔ (ص ۲۵۳)

جس طرح کہ ایک شاعر اپنے وجدان کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے' اپنے احساسات وتصورات میں کھو جاتا ہے' جس کی وجہ سے اس کے تخیلات خود بخود اشعار کی شکل میں ڈھل کر زبان پر جاری ہو جاتے ہیں جسے مجازاً" شاعرانہ الہام کہا جاتا ہے' اسی طرح نبی کا اخلاقی شعور جب قدروں کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے تو اس کے احساسات و

(ا) اس لئے زور تحقیق میں قلم کی لکنت بھی تو ملاحظہ کیجئے۔ "جب کہ آپ جیسا کہ ہوتا تھا اپنے آپ سے پرے گذر جاتے تھے" کیا بات ہوئی؟(مدیر)

تصورات مخصوص الفاظ میں خود بخود ڈھل جاتے ہیں، اسی کو عام زبان میں پیغمبرانہ الہام لفظاً" و معنیً وحی کہا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"احساسات، تصورات اور الفاظ کے درمیان یقیناً ایک نامیاتی و فطری رشتہ پایا جاتا ہے، الہام حتیٰ کہ "شاعرانہ الہام" میں بھی یہ رشتہ اتنا مکمل ہوتا ہے کہ احساس، تصور، لفظ سب مل کر ایک پیچ در پیچ کل بن جاتے ہیں، جس کی کہ خود اپنی زندگی ہوتی ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقی وجدانی ادراک ترقی کر کے بلند ترین درجے پر پہنچا اور وہ ادراک خود اخلاقی قانون کا عین بن گیا، تو الہام کے ساتھ الفاظ کا بھی نزول ہوا، چنانچہ قرآن خالصاً" کلام الٰہی ہے لیکن بیشک اس کے ساتھ وہ اتنا ہی پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی عمیق ترین شخصیت سے بہت زیادہ مربوط ہے، اور قرآن اور آپ کی شخصیت کے اس ربط کا تصور میکانکی طور پر اس طرح نہیں کیا جا سکتا جیسے کہ فوٹوگرافر، اور ریکارڈ کا ربط ہے کلام الٰہی کا سوتا پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے قلب سے پھوٹ کر نکلا ہے۔"

(ص ۲۵۴)

الغرض نبیؑ کے ذاتی احساسات و تصورات جب اخلاقی قدروں سے ہمکنار ہوئے اور انہوں نے الفاظ سے نامیاتی اور فطری ربط کی بنا پر "پیچ در پیچ کل" کی حیثیت اختیار کر لی، تو آپؑ کے یہی ذاتی احساسات و تصورات الفاظ قرآن کی شکل میں آپ کے قلب سے پھوٹ پڑے، اس لئے آپؑ کے احساسات و تصورات کے اخلاقی قدروں سے متحد ہو جانے کی وجہ سے انہیں کلام الٰہی کہا جاتا ہے، مگر چونکہ یہ احساسات، یہ تصورات، یہ ادراک، یہ شعور، یہ اخلاقی قدریں اور یہ الفاظ سب کے

سب اول سے آخر تک آپؐ ہی کی عمیق ترین شخصیت سے ابھرے اور آپؐ ہی سے ان تمام چیزوں کا تعلق ہے اس لئے درحقیقت یہ پیغمبر ہی کا کلام ہے۔

لفظی گورکھ دھندوں سے قطع نظر ڈاکٹر صاحب کا یہ نظریہ جہاں اسلام کے تصورات نبوت اور عقیدہ وحی پر کاری ضرب لگاتا ہے وہاں مشرکین مکہ سے مستشرقین یورپ تک کے اس دعویٰ کی خوبصورت توجیہ بھی پیش کرتا ہے کہ "قرآن نبیؐ کے اپنے شعور سے ابھری ہوئی آواز ہے' آسمانی وحی اور خدائی پیغام سے اس کا کوئی تعلق نہیں" یہ نظریہ بتلاتا ہے کہ قرآن میں ذکر کردہ تمام حقائق خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تیز ترین شعور کی دریافت ہیں' کسی خارجی ذات (خدائے علام الغیوب) کی اطلاع نہیں اس نظریہ پر سب سے زیادہ دلچسپ سوال یہ تھا کہ قرآن حکیم میں سینکڑوں حقائق ایسے بیان ہوئے جن تک انسانی ادراک و شعور کی رسائی قطعاً غیر معقول ہے مثلاً انبیائے سابقین کے قبل از تاریخ حالات جو قرآن حکیم میں شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احساس و شعور کو کتنا ہی تیز اور شدید فرض کر لیجئے لیکن عقل کسی طرح نہیں مانتی کہ ایک نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم ان واقعات کو کسی خارجی ذات کی اطلاع کے بغیر محض تیزی شعور کی وجہ سے دریافت کر لیں' ڈاکٹر صاحب نے اس معما کا حل یہ نکالا ہے' کہ یہ واقعات اسلام سے پہلے زبان زد عام تھے' جن کی تاریخی صحت بھی ضروری نہیں کہ صحیح اور واقعی ہو' اور کسی ذریعہ سے آپؐ کو ان کا علم پہلے ہی سے تھا' چونکہ آپ کے پیغام کی اہمیت و معنویت سے ان کا گہرا ربط تھا اس لئے وحی الٰہی کی حیثیت سے وہ آپؐ کے قلب پر موجزن ہو گئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

"ان تفصیلات کی تاریخی صحت کس درجہ کی ہے؟ یعنی انبیا سابقہ کے واقعات و حالات سے جو زمانہ ماقبل اسلام زبان زد عام تھے

یہ تفصیلات کہاں تک مطابقت رکھتی ہیں؟ یہ سوال دلچسپ تو ضرور ہے، لیکن مشکلات سے لبریز بھی ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی اہمیت و معنویت کے لئے یہ سوال کچھ زیادہ (۱) اہمیت نہیں رکھتا کہ قرآن نے انبیا سابقہ کے جن حالات و واقعات کا ذکر کیا ہے ان کا مواد کہاں سے اخذ کیا گیا تھا؟ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی معنویت اس مقصد میں پنہاں ہے جس کے لئے یہ مواد استعمال کیا گیا، اس لئے دیکھنا یہ چاہئے کہ اس مواد سے کیا کام لینا مقصود تھا قرآن نے ان حالات و واقعات کے بارے میں یہ ضرور کہا ہے کہ یہ وحی الٰہی (۲) کے منکشف کردہ حقائق ہیں، لیکن جس چیز کا وحی الٰہی سے خاص طور پر تعلق ہے، وہ ان واقعات کی معنویت یا بالفاظ دیگر وہ مقصد ہے جس کی خاطر یہ واقعات بیان کئے گئے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے (۳) ہی سے ان واقعات کا علم نہ ہوتا اور انہیں صرف وحی کے منکشف کردہ واقعات کی خبر ہوتی تو آپ کے لئے یہ

---

(۱) جی نہیں! زیادہ اہمیت تو کجا یہ سوال ہی سرے سے لغو ہے، کیا خدا کے بارے میں یہ پوچھا جائے کہ اس نے فلاں واقعہ کہاں سے معلوم کیا؟

(۲) جزاک اللہ! بات ادھوری نہ رہتی اگر ساتھ کے ساتھ قران کی یہ تصریح بھی ذکر کر دی جاتی: "ماكنت تعلمها انت ولا قومك من قبل هذا" — (اس غیبی اطلاع سے پہلے ان واقعات کو نہ آپؐ جانتے تھے نہ آپؐ کی قوم) (ہود: ۴۹)

(۳) وحیٔ الٰہی کا انکشاف اور پہلے سے علم یہ دونوں باتیں جمع کیسے ہو گئیں؟ تعجب ہے کہ اچھے خاصے سنجیدہ، پڑھے لکھے اور اونچے درجہ کے دانا بھی ایسے صریح تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں؟

سمجھنا مشکل ہو جاتا کہ وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ آپؐ کو کیا سمجھانا چاہتا ہے"۔(۱)
(فکر و نظر اگست ۱۹۶۷ء ص ۹۷)

ڈاکٹر صاحب اگر قرآن مجید کو وحی مان کر اتنی سی سیدھی بات کہہ دیتے کہ "یہ واقعات آپؐ کو اللہ علام الغیوب نے بتلائے تھے" تو چونکہ اس سے مستشرقین کا سارا ذہنی طلسم ہی ٹوٹ جاتا' اور خود موصوف کا نظریاتی نگارخانہ' اور عقلی گھروندا دھڑام سے زمین پر آ رہتا تھا' اس لئے وہ پہلے تو وحی کے منکشف کردہ واقعات کا سرا "قبل از اسلام زبان زد عام" ہونے سے جوڑتے ہیں' پھر ان کی "تاریخی صحت" سے آنکھیں بند کر لینے کی لوگوں سے اپیل کرتے ہیں' پھر ان کی عقلیت کا سارا زور یہاں آکر ختم ہو جاتا ہے' کہ اگر یہ واقعات خدا ہی نے بتلائے ہوتے تو آپؐ خدا کی مراد کو کیسے سمجھ پاتے؟

ع کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

ہم نے اس مقالہ میں صرف ڈاکٹر صاحب کے نظریہ کی تشریح تک اپنی بحث کو محدود رکھا ہے' ڈاکٹر صاحب کے نظریہ وحی کا حدود اربعہ' پس منظر اور تہ منظر کیا ہے؟ اس کی وضاحت کے لئے تو مستقل بحث کی ضرورت ہو گی' لیکن اتنا جاننے کے لئے تو غیر معمولی علم و عقل کی ضرورت نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے ان نظریات کا دین اسلام سے کیا تعلق ہے؟ کیا یہ انکار وحی و قرآن کے ذریعہ اسلام کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش نہیں؟

موصوف نے ازراہ کرم قرآن' وحی' نبوت' جبرئیل کے بارے میں امت

(۱) اتنی سطحی بات؟ اتنے بڑے محقق کے قلم سے؟ غلطی ہائے مضامین مت پوچھ۔ غریب مستشرقین کو بھی یہ نئی منطق کب سوجھی ہو گی جو ان کے شاگردوں نے ایجاد کر ڈالی؟

اسلامیہ کو جن تحقیقات سے روشناس کرایا ہے ذرا سوچئے ان کا حاصل کیا نکلا؟ استشراقی نظریات کا "شیش محل" اسلام اور مغربیت کا ملغوبہ' ایمان و یقین سے گریز و فرار' اقرار و انکار کا پر پیچ معما' تضاد بیانی کا مرقع' الفاظ و تعبیرات کا طلسم سامری' اسلامی اصطلاحات کی بیخ کنی' تغلیط اسلام کے لئے منصوبہ سازی' اسلام کش ذہنیت کی پردہ داری نئی نئی اصطلاحات کی نقاب پوشی' پوری امت کی مہذب تحمیق' بے معنی لفاظی' مہمل طرز استدلال' بے ربط افسانہ طرازی' عقل و دانش کا المیہ' فکرو نظر کا ماتم۔

یہ ہے وہ سرمایہ فکرو نظر جس سے اسلام' اسلامی اصطلاحات' اور قرآنی حقائق کے پیچ و خم سیدھے کیے جاتے ہیں! یہ ہے وہ تحقیقاتی مہم' جس کے ذریعے صریح کفریات کو "جدید باطنیت" کے حسین پردوں میں لپیٹ کر اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے ہر دور میں ملاحدہ کا یہی وطیرہ رہا ہے کہ اسلامی اصطلاحات کی نئی نئی تعبیرات سے لوگوں کے دین و ایمان کو برباد کیا جائے' اور قدیم الفاظ کو جدید معنی پہنائے جائیں ڈاکٹر صاحب نے جو تحقیقات پیش کی ہیں' اگر ان کے لئے بھی اسلام میں گنجائش نکل سکتی ہے اور یہ صریح کفریات بھی اگر قابل تاویل ہیں' تو کفرو ایمان کی تفریق کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے' اس وقت نہ صرف ہمیں قرامطہ' باطنیہ' اسمعیلیہ' بابیہ' بہائیہ' مرزائیہ جیسے گمراہ فرقوں کے کفریات میں تاویل کرنا پڑے گی' بلکہ شاید ابو جہل و ابولہب کے کفر میں تاویل کے لئے بھی تیار رہنا ہوگا۔ آخر جب ایمان و کفر کوئی مسئلہ ہی نہ ہو تو مومن کافر کا سوال ہی کب پیدا ہو گا۔؟

بہرحال کسی حقیقت کو الفاظ و تعبیرات کے غلیظ پردوں میں چھپانا ممکن نہیں' ڈاکٹر صاحب کی یہ نئی تحقیق انکار قرآن کی وہی فرسودہ کوشش ہے جو مشرکین سے مستشرقین تک اپنے تسلسل کے ساتھ جاری ہے' اگرچہ اس کی شکلیں بدلتی رہا کرتی ہیں۔

(بینات رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ)

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کج بیانی

حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی سے قبل کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"جب آپ شباب کو پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قوائے ظاہر و باطن کی تکمیل ہو چکی تو آپؐ کو چونکہ ملائکہ کے ساتھ مشابہت تھی اس لئے ملائکہ آپ کے سامنے متمثل ہوئے اور جب وہ آپؐ کو مخاطب کرتے تو آپؐ ان کی آواز سنتے۔"

آگے آغاز وحی کا بیان ہے :

" آپؐ ابھی غار حرا ہی میں تھے کہ آپؐ پر وحی نازل ہونی شروع ہوئی، آپؐ کے دل میں اس سے طبعاً" تشویش پیدا ہوئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ ملکیت کے شدت کے ساتھ ظہور پذیر ہونے اور آپؐ کے قویٰ پر یکسر ملکیت چھا جانے سے بہمیت پر گھبراہٹ طاری ہوئی، چنانچہ (ام المومنین) حضرت خدیجہ خاتون (رضی اللہ عنہا) آپؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو کتب سابقہ کا ماہر عالم تھا۔ اس نے کیفیت حال سن کر کہا :

"یہ فرشتہ جو تم نے دیکھا (وہی) ناموس اکبر ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کا پیغام پہنچایا تھا اس کے

بعد وحی کے نزول میں وقفہ پڑ گیا اور کچھ دنوں تک آپؐ پر وحی نازل نہ ہوئی۔"

اور اس انقطاع وحی کے وقفہ میں شاہ صاحبؒ کا بیان ہے کہ :

"آپؐ کو یہ فرشتہ (ناموس اکبر یا جبرئیل علیہ السلام) کبھی تو زمین و آسمان کے درمیان نہایت شان کے ساتھ کرسی پر بیٹھا نظر آتا، اور کبھی وہ آپؐ کو مسجد حرام میں کھڑا دکھائی دیتا، جس کی کمر کعبہ شریف کی بلندی تک پہنچی ہوئی دکھائی دیتی۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی کیفیت کیا ہوتی تھی" شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ :

" آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہؐ! آپ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا کبھی مجھ کو گھنٹی بجنے کی سی آواز سنائی دیتی ہے، یہ میرے لئے وحی کی سخت ترین قسم ہے جب یہ حالت مجھ سے زائل ہو جاتی ہے تو جو کچھ فرشتہ نے کہا ہوتا ہے وہ میرے ذہن میں محفوظ ہو چکا ہوتا ہے بعض اوقات فرشتہ میرے سامنے آدمی کی شکل میں متمثل ہوتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے وہ میں اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہوں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فرشتہ کے آدمی کی شکل میں متمثل ہونے کی تشریح کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں :

"تمثل اس وقت وقوع میں آتا ہے جب کہ عالم مثال اور عالم شہادت (بالفاظ دیگر عالم روحانی اور عالم مادی) کے احکام ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے ہوں، یہی وجہ ہے آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کے بعض صحابہ کرام کو تو فرشتہ وحی نظر آتا تھا لیکن بعض دوسرے صحابہ اس کے دیکھنے سے محروم تھے"۔(۱)

واضح رہے شاہ صاحبؒ کا یہ بیان ان متواتر احادیث کا خلاصہ ہے' جو نزول وحی سے متعلق تمام کتب احادیث میں موجود ہیں۔

تفہیمات الٰہیہ کی ۶۵ ویں تفہیم میں مختصراً" اسلامی عقائد ذکر کئے گئے ہیں جسے شاہ صاحب نے "اشهد الله ومن حضر من الملائكة والجن والانس انى اعتقد بصميم قلبى" کے الفاظ سے شروع کیا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں :

"اور قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی وحی ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف فرمائی' اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرماوے مگر یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے یا کسی فرشتہ کو بھیج دے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے پیغام پہنچا دیتا ہے۔" (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

یہ ہے "وحی کی حقیقت" اور اللہ تعالیٰ کے اسما وصفات میں کجروی جائز نہیں' اس لئے (وحی کا) اطلاق شرع پر موقوف ہے"۔

اور اس سے پہلے فرشتوں کا بیان ہے :

" اور اللہ تعالیٰ کے بہت سے فرشتے ہیں' بعض آسمان پر مقربان بارگاہ ہیں' بعض انسانوں کے اعمال نامے لکھنے پر مقرر ہیں'

---

(۱) اردو ترجمہ حجتہ اللہ البالغہ ج۲ ص ۸۰۲ تا ۸۰۴۔ از مولانا عبد الرحیم مرحوم۔ شائع کردہ قومی کتب خانہ۔ لاہور

بعض بندوں کی حفاظت پر' بعض خیر کی دعوت پر' بعض اس کام پر مقرر ہیں کہ بندوں کے دل میں خیر کی بات ڈالیں۔ ہر ایک کے لئے ایک معین مرتبہ ہے' اللہ تعالیٰ ان کو جو حکم دیں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جائے"۔

(تفہیمات الہیہ ج۱ ص۱۴۶)

اس سے آگے تفہیم میں شاہ صاحب نے بتلایا کہ ادلہ شرعیہ کے اعتبار سے ظاہر شریعت کے علی الترتیب یہ چار درجے ہیں :

۱۔ وہ مسائل جو قرآن حکیم میں منصوص ہیں بایں طور کہ اس کی مراد اہل لسان کے یہاں واضح ہے۔

۲۔ ....وہ مسائل جو احادیث مستفیضہ سے ثابت ہیں' یعنی وہ صحیح احادیث جو صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطامالک میں کم از کم تین صحابہ سے اختلاف فاحش کے بغیر مروی ہیں' اور اپنے مفہوم میں واضح ہیں۔

۳۔ ....وہ مسائل جو اخبار احاد سے ثابت ہیں اور صحابہ و تابعین کے جم غفیر کے آثار سے موید ہیں۔

۴۔ وہ مسائل جو استنباط صحیح اور قیاس جلی سے ثابت ہیں اور فقہا کی جماعت اس کی صحت پر متفق ہے' اس تفصیل کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں :

" یہ تمام مسائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح شریعت اور آپؐ کی سنت کا جداہ مستقیمہ ہے، جس کا رشد واضح اور اس کی قدر غالب ہے، جو شخص اس کے خلاف کہے گا اس کی بات اسی کے منہ پر رد کر دی جائے گی۔ قرآن کریم، حدیث مشہور، اجماع امت یا قیاس جلی کے خلاف کہنے والا قطعاً معذور نہیں بلکہ مردود ہے) البتہ اس کے ماسوا میں معذور قرار دیا جا سکتا ہے تاوقتیکہ حدیث اس کے سامنے نہ آ جائے اور حجاب مرتفع نہ ہو جائے، پھر معاملہ واضح ہو جانے کے بعد اس کے مقلد کا عذر بھی مسموع نہیں وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں حدیث پر عمل نہیں کرتا بلکہ اپنے امام کے قول پر عمل کرتا ہوں خواہ صحیح دلیل اس کے خلاف ہو۔ سو تم پر لازم ہے، کہ شریعت کے جو مسائل اس مرتبہ میں ثابت ہیں انہیں خوب غور و فکر سے غیر منصوص مسائل سے ممتاز کرو، انہیں ہر دم پیش نظر رکھو، انہیں اپنے دل میں خوب بٹھا لو، پھر انہیں دانتوں سے مضبوط پکڑ لو اور ہاتھوں کی پوری قوت سے ان کا دامن تھام لو اور جو اس کے خلاف کہے کبھی اس کی طرف کان بھی نہ دھرو۔"

(تفہیمات الٰہیہ ج ا ص ۱۵۵)

ادارہ تحقیقات اسلامی پاکستان کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی انگریزی کتاب "اسلام" اپنی زبان، انداز نگارش اور طرز استدلال ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ مندرجات اور مرکزی کردار کے اعتبار سے بھی استشراقی افکار کا خلاصہ ہے۔ گولڈ تسہیر سے پروفیسر شاخت تک مستشرق ملاحدہ نے اسلام اور رجال اسلام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ رد و قبول اور تنقیح و تہذیب کے بعد مصنف نے اسے

اسلامی تعبیر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اسے آپ استشراق کا اسلامی ایڈیشن کہہ لیجئے یا اس کا نام "اسلام کا استشراقی ایڈیشن" رکھ لیجئے، ہو سکتا ہے کہ اس تصنیف سے مستشرق برادری میں مصنف کا نام بلند ہو گیا ہو اور جو حضرات "وحدت ادیان" کے فلسفہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس تصنیف کے ذریعے مشرق و مغرب کا ذہنی فاصلہ سمٹتا ہوا دیکھ کر ان میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ہو، مگر یہ بھی احتمال ہے کہ اہل نظر مستشرقین بھی اس ملغوبے کو پسندیدہ نظر سے نہ دیکھیں، جس طرح شیخ ابو علی سینا نے "فلسفہ ارسطو" کو مسلمان بنانے کے لئے اسلام اور فلسفہ سے ملا جلا معجون مرکب تیار کر ڈالا تھا، اس سے اسلامی حلقے تو نالاں تھے ہی، خود فلاسفہ نے بھی اسے فلسفہ ارسطو پر ظلم قرار دیا اور ابن رشد وغیرہ نے اس پر گرفت کی۔

لیکن اس کتاب میں اسلام اور اسلامی عقائد بالخصوص وحی و نبوت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار انہوں نے کیا ہے انہیں تسلیم کر لینے کے معنی اسلام پر خط تنسیخ کھینچ دینے کے ہیں اس لئے اسلامی حلقوں میں اس کی پذیرائی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ پاکستان میں اس کے متعارف ہوتے ہی اس کے خلاف رد عمل شروع ہوا اور یہاں کے تمام مسلمان حلقوں کی جانب سے اس پر اظہار نفرین کیا گیا۔ مصنف نے جو خوش فہمی کی بنا پر اسلامی حلقوں میں بھی اس کی مقبولیت کے متمنی ہیں، اس سلسلہ میں اخبارات کو ایک معذرتی بیان دیا ہے کہ وحی کے بارے میں انہوں نے جو خیالات پیش کئے ہیں، کچھ اسی قسم کے خیالات ان سے پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی اور بعض دیگر مسلم مفکرین بھی پیش کر چکے ہیں اور انہوں نے یہ سب کچھ گویا ان بزرگوں کی تقلید و تتبع میں کہا ہے۔"

جس طرح بعض حقائق اپنی فطری صداقت میں کسی دلیل کے محتاج نہیں ہوتے، بلکہ وہ بذات خود اتنے ٹھوس اور مبنی بر صداقت ہوتے ہیں کہ سلیم طبائع

انہیں بلا دلیل بغیر کسی ہچکچاہٹ کے قبول کر لیتی ہیں' اسی طرح بعض مفروضے بدیہی طور پر اس قدر غلط ہوتے ہیں اور انہیں سنتے ہی آدمی پکار اٹھتا ہے "سبحانک ھذا بھتان عظیم" ڈاکٹر صاحب اپنی اس "معذرت" سے ممکن ہے بعض ایسے بزرگوں کو اطمینان دلانے میں کامیاب ہو سکے ہوں جنہیں معلوم نہیں کہ شاہ ولی اللہ کون تھے' اور کیا تھے؟ لیکن جن لوگوں کو شاہ صاحبؒ صحیح مطالعہ کا تھوڑا بہت موقعہ ملا ہے وہ ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کو "عذر گناہ" کی مجبوری تو تسلیم کر سکتے ہیں' لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ شاہ صاحب کو بھی ڈاکٹر صاحب کی ان تحقیقات کا موید مان لیں ——— کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی طرح شاہ صاحبؒ بھی:

۱۔ قرآن کو پورے کا پورا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام کہتے ہوں؟

۲۔ قرآن مجید کو نبی کے احساسات وخیالات اور شعور سے ابھری ہوئی آواز قرار دیتے ہوں۔

۳۔ فرشتہ وحی (جبرئیل) کے وجود خارجی کے منکر ہوں اور ملاءِ اعلیٰ سے نزول وحی کا مذاق اڑاتے ہوں؟

۴۔ تمام ذخیرہ احادیث کو' جن میں وحی اور فرشتہ وحی کا ذکر آتا ہے' معاذ اللہ من گھڑت افسانہ قرار دیتے ہوں؟

۵۔ اسلام کے بنیادی عقائد کو ناپختہ عقل نادانوں کی خود تراشیدہ داستان تصور کرتے ہوں؟

۶۔ اسلام کے کروڑوں علمأ صلحا اور فقہأ و محدثین کو "ناپختہ عقل" یقین کرتے ہوں؟

۷۔ عقیدہ تقدیر' معراج' شفاعت' نماز پنج گانہ' نزول عیسیٰ علیہ السلام جیسے قطعیات کی نفی کرتے ہوں؟

۸۔ قرآن کے ذکر کردہ واقعات کی تاریخی صحت کو مشکوک اور مشکلات سے لبریز مانتے ہوں؟ وغیرہ ذالک من الھفوات والطامات۔

اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو ڈاکٹر صاحب کے اس معذرتی بیان کو ان کے سوا اور کیا کہا جائے لقد جئتم شیئا ادا۔

....

دراصل "کج ذہن" سے غلط نظریات اگلنا اور ان پر قابل احترام بزرگوں کے نام لپیٹ کر مسلمانوں کے حلق میں اتارنا اہل زیغ کی قدیم عادت ہے' ہوتا یہ ہے کہ لوگ ادھر ادھر سے غلیظ نظریات کی پوٹ جمع کر لیتے ہیں اسے تاویل و تحریف کی غلط منطق سے حسین و جمیل پردوں میں لپیٹ کر امت اسلامیہ کے سر دھرنا چاہتے ہیں اور جب یہ طلسمی پردہ چاک ہوتا نظر آتا ہے تو مسلمہ شخصیتوں کا نام لے کر باطل کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا جاتا ہے۔ یاد ہوگا کہ یہود و نصاریٰ تحریف شدہ یہودیت و نصرانیت کی ترویج کے لئے اس پر ابراہیمی چھاپ لگا دینا ضروری سمجھتے تھے' قرآن حکیم نے ان کی اس غلط منطق پر گرفت کرتے ہوئے فرمایا :

"یا اھل الکتاب لم تحاجون فی ابراھیم وما انزلت التوراۃ والانجیل الا من بعدہ افلا تعقلون۔"

(آل عمران۔ ۶۵)

ترجمہ :"اے کتاب والو! ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں ناحق حجت بازی کیوں کرتے ہو حالانکہ تورات و انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئیں۔ تمہیں اتنی بھی عقل نہیں۔"

اس امت میں جن باطل فرقوں نے جنم لیا (جنہیں ملت اسلامیہ کے گندے غدود کہنا صحیح ہوگا) وہ بھی اپنے ملحدانہ معتقدات کی ترویج کے لئے یہی حربہ استعمال کرتے تھے' کہیں تاویل و تحریف کی سان پر چڑھا کر کتاب و سنت کے کس بل نکالے جا رہے ہیں اور انہیں توڑ مروڑ کر عقائد باطلہ پر منطبق کیا جا رہا ہے' کہیں ائمہ ھدیٰ

کا تمسخر کیا جا رہا ہے، کہیں قابل احترام اکابر کی طرف ان مزخرفات کی جعلی نسبت کی جا رہی ہے، اور ان کی سیدھی سادی عبارتوں کو ایسے معنی پہنائے جا رہے ہیں، جن کی ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو گی۔ "صوفی نما" ملحدین کے عقائد پر بحث کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ نے صحیح لکھا ہے:

وهذا بناء على اصول هولاء الفلاسفة الكفار الذين هم اكفرمن اليهود والنصارىٰ الذين سلك هولاء سبيلهم ولكن غيروا عبارتهم فاخذ عبارات المسلمين الموجوده فى كلام الله ورسوله وسلف الامة وعلمائها وعباده ومن دخل فى هولاء من الصوفية المتبعين للكتاب والسنة كالفضيل بن عياض، وابى سليمان الدارانى والسرى السقطى، والجنيد وسهل بن عبد الله وغيرهم، اخذوا معانى اولئک الملاحدة فعبروا عنها بالعبارات الموجوده فى كلام من هومعظم عند المسلمين، فيظن من سمع ذالک ان اولئک المعظمين انما عنوا بهذه العبارات الموجودة فى كلامهم ماارادهٰولاء الملحدون كما فعلت ملاحدة الشيعة الاسماعيليه ونحوهم۔

(الرد على المنطقيين ص۴۸۸)

ترجمہ: "یہ تمام نظریات ان بے ایمان فلسفیوں کے اصول پر مبنی ہیں، جو یہود و نصاریٰ سے بڑھ کر کافر ہیں، اور جن کے راستے پر یہ

ملحدین چل رہے ہیں، لیکن انہوں نے تلبیس کی غرض سے فلسفہ کی تعبیرات کو بدل کر ان کی جگہ اسلامی تعبیرات کو اختیار کیا جو اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ و تابعینؒ علما و عبادؒ اور حضرات صوفیا جو کتاب و سنت کے متبع تھے جیسے فضیل بن عیاض، ابو سلیمان دارانی، سری سقطی جنید بغدادی، سہل تستری وغیرہ کے کلام میں پائی جاتی تھیں۔

چنانچہ ان لوگوں نے ملاحدہ کے نظریات کو لے کر انہیں ایسی تعبیرات سے ادا کیا جو مسلمانوں کے قابل احترام اکابر کے کلام میں موجود تھیں، تاکہ سننے والوں کو یہ مغالطہ دیا جا سکے کہ ان بزرگوں کے کلام کی مراد بھی وہی ہے جو ان ملحدین کا مقصود ہے یہی طرز عمل اسماعیلی ملاحدہ اور دوسرے باطنیہ کا تھا۔"

اور یہی شکایت مولانا رومیؒ کو بھی کرنا پڑی۔

حرف درویشاں بدزددو مرد دوں
تابہ پیش جاہلاں خواند فسوں

فکر و نظر کے مدیر محترم پروفیسر محمد سرور صاحب نے بھی جن کے علم و فضل کا مجھے احترام ہے وکیل صفائی کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کی حمایت میں فکر و نظر کے صفحات کو اپنی نگارشات سے مزین فرمایا ہے، ان سے تفصیلی گفتگو کسی دوسری صحبت میں ہو گی۔ سردست اتنی گزارش کافی ہو گی کہ خلط مبحث ان جیسے فاضلوں کو زیبا نہیں، اوپر ڈاکٹر صاحب کے خیالات کا جو ملخص پیش کیا گیا ہے اگر سطعات و ہمعات کے کسی گوشے میں یہی خیالات شاہ صاحبؒ کے بھی ان کی نظر سے گزرے ہوں تو

نشاندہی فرمائیں، اضافہ معلومات پر ہم ان کے ممنون ہوں گے، ورنہ ڈاکٹر صاحب کی حمایت میں شاہ صاحبؒ کے اسرار عالیہ کی بے موقع نقل پر:

ع آنچہ مردم میکنند بوزینہ ہم میکند

کی مثل صادق آتی ہے۔

(ماہنامہ بینات کراچی رجب ۱۳۸۸ھ)

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا الحاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد :

مسٹر پرویز کے خلاف حضرت بنوری نور اللہ مرقدہ نے جو اقدام کیا اس کا پس منظر یہ تھا کہ صدر ایوب خان "فیلڈ مارشل" بن جانے کے بعد "مسند اجتہاد" پر بھی قابض ہو چکے تھے۔ اور رفتہ رفتہ اسی راستے پر گامزن تھے جس پر مغل شہنشاہ اکبر اعظم چل نکلا تھا چونکہ مسٹر پرویز نے انہیں "مرکز ملت" کی حیثیت سے نہ صرف دین میں تغیرو تبدل کے اختیارات سونپ دیئے' بلکہ دور جدید کے "خدا اور رسول" کا منصب بھی عطا کر دیا تھا۔ اس لئے صدر ایوب ان دنوں ایک "سرکاری دارالافتاء" قائم کرنے کی فکر میں تھے' جس کا "مفتیٔ اعظم" مسٹر پرویز کو بنایا جانا تجویز ہو چکا تھا۔ مولانا شبیر علی تھانوی مرحوم نے حضرت بنوری رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے صورت حال کا سارا نقشہ رکھا۔ اور اس شر کے سدباب کے لئے کسی مؤثر اقدام کی اپیل کی۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے علمائے اسلام کا متفقہ فتویٰ "پرویز کافر ہے" مرتب کر کے اس عظیم ترین سازش کو خاک میں ملا دیا۔ عام پبلک پر مسٹر پرویز کی حقیقت واضح ہو گئی' اور ارباب اقتدار اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئے۔ اب انہوں نے اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ کراچی میں ایک "مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی" قائم کیا۔ اس میں اسلام پر تحقیقات کرنے کے لئے چن چن کر ایسے افراد بھرتی کئے گئے جن میں اکثریت کجرو اور کج فہم ملاحدہ کی تھی اور پھر اس ادارہ کی سربراہی کے لئے میکگل یونیورسٹی کے ایک مستشرق کو امریکہ سے

در آمد کیا گیا۔ یہ شخصیت ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کو "ادارہ تحقیقات اسلامی" کے ذریعہ کیا کام تفویض کیا گیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لئے میں جناب حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کے ایک مکتوب کا جو انہوں نے ۲۰ ذوالحجہ ۱۳۶۴ھ کو حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا' اقتباس نقل کرتا ہوں۔ موصوف لکھتے ہیں۔

> "کئی سال ہوئے ایک بہت بڑے مسلمان سرکاری عہدے دار نے جو غالباً "سر" کا خطاب بھی رکھتے ہیں۔ مجھ سے دوران گفتگو کہا تھا کہ آپ لوگ اور آپ کے یہ مذہبی گھروندے (مدرسے اور خانقاہیں) صرف ہندوستان (متحدہ ہندوستان) میں باقی ہیں کہ انگریزی حکومت کی پالیسی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ جس دن یہ پالیسی ہمارے ہاتھ میں آجائے گی۔ ہم آپ لوگوں اور آپ کے ان اڈوں کو ختم کر دیں گے اور "مداخلت فی الدّین" کے نعروں سے آپ عوام میں جو ہیجان' انگریز یا ہندو کے خلاف پیدا کر دیتے ہیں۔ ہمارے خلاف پیدا نہیں کر سکیں گے۔ ہم جو کچھ کریں گے مسلمان قوم کو ساتھ لے کر کریں گے اور رائے عامہ کو اتنا زیادہ تیار کریں گے کہ وہ آپ لوگوں کو اپنے مفاد کا دشمن اور قابل قتل سمجھنے لگیں گے۔ جیسا کہ ٹرکی میں ہو چکا ہے۔" (انوار عثمانی ص ۱۵۲)

یہ تھی دراصل ادارہ تحقیقات اسلامی کے قیام اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے پاکستان میں تشریف لانے کی اصل غرض و غایت یعنی اسلام اور حاملان اسلام کے خلاف مسلمانوں کے ذہن تیار کرنا' عوام کی ذہنیت کو اس سطح پر لے آنا

کہ وہ اسلام اور علمائے اسلام کو اپنے مفاد کا دشمن اور قابل قتل سمجھنے لگیں۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے سب سے پہلے تو یہ کوشش کی کہ علمائے کرام کو مطمئن کیا جائے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں یا جو کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس میں بد نیتی یا کجروی کا شائبہ تک نہیں ہے بلکہ وہ سرکاری وسائل سے اسلام کی خدمت کرنا' اور اسلامی معاشرے کی جڑوں میں اسلام کو پیوست کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ حضرت بنوری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور آپ سے تعاون کی درخواست کی۔ آپ نے اس کار خیر میں ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ ایک بار ادارہ تحقیقات اسلامی میں ڈاکٹر صاحب کی درخواست پر تشریف لے گئے اور وہاں ان خطوط کی نشاندہی فرمائی جن پر اس ادارہ کو کام کرنا چاہئے (یہ تقریر "ماہنامہ بینات" ربیع الاول ۱۳۸۳ھ میں چھپ گئی تھی)۔

ادھر ڈاکٹر صاحب علماً کے اطمینان کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر دوسری جانب انہوں نے اور ان کے ادارہ کے دیگر اہل قلم نے اسلام کی تحریف کے طومار کرنے شروع کر دیئے۔ مسلمانوں کے اسلام کے لئے "روایتی اسلام" فرسودہ اسلام "جامد اسلام" جیسی اصطلاحات استعمال کرنا شروع کر دیں۔ ذخیرہ احادیث کو قرون وسطیٰ کی پیداوار بتایا گیا۔ اسلامی شریعت کا ماخذ رومن قانون کو بتایا گیا۔ قرآن کریم کو پیغمبر کے اندرونی احساسات کی آواز ٹھہرایا گیا۔ سود اور شراب کی حلت کے فتوے صادر کئے گئے۔ وغیر ذالک من ا لکفریات۔

خلاصہ یہ کہ "فیلڈ مارشل" صاحب جو کام مسٹر پرویز سے لینا چاہتے تھے۔ اس کے لئے ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور ان کے "ادارہ تحقیقات اسلامی" کی خدمات حاصل کی گئیں۔ نشہ اقتدار کی بدمستی' سرکاری ذرائع کی فراوانی اور دین' اور اہل

دین سے عناد نے جب ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے الحاد و کج روی سے عقد کیا تو دین اور اہل دین پر قیامت ٹوٹ گئی، اور صاف نظر آنے لگا کہ یہاں بھی دین کا وہی حشر ہونے والا ہے جو مصطفیٰ کمال کے دور میں ترکی میں ہو چکا تھا۔ صورت حال اتنی بھیانک اور ایسی حوصلہ شکن تھی کہ مجھے خوب یاد ہے کہ نماز کے بعد اسلام کی زبوں حالی کو دیکھ کر ہم لوگ رو پڑتے تھے۔ "وبلغت القلوب الحناجر و تظنون باللہ الظنونا" میں قرآن کریم نے جس حالت کا نقشہ کھینچا ہے بلا مبالغہ ٹھیک وہی کیفیت ہم پر طاری تھی۔

حق تعالیٰ حضرت بنوری رحمتہ اللہ علیہ کی قبر پر رحمت کی بارشیں برسائے، انہوں نے بے خوف و خطر اس آتش نمرود میں کود جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اپنی ساری توانائیاں اس فتنہ کا سر کچلنے پر صرف کر دیں۔ انہوں نے جس جذب و سرمستی، جس عزم و عزیمت اور جس دلیری و شجاعت کے ساتھ اس فتنہ کے خلاف آواز اٹھائی، وہ خاصان حق ہی کا خاصہ تھا۔ انہوں نے اس شدت سے حق و صداقت کا صور پھونکا کہ اس کی آواز سے پورا ملک لرز اٹھا۔ ادھر "ادارہ تحقیقات اسلامی" کے آرگن "فکر و نظر" میں الحاد و زندقہ کی نئی نئی صورتیں ڈھل کر سامنے آتیں، اور ادھر "بینات" میں ان پر "ضرب حیدری" لگائی جاتی:

نوارا تلخ تری زن چوں ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترے خواں چوں محمل راگراں بینی

"فیلڈ مارشل" صاحب کے مطلق العنان اجتہاد اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی ملحدانہ تحریفات کے خلاف حضرت بنوری نور اللہ مرقدہ کی یہ جنگ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۸ء تک مسلسل چھ سال تک جاری رہی۔ اس میں کیا کیا مسائل زیر بحث آئے اور حضرت کے شعلہ فشاں قلم نے الحاد و زندقہ کے ایوانوں کو کس کس طرح

خاکستر کیا۔ (یہ ساری روئیداد ماہنامہ بینات کے فائلوں میں محفوظ ہے) اس کا صرف ایک نمونہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

"ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی ملحدانہ چیرہ دستیوں نے بڑھتے بڑھتے صحیفہ مقدس اور وحی الٰہی پر جا ہاتھ ڈالا تھا' اور اساتذہ مغرب کی تقلید میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ قرآن کا کوئی خارجی وجود نہیں تھا' نہ کوئی فرشتہ وحی لے کر آتا تھا' یہ سب نعوذ باللہ افسانے ہیں' آنحضرت کے وجدان اور ضمیر سے جو آواز اٹھتی تھی وہی وحی تھی' اور وہی قرآن کہلاتا تھا۔"

حضرت بنوری قدس اللہ سرہ العزیز نے جب یہ تحریر پڑھی تو بے چین ہو گئے' بینات رجب ۱۳۸۸ھ کے "بصائر و عبر" میں وحی الٰہی کی حقیقت پر قلم اٹھایا اس کی تمہید یہ اٹھائی:

"انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں تمام اسلامی حقائق کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ اور باطنیت و الحاد کا جو فتنہ ہزار برس پہلے ظہور پذیر ہو چکا تھا۔ آج تمام عالم اسلام میں پھیل گیا ہے۔ ......ملاحدہ نے آج میدان کو خالی دیکھ کر اور فضاء کو ساز گار سمجھ کر وہ شگوفے کھلانے شروع کر دیئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے "تحریف دین" کا نام "تحقیق اسلام" ہے "الحاد فی الدین" کا نام "اظہار حقیقت" ہے۔ حقائق دین کو اس طرح پامال ہوتا دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کیا کیا جائے۔

"از ماست کہ برماست" اسلام کی غربت و بے چارگی کا یہ دور انتہائی

حسرت ناک بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"

اس تمہید کے بعد قرآن کریم کی آیات سے "وحی" کی تشریح فرماتے ہیں، وحی کے اوصاف و خصوصیات تفصیل سے ذکر کرتے ہیں اور آخر میں لکھتے ہیں:

" سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یہ سب کچھ ایمانی بصیرت اور ایمانی نور سے محرومی کا نتیجہ ہے، یا پھر ان حقائق الٰہیہ سے جہل عظیم کا ثمرہ ہے۔ خدارا انصاف کیجئے! کہ تمام قرآن اور تمام وحی کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقی تجربہ اور توسیع ذات بتلایا جائے کیا یہ صریح گمراہی نہیں؟........ حقائق بین نگاہیں محسوس کرتی ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے دین اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ارشادات کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ اور اپنے سلف مستشرقین کی دلی آرزوؤں کو پورا کر کے وہ کام انجام دے رہے ہیں جو ان سے نہ ہو سکا۔"

یہ ڈاکٹر صاحب کے خلاف حضرت رحمتہ اللہ علیہ کا آخری اداریہ تھا۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں۔ چھ سال تک مسلسل حضرت رحمتہ اللہ علیہ اس فتنہ کے قلع قمع کے لئے سرگرم رہے۔ اور اس تندہی، تلخی، اور تیزی سے اس پر پے در پے ضربیں لگاتے رہے کہ پورے ملک میں اس کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور "فیلڈ مارشل" کا مطلق العنان اقتدار اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا "جدت پسند اسلام" اس طوفان کے تھپیڑوں میں ہچکولے کھانے لگے۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب "اسلامی تحقیقات" کے منصب سے معزول ہو گئے۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ اس آخری اداریے میں، جس کا اقتباس اوپر نقل کر چکا ہوں۔ لکھتے ہیں:

" یہ سطریں زیر قلم تھیں کہ یہ معلوم ہوا کہ "ادارہ تحقیقات

اسلامی" کے ڈائریکٹر' جو ان لغویات کے علمبردار تھے' عوام کے احتجاج پر اپنے منصب سے برطرف کردیئے گئے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس وقت تک ان کی رہنمائی میں "ماہنامہ فکر و نظر" اور "اسلام" وغیرہ کتابوں کے ذریعے جو بیج ڈالا گیا ہے اس کا کیا' کیا جائے گا؟

اب تک جتنا لٹریچر ظہور میں آیا ہے وہ "غرق مے ناب اولیٰ" کا مصداق ہے' جب تک اس کو دریا برد نہ کیا جائے اس وقت تک کیا اطمینان ہے کہ آئندہ پھر کچھ نہیں ہوگا۔ اور ان تحریفات و الحاد پر اس وقت تک پاکستان کے خزانے کا جو لاکھوں روپیہ خرچ کیا گیا' اس کا کیا تدارک کیا جائے گا؟ اور جو ہم خیال اسٹاف اپنے اردگرد جمع کیا تھا اس کا کیا حشر ہوگا؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ ادارہ "امین" ہاتھوں میں دیا جائے اور ان کی علمی و دینی معاونت کے لئے علمائے امت میں سے معتمد ترین افراد کا انتخاب کیا جائے۔ جن کے علم و تقویٰ پر امت کو اعتماد ہو اور وہ شرعی مسائل معلوم کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہوں۔

اور یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ان تحقیقات کے لئے دائرہ عمل متعین کیا جائے اور دین کے مسلمات کو زیر بحث لانے کی اجازت نہ دی جائے۔ جب تک یہ روک تھام نہ ہوگی اس وقت تک قابل اطمینان صورت ملک میں پیدا نہ ہوگی۔"

لیکن افسوس ہے کہ اقتدار نے اس مخلصانہ نصیحت کو گوشِ ہوش سے سننا

گوارا نہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے ''مربی و محافظ'' فیلڈ مارشل کی بساط اقتدار بھی الٹ گئی:

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(از بینات اشاعت خاص حضرۃ بنوری رحمتہ اللہ علیہ نمبر)

وزیر قانون اور ادارۂ تحقیقات اسلامی

امت اور علما امت کے لئے لمحہ فکریہ

یکم ستمبر کے اردو' انگریزی اخبارات میں وزیر قانون جناب ایس ایم ظفر کی پریس کانفرنس شائع ہوئی ہے جس میں آپ نے پریس کو بیان دیتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامیہ نے اسلامی قانون کی جامع کتاب کے مدون کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور یہ کہ منصوبہ چار سال میں مکمل ہو گا۔

جناب وزیر قانون نہ صرف یہ کہ اپنی ذاتی صلاحیت' قانونی مہارت اور منصبی وجاہت کے اعتبار سے احترام کے مستحق ہیں بلکہ خاندان نبوت کے چشم و چراغ ہونے کی حیثیت سے بھی ملت اسلامیہ کے جذبات عقیدت ان سے وابستہ ہو سکتے ہیں لیکن ان کے اس بیان سے بعض خلجان پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے' اس لئے ان کا بیان کر دینا بے محل نہ ہو گا تاکہ ان پر غور کر لیا جائے۔

ا: ـــــــسب سے اول تو یہی ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامیہ کا پورا عملہ اسلام کے فلسفہ حیات پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ امت کے چودہ سو سالہ اسلام کو راسخ العقیدہ گروہ کا اسلام اور "تشکیلی دور کے بعد کا اسلام" قرار دیتا ہے۔ ادارہ کے آرگن "فکرو نظر" کے مطالعہ سے ہر شخص بخوبی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس ادارہ کا مجموعی مزاج اسلامی ورثہ کو "دفتر پارینہ" قرار دے کر بحث و نظر کا موضوع بنانا ہے۔ اگر اس ادارہ کی یہ روایات آئندہ بھی قائم رہیں تو ان کے مرتب کردہ مجموعہ قانون کی اسلامی نقطہ نظر سے کیا حیثیت ہو گی' اور امت مسلمہ کو اس پر کیسے اعتماد ہو گا؟

۲: ـــــ وزیر موصوف نے اپنے بیان میں اس امر کی وضاحت بھی فرمائی ہے کہ اس مجموعہ قانون میں مغربی مستشرقین کی آرا اور تحقیقات سے استفادہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ اسلام کے حق میں متعصب واقع ہوئے ہیں۔ ان کا یہ ارشاد نہایت حکیمانہ اور دانشمندانہ تصور کیا جائے گا، لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈاکٹر صاحبان خود بھی مستشرقین ہی کے بلاواسطہ یا بالواسطہ فیض یافتہ ہیں اور اگر گہری نظر سے مستشرقین کی آرا وافکار اور ان مستشرقین کے نظریات کا مقابلہ کیا جائے تو یہ امر کھل کر سامنے آئے گا کہ مستشرقین کے ان شاگردان عزیز کا رویہ اپنے اساتذہ سے کسی قدر سخت تو ہو سکتا ہے لیکن نرم کسی درجہ نہیں۔اس کی شہادت کے لئے صرف ادارہ کے سربراہ جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے اس مقالہ کا مطالعہ کافی ہے جو انہوں نے ''اسلام پر تجدد پسندی کے اثرات'' کے عنوان سے پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ میں پڑھا اور ادارہ کے ترجمان ''فکرونظر'' نے اپنی تازہ اشاعت (جولائی و اگست ۱۹۶۶ء) میں اسے شائع کیا ہے اس مقالہ میں انہوں نے اسلام اور امت مسلمہ کے خلاف جو زہر افشانی کی ہے اس کے پڑھنے سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی ذہنیت ادارہ کے باقی عملہ میں بھی کارفرما ہے۔ اندریں صورت ان ڈاکٹروں کی آرا سے استفادہ کرنا اور مستشرقین پر تعصب اسلام کی فرد جرم عائد کرنا کہاں تک صحیح ہو گا۔

ہمارے وزیر محترم کو شیخ سعدیؒ کا یہ حکیمانہ فقرہ سامنے رکھنا چاہئے تھا:

افعی کشتن و بچہ اش نگاہ داشتن کار خردمنداں نیست

ترجمہ ''سانپ قتل کرنا اور سانپ کے بچہ کی پرورش کرنا عقل مندی نہیں''۔

۳: ـــــ وزیر محترم نے اپنی پریس کانفرنس میں اسلامی زندگی کو اپنانے کے سوال پر

زور دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ اسلام ہی ئ وحدت مشرقی اور مغربی پاکستان کو متحد کر سکتی ہے۔ان کا یہ ارشاد بھی سوفیصد صحیح اور قابل تعریف ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سا اسلام ہے جو اتحاد پاکستان کی ضمانت کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ؟راسخ العقیدہ گروہ کا روائتی اسلام" یا "ادارہ تحقیقات اسلامی کا پیش کردہ جدید اسلام" اگر ثانی الذکر کے متعلق یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ وہی پاکستان کے دونوں بازوؤں کو متحد رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا تو ممکن ہے کہ یہ مفروضہ واقعات سے کوئی مطابقت رکھتا ہو۔ لیکن ہمارے نزدیک اسے نری خوش فہمی سے زیادہ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے کہ ملت اسلامیہ کا رشتہ اتحاد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا حقیقی اسلام جو چودہ صدیوں سے متوارث چلا آتا ہے تو ہو سکتا ہے،مگر دور حاضر کے مفکرین کی آراؤ اہوآ کا خود تراشیدہ اسلام کبھی اتنا وزنی نہیں ہو سکتا کہ اسے اتحاد کا ضامن قرار دیا جاسکے۔

۴ :-----وزیر موصوف نے اپنے بیان میں ان موضوعات کی نشاندہی بھی فرمائی ہے جن پر خامہ فرسائی کی جائے گی۔ اس سلسلے میں جو فہرست پیش کی گئی ہے' ہمارے خیال میں وہ قطعی نامکمل ہے۔ اسلامی قانون کی تدوین سے پہلے اس کے اصول موضوعہ کا طے کرلینا ایک فطری اصول ہے' اس کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ تحریف و الحاد پر قلم اٹھایا جائے۔ نیز اس امر کی وضاحت کی جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ کو من و عن قبول کیا جائے گا' یا اس کے لئے نئی جرح و تعدیل کا راستہ کھولا جائے گا (جیسا کہ ادارہ تحقیقات اسلامی اس کی وضاحت کر چکا ہے)۔

نیز اس امر کی وضاحت بھی کی جائے کہ امت مسلمہ اور ائمہ دین کے اجماعی فیصلوں کو کیا مقام دیا جائے گا؟ کیا ان کو بدستور رکھا جائے گا' یا ان کو تبدیل کرنے کی

جرأت کی جائے گی (جیسا کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کا موقف ہے)۔

نیز اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ائمہ اربعہ کے فیصلوں کے مقابلہ میں اقوال شاذہ کو ترجیح دینے کا طریق اختیار کیا جائے گا یا ائمہ اربعہ کی تشریح کو حجت قرار دیا جائے گا۔

نیز اس امر کی وضاحت بھی ہونی چاہئے کہ قرآن و سنت کے مسائل کے اخذ کرنے کے لئے کیا اصول ہوں گے۔ سلف کا مرتب کردہ اصول فقہ قابل قبول ہو گا' یا اس کے لئے نیا اصول فقہ وضع کیا جائے گا' اور یہ کہ قرآن و حدیث کے نصوص کو علیٰ حالہ قائم رکھا جائے گا یا معاشرتی تغیرات کی آڑ میں ان پر نسخ و مسخ کا عمل جاری کیا جائے گا؟ قرآن و سنت کے فیصلوں کو قانون کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے گا یا انہیں ادارہ تحقیقات اسلامی کے بقول صرف ایک گونہ نظیر قرار دیا جائے گا؟

۵ :۔۔۔۔۔ادارہ تحقیقات اسلامیہ کی جانب سے زکوٰۃ' سود' حدود' شراب' تصاویر' اور عائلی قوانین وغیرہ کے بارے میں اس وقت تک جو تحریفات کی جا چکی ہیں۔ کیا انہیں اس "جامع کتاب" میں مسلمہ حیثیت سے لے لیا جائے گا یا انہیں بالکل رد کر دیا جائے گا؟۔

۶ :۔۔۔۔ وزیر موصوف نے اس امر کی تصریح بھی فرمائی ہے کہ اس مجلس تدوین میں قدیم و جدید دونوں قسم کے علما سے استفادہ کیا جائے گا یہ نکتہ بھی اپنی جگہ بڑی گہری حقیقت رکھتا ہے بلاشبہ جدید زندگی کے پیدا کردہ مسائل کا حل ڈھونڈنے کی بجائے قدیم و جدید علما کا سر جوڑ کر غور و فکر کرنا بڑی ضروری چیز ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں چند امور کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہو گا :

الف :۔۔۔۔ جدید مسائل کے حل تلاش کرنے کے لئے جن علمائے قدیم و جدید کا

انتخاب عمل میں لایا جائے گا۔ ان کے لئے کن معیاری صفات کا لحاظ رکھا جائے؟۔ اس امر کا لحاظ رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ اسلامی مسائل پر غور کرنے کے لئے صرف معلومات اسلامیہ پر عبور کو کافی قرار نہیں دیا جا سکتا(کیونکہ یہ عبور تو کسی غیر مسلم کو بھی حاصل ہو سکتا ہے' بلکہ اس کے لئے شریعت اسلامیہ میں جن شرائط کالحاظ رکھا گیا ہے انہیں سامنے رکھنا بھی ضروری ہو گا۔ ورنہ بہ فحوائے حدیث نبوی "اذا وسد الامر الیٰ غیر اھلہ فانتظر الساعۃ" (جب امور نااہلوں کے سپرد کر دیئے جائیں تو قیامت کا انتظار کرو) اس امانت کو ضائع کر دینے کے مترادف ہو گا۔

ب:۔۔۔ علمائے قدیم و جدید کے غور و فکر میں اختلافات کا پیدا ہو جانا ایک فطری امر ہے کیونکہ نقطہ نظر کا اختلاف' اختلاف فکر پر منتج ہوتا ہے۔ اس صورت میں رفع اختلاف کے لئے کیا طریقہ اختیار کیاجائے گا؟ کیا قدیم علما کی رائے کو قدامت پرستی کہہ کر تو نہیں ٹال دیا جائے گا؟

ج:۔۔۔۔اب تک علمائے قدیم و جدید کے نقطہ نظر میں اختلاف کی وجہ سے جو مسائل زیر بحث آ چکے ہیں' مثلاً عائلی قوانین ان میں اب تک حکومت کا رویہ علمائے قدیم کے نقطہ نظر کی ضد رہا ہے' کیا آئندہ بھی یہی روش باقی رکھی جائے گی یا اس میں کسی معتدبہ تبدیلی کا امکان ہے؟

یہ چند امور قابل غور ہیں جنہیں ٹھنڈے دل سے سامنے رکھنا ضروری ہے۔ تاہم اگر تحقیقات اسلامی کے ادارہ نے کسی ایسے قانون کی سفارش کی جو روایتی اسلام کی ضد ہو تو ہم ابھی سے واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ اسے کبھی دل سے قبول نہیں کرے گی بلکہ شدید اندیشہ اس امر کا ہے کہ اس سے امت مسلمہ کی وحدت اور پاکستان کے استحکام کو صدمہ پہنچے گا۔ حق تعالیٰ ہمیں اور ہمارے ملک کو ہر

طرح کے فتنہ سے محفوظ رکھے۔ آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه
محمد و آله واصحابه اجمعین۔

(ترجمان اسلام لاہور ۲۳ دسمبر ۱۹۶۶ء)

عمر احمد عثمانی کی تحریفات

صغر سنی کی شادیاں اور اسلام

حامداً و مصلیاً و مسلماً مثل مشہور ہے کہ بچھو سے کسی نے دریافت کیا کہ جناب کے معزز گھرانے میں "نیش زنی" کے فن میں سب سے بڑا ماہر کون ہے' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا' کہ جس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیکھو' وہی سب سے بڑھ کر ماہر فن ثابت ہو گا۔

اسلام کا نام لے کر اسلام کو ڈسنا' اسے تحریفی نشتر لگانا' اس پر جرح و تنقید کی مشق کرنا' اور محض مفروضات سے اس کے قطعی مسائل کو پامال کرنا ہر دور کے ملاحدہ اور زنادقہ کا طرۂ امتیاز رہا ہے' پہلی صدی کے خوارج ہوں یا مابعد کے باطینہ' تیسری صدی کے اصحاب العدل والتوحید ہوں' یا دور حاضر کے "ارباب فکر و نظر" دوسری صدی کا ابن المقفع ہو' یا چودھویں صدی کا اسلم جیراجپوری' اکبری دور کے ابوالفضل اور فیضی ہوں' یا ہمارے دور کے ڈاکٹر فضل الرحمان اور پرویز' سب کا مشترک مقصد' مشترک نقطہ نظر' اور مشترک سرمایہ اسلام کی مقدس چہار دیواری میں رخنہ اندازی کرنا رہا ہے۔

"ادارہ تحقیقات اسلامیہ راولپنڈی" نے شریعت محمدیہ اور دین اسلام میں شگاف ڈالنے کے لئے جو "مجلس ادارت" اور "بزم فکر و نظر" ترتیب دی ہے۔ اس

کے لئے چن چن کر زیادہ تر جغادری قسم کے متجددین کی بھیڑ جمع کی گئی ہے' اب یہ ادارہ ان ہی لوگوں کی تحقیقات کو تعمیر اسلام قرار دیتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے ادارہ کے رجال کار اور ان کے "تحقیقاتی شاہکار" کے کچھ نمونے امت مسلمہ کے سامنے رکھ دیئے جائیں' تاکہ انہیں اس ادارتی گلستان سے اس کی "تعمیری بہار" کا اندازہ کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے'۔

ادارہ تحقیقات کی "بزم فکر و نظر" کے ایک رفیق عمر احمد عثمانی صاحب ہیں۔ ادارہ تحقیقات میں ان کی شخصیت کس قدر مقبول ہے' اس کا اندازہ مدیر فکر و نظر کے مندرجہ ذیل الفاظ سے کیا جا سکتا ہے:۔

" ہمارے" فاضل و فقیہ مقالہ نگار نے عنوان بالا پر اپنے پُر مغز مقالے کی پہلی دو قسطوں میں آیات قرآنی اور ان کی ائمہ سلف کی تفاسیر کی روشنی میں یہ واضح کیا تھا۔ الخ

"ہمارے فاضل دوست کے طرز تحریر کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ مسئلے کے ہر گوشے پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنی ذاتی تنقید کو ائمہ سلف کی تنقیدات کا ہمیشہ تابع رکھتے ہیں۔"

(فکر و نظر ج ۲ ش ۵-۶ ص ۳۱۵)

(مدیر فکر و نظر کا یہ دعویٰ اپنے اندر کتنی صداقت رکھتا ہے۔ آئندہ سطور میں آپ کے سامنے جو حقائق آئیں گے' ان پر غور کرنے کے بعد اس کا فیصلہ آپ خود کر سکیں گے' واللہ الموفق۔)

اسی کے ساتھ "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" کا یہ "امتیازی وصف" بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ وہ مسٹر پرویز کی سلطنت کفر و الحاد میں برسوں تک وزارت عظمیٰ کے منصب

پر فائز رہے ہیں، اور ان کی تحریک مرکز ملت، و نظام ربوبیت "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" ہی کے دم قدم سے پروان چڑھی ہے، ملت اسلامیہ سے مسٹر پرویز کا رشتہ کٹ جانے کے بعد ان کی قلمی خدمات ادارہ تحقیقات کے لئے وقف ہو گئیں۔

فاضل مقالہ نگار کے چار ضخیم مقالے ادارہ تحقیقات راولپنڈی کے آرگن "فکر و نظر" نے تقریباً (۲۲۵) صفحات میں شائع کئے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے، کہ ان تمام مقالوں کے ابھرتے ہوئے نقوش، اصلی الفاظ یا خلاصہ کی صورت میں پیش کر دیں۔

اس مقالہ کی پہلی قسط فکر و نظر جلد اول شمارہ ۷۔۸ (جنوری فروری ۱۹۶۴ء) میں اور دوسری قسط شمارہ نمبر۹ (مارچ ۱۹۶۴ء) میں شائع ہوئی ہے۔ آئندہ اقتباسات میں قسط اول، قسط دوم لکھ کر محولہ بالا شماروں کے صفات درج کردیئے جائیں گے۔

۱۔ قرآنی مفہوم میں تحریف

"وابتلوا الیتمیٰ حتی اذا بلغوا النکاح فان آنستم منهم رشدا فادفعوا الیهم اموالهم۔"

(۴۔۶)

ترجمہ: "اور تم یتیموں کو آزمالیا کرو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر پہنچ جائیں، پھر اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو، تو ان کے اموال ان کے حوالے کردیا کرو۔"

(ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)

" مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے حاشیہ پر فوائد میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ یعنی "بالغ ہو جائیں" کیونکہ نکاح کی پوری قابلیت

بلوغ سے ہوتی ہے۔" اس آیت کریمہ کے اسی قسم کے تراجم دیگر تمام مترجمین نے بھی کئے ہیں' اس آیت کریمہ میں آپ نے دیکھ لیا' کہ یتیموں کو ان کے اموال حوالے کرنے کیلئے جو حد مقرر فرمائی گئی ہے وہ آزمائش کے بعد ان میں ایک گونہ تمیز اور صلاحیت کا پیدا ہو جانا ہے۔ مگر یہ آزمائش اسی وقت کی جانی چاہئے جب وہ بالغ ہو جائیں۔

(بہ لفظہ (قسط اول ص ۴۰)

قرآن کریم آزمائش کی حد انتہا' بلوغ بتلاتا ہے' اور فکر و نظر کے "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" اس میں آزمائش کی "حد ابتدا" کا مضمون ٹھونستے ہیں' یہ کھلی تحریف ائمہ سلف میں سے کس کی تنقید کے تابع ہو کر کی گئی ہے۔؟ کیا "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" یہ بھی نہیں جانتے کہ "حتیٰ" ابتدائے غایت کے لئے نہیں بلکہ انتہائے غایت کے لئے موضوع ہے۔؟ پھر اگر بلوغ کے بعد سے آزمائش کا وقت شروع ہوتا ہے تو مال کے حوالہ کرنے کا وقت کب سے شروع ہو گا؟

۲۔ فقہائے امت کی قرآن کریم کی نظر سے محرومی

" اس آیت سے جہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ یتیموں کو ان کے مال کب حوالے کرنے چاہئیں وہیں اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ "قرآن کریم کی نظر" میں نکاح کی بھی ایک عمر مقرر ہے' اور وہ ہے بلوغ کی عمر۔ (ذرا آگے چل کر) لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ بات اتنی صاف تھی' تو سلف سے لے کر خلف تک تمام فقہائے امت اور علمائے امت

بالاجماع صغر سنی کی شادیوں کے قائل کیسے چلے آتے ہیں' کیا قرآن کریم کی یہ صراحت اور عرب معاشرہ میں صغر سنی کی شادیوں کا کوئی رواج نہ پایا جانا ان کے سامنے نہیں تھا۔؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اسے یونہی سرسری طور پر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔"

(بہ لفظہ (قسط اول ص ۴۰۔۴۱)

سلف سے لے کر خلف تک تمام علماء امت کو "قرآن کریم کی نظر" اور اس کی صراحت سے بے بصیرت ثابت کرنا' یہ ہے فاضل فقیہ مقالہ نگار کی فقاہت' اور ائمہ سلف کی اتباع۔ قرآن کریم کی اس نظر کا چودہ سو سال بعد انکشاف ہوا ورنہ اس سے پہلے تمام امت "ناجائز فعل" ہی کی غلطی میں مبتلا رہی۔

۳۔ صغر سنی کے نکاح کو "جائز" قرار دینے والے ائمہ دین تحریف سے بھی بدتر جرم کے مرتکب ہیں

"اگر ایسا اجماع جس کی سند قرآن و حدیث سے نہ مل سکے بقول حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ناجائز اور اسباب تحریف میں شامل ہے' تو ایسے اجماع کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ جو قرآن کریم کی "نص صریح" کے بھی خلاف ہو' پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے نکاح کی عمر' بلوغ کو قرار دیا ہے' اور یہ "نص صریح" ہے۔ تو اگر نص صریح کے خلاف اجماع کا ثبوت بھی ہو جائے تو اسے کسی طرح بھی جائز نہیں کہا جا سکتا اور ایسا اجماع یقیناً اسباب تحریف سے بھی کچھ زیادہ ہی سخت شمار کیا جائے گا۔"

(بلفظہ قسط اول ص ۴۲)

واضح رہے فاضل و فقیہ مقالہ نگار کے بقول "تحریف سے بھی سخت ترجرم" کا ارتکاب کرنے والوں میں خود شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ بھی شامل ہیں' چنانچہ "والبکر یستاذنہا ابوھا" پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> "اس سے مراد بکر بالغہ ہے۔ نابالغہ نہیں' وہ کیسے مراد ہو سکتی ہے' جب کہ اس کی کوئی رائے ہی نہیں ہوتی۔ اور حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت کر دیا تھا جب کہ وہ چھ سال کی تھیں۔"
>
> (حجتہ اللہ البالغہ' ص ۱۲۷ ج ۲ طبع منیریہ)

ایک طرف ان کو "تحریف کے مجرم" اور "بلا سوچ سمجھے نص صریح کے خلاف فتویٰ دینے والے" قرار دینا اور دوسری طرف ان کے کلام سے استدلال کرنا' جس برتن میں کھانا اسی میں پیشاب کرنے" کے مصداق ہے' معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کی عبارت سے اخذ کردہ نتیجہ اور قرآن کی نص صریح کا افسانہ "خانہ ساز" ہے۔ ورنہ شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے بڑھ کر "نص صریح" کو جاننے والا ادارہ تحقیقات کی جمع کردہ بھیڑ میں کون ہے۔؟

اجماع کا دعویٰ غلط ہے

> "چونکہ (تمام امت اور) فقہا امت کے جم غفیر کے خلاف ابن حزم رحمتہ اللہ علیہ' ابن شبرمہ رحمتہ اللہ علیہ اور خوش قسمتی سے امام عاصم رحمتہ اللہ علیہ کے اقوال (شاذہ) موجود ہیں۔ اس لئے اجماع امت کا دعویٰ غلط ہے۔"
>
> (تلخیص قسط اول ص ۴۲-۴۸)

اجماع امت کے مقابلے میں شاذ قسم کے اقوال و آراء پیش کرنے پر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عمدہ بحثیں فرمائیں ہیں، طلباءٔ و علماءٔ کو "ازالۃ الخفاء" کی طرف مراجعت کا مشورہ دیتے ہوئے یہاں شاہ صاحبؒ کا صرف ایک فقرہ نقل کرتا ہوں:

"در اشکال یک جانب اصابت بود' ویک جانب خطاء المعذور' وچوں پردہ از روئے کار برداشتند' وحق مثل فلق الصبح پدیدار گشت مجال خلاف نماند' ہر کہ الحال یمینا و شمالا افتد زندیق است' اورا مے باید بہ قتل رسانید"

(ازالۃ الخفاء ص ۹۹ ج اطبع جدید نور محمد کراچی)

"جب تک مسئلہ میں اشکال تھا' اس وقت تک ایک جانب صواب تھا' اور ایک جانب خطائے معذور' لیکن جب مسئلہ کے چہرہ سے نقاب اٹھ گیا' اور حق "سفیدہ صبح" کی طرح روشن ہو گیا' اس وقت اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں رہی اس کے بعد بھی جو شخص دائیں بائیں جھانکے وہ زندیق ہے۔ اسے قتل کر دیا جائے۔"

۵۔ علمائے امت کا یہ فتویٰ عجمی اثرات (یا پرویزی اصطلاح میں عجمی سازش) کا نتیجہ ہے

"اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' کہ جب تدوین فقہ کا دور آیا تو بیشتر علمی مسندوں پر وہ علما اور ائمہ قابض ہو چکے تھے جن کا تعلق ملک عرب سے نہیں تھا' بلکہ عجمی ممالک سے تھا' بلکہ تدوین فقہ کے دور سے بہت پہلے ہی علمی

مسندیں عربوں کے قبضہ سے نکل چکی تھیں' عبدالمالک اور زہری کا وہ مکالمہ جو اکثر مورخین نے نقل کیا ہے۔ اس صورت حال پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ (اس کے بعد وہ مکالمہ مذکورہ ہے۔ ناقل)۔"

(بلفظہ قسط اول ص ۴۹)

۶۔ علمائے امت اور جواز حماقت کا فتویٰ

"ان حضرات کا جم غفیر جسے" اجماع کے غلط لقب" سے یاد کیا گیا ہے یہ نہیں کہہ رہا کہ صغر سنی کی شادیاں ضرور کی جانی چاہئیں' وہ زیادہ سے زیادہ یہی بتا رہا ہے کہ اگر "ایسی حماقت" کرلی جائے' تو اس کا شرعی حکم کیا ہوگا۔" (وہ شرعی حکم یہی ہے کہ جائز ہے۔ ناقل)

(بلفظہ قسط اول ص ۵۲)

اجماع کا لقب غلط نہیں بلکہ بقول شاہ صاحبؒ کے اسے غلط قرار دینا صریح زندقہ ہے:

سخن شناس نئی دلبرا خطا ایں جاست

"فاضل وفقیہ مقالہ نگار" کے بقول "ایسی حماقت" کے "شرعی جواز" کا فتویٰ جن "حضرات کے جم غفیر" نے صادر فرمایا، اگر ان کے پاس کوئی شرعی دلیل موجود تھی تو اسے "حماقت" کا لقب دینا خود اچھی خاصی سوچی سمجھی حماقت ہے، اور اگر ان حضرات کا یہ "فتوائے حماقت" یونہی بلا دلیل تھا، تو "ان حضرات کا جم غفیر" مفتری علی اللہ ہوا، نہ کہ ائمہ دین، معاذ و استغفر اللہ۔ یہ ہے فکر و نظر کے فاضل وفقیہ مقالہ نگار کی "اتباع سلف"۔!

۷۔ علمائے امت کا بلا سوچے سمجھے وراثتی فتویٰ

"چونکہ ان کے اذہان وراثتی طور پر صغر سنی کی شادیوں سے مانوس تھے' اور ان کے دلوں میں نہ اس کی طرف سے کوئی استعجاب پایا جاتا تھا' اور نہ اس (ناجائز فعل) سے کوئی نفرت تھی' اس لئے جونہی ان کے سامنے کوئی ایسا بیان آیا جس سے اس کا جواز نکلتا تھا' انہوں نے فوراً اسے قبول کر لیا' اور اس کی جرح و تنقید کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔"

(بلفظہ قسط اول ص ۵۲)

ائمہ دین پر اپنے غیر شرعی موروثی امور سے اُنس رکھنے' ان سے استعجاب نہ کرنے' نفرت نہ کرنے اور بلا سوچے سمجھے اور بلا جرح و تنقید ان کے جواز کا فتویٰ صادر فرمانے کا بہتان کیا بھونڈی اور مکروہ قسم کے افسانہ نگاری نہیں ہے۔؟ پھر "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" یہ بھول گئے' کہ امام مالک اصبحی رحمتہ اللہ علیہ' امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل شیبانی رحمتہ اللہ علیہ اور امام محمد شیبانی رحمتہ اللہ علیہ وغیرہم تو عجمی نہ تھے' انہوں نے اس "حماقت" کے جواز کا فتوے کیسے دے ڈالا ان کو اس عجمیت سے کیوں انس رہا۔ اور استعجاب اور نفرت کیوں نہ ہوئی۔ کیا اسے تحقیق کہا جائے' یا ائمہ دین کی تحمیق (ان کو الّو بنانا)۔؟

۸۔ نہیں بلکہ ضرورت اور مجبوری

" فقہائے کرام نے یہ کہیں نہیں کہا کہ بلا ضرورت بھی صغر سنی کی شادیاں کرنی چاہئیں وہ تو صرف یہ بتا رہے ہیں' کہ اگر کوئی شخص کسی ضرورت اور مجبوری کے تحت ایسا نکاح کر دے

تو اس کا کیا حکم ہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی ضرورت شدیدہ میں' جیسی صورت ہم نے اوپر فرض کی ہے' اگر کوئی شخص ایسا کر دے تو عدل عمرانی' ضرورت وقت' تقاضائے مصلحت اور منشائے قانون بھی یہی ہے کہ اس کے جواز کا فتویٰ دیا جائے۔"

(بلفظہ قسط اول ص ۵۳)

اوپر کی عبارت میں "فاضل وفقیہ مقالہ نگار" نے اسے "فتوائے حماقت" قرار دیا تھا' یہاں آکر اسے فتویٰ ضرورت" بنا ڈالا۔ کیا اسلامی تحقیقات کے ادارے کی زبان میں ضرورت اور حماقت کے ایک ہی معنی ہیں۔؟ پھر یہ ضرورت حماقت کا الہام کہاں سے ہوا' فقہاء کے جم غفیر نے اس کی کہیں تصریح فرمائی ہے یا یہ محض ایجاد بندہ ہے۔

لیکن آپ کا مسلم فیملی لاز تو جس کی نمک حلالی کے لئے نامۂ عمل کی یہ تمام سیاہی آپ نے مہیا کی ہے عدل عمرانی' ضرورت وقت' تقاضائے مصلحت اور منشائے قانون کو بالائے طاق رکھ کر بلا استثناء اسے قابل سزا جرم قرار دیتا ہے' اسلام کا معجزہ دیکھئے' کہ جس قانون کی خاطر اسلام میں تحریف اور ائمہ اسلام کی تحمیق کا بار عظیم اٹھایا گیا تھا' خود اسی قانون کو عدل عمرانی' ضرورت وقت' تقاضائے مصلحت اور منشائے قانون کی ضد قرار دینا پڑا۔

نہیں نہیں بلکہ اشتباہ

" واقعہ یہ ہے کہ ہمارے فقہاء کے سامنے ایک ایسی روایت تھی' جو انہیں اشتباہ میں ڈالنے کا باعث بنی' اس روایت پر ہم شرح وبسط کے ساتھ آئندہ اشاعت میں بحث کریں گے۔"

(قسط اول ص ۵۴)

اگر یہی واقعہ ہے تو مذکورہ بالا "ضرورت حماقت" کے افسانے کس خطاب کے مستحق ہیں۔

تمام معتبر کتابوں کی صحیح ترین حدیث

"یہ روایت حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں صحیح ترین سند (بلکہ اسانید متعددہ متواترہ۔ ناقل) کے ساتھ بیان ہوئی ہے، جس کی بنا پر ہمارے فقہا کو صغر سنی کی شادیوں کے جواز کا فتویٰ دینا پڑا ہے، یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف منسوب کی گئی ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں کہ:

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے نکاح کیا جب کہ میں چھ سال کی تھی، اس کے بعد ہم مدینہ میں آئے۔ پھر (رخصتی کے وقت) مجھے کسی بات نے نہیں گھبرایا، مگر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور (انصاری عورتوں نے) مجھے آپ کے حوالے کر دیا، ان دنوں میں نو سال کی تھی۔ عروہ ابن زبیر نے بتایا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ کی طرف ہجرت فرمانے سے تین سال پہلے ہو گیا تھا، دو سال یا قریبا دو سال تک آپ نے کوئی شادی نہیں کی (واضح رہے کہ یہ عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے، جسے ایک دروغ مصلحت آمیز کے لئے فکر و نظر کے "فاضل فقیہ مقالہ نگار" نے حضرت عائشہ کی روایت میں شمار کر لیا۔ اس

لئے از راہ احتیاط انہوں نے جمع الفوائد کا حوالہ دیا۔ یہ بحث الگ مقالے میں پیش کی جائے گی۔ واللہ الموفق (ناقل)) پھر حضرت عائشہ سے نکاح کیا جب کہ وہ چھ سال کی تھیں اور حضرت عائشہ کی رخصتی اس وقت ہوئی جب کہ وہ نو سال کی تھیں۔ ایک اور روایت میں یہی بات دوسرے لفظوں میں کی گئی ہے (یہ خط کشیدہ عبارت وفی اخری: ومکثت عندہ تسعا کا فقیہانہ ترجمہ ہے۔ ناقل) اور ایک چوتھی روایت میں ہے کہ (حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ) حضور نے مجھ سے نکاح فرمایا جب کہ میں سات سال کی تھی۔"

(صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابو داؤد، نسائی، بحوالہ جمع الفوائد ص ۲۱۴ ج ۔۱)

(بلفظہ قسط دوم ۔ ص ۳۱ ۔ ۳۲)

مخالفین اسلام کی اوٹ میں :

"اور اس حدیث کو سامنے رکھ کر مخالفین اسلام کی طرف سے حضور اکرم ﷺ کے متعلق کیا کچھ کہا جا تا رہا ہے اس کا اندازہ مستشرقین یورپ کی تحریرات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔" (بلفظ قسط دوم ص ۳۳)

یہ فکر و نظر کے "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" نے مخالفین اسلام کی آڑ میں اپنے استاذ محترم پرویز صاحب، اور ادارہ تحقیقات کے شاگردان یورپ کے دل کی بات بتا دی ہے، کیا مخالفین اسلام کی طرف سے ذات قدسی صفات صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں "کیا کچھ" کہا جانا۔ جس کا اندازہ ان کے بقول مستشرقین یورپ کی تحریرات سے با

آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ صرف اسی ایک حدیث تک محدود ہے۔؟ ستیارتھ پرکاش اٹھا کر دیکھ لیجئے' بسم اللہ سے والناس تک قرآن کریم کو سامنے رکھ کر آپؐ کے متعلق "کیا کچھ" نہیں کہا گیا۔ اگر "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" مخالفین اسلام کے "کیا کچھ" کہنے' اور مستشرقین کی تحریرات سے اتنے ہی مرعوب ہیں اور انہیں حق بجانب تصور کرتے ہیں تو سارا نزلہ "تمام معتبر کتابوں کی صحیح ترین حدیث" ہی پر کیوں گرتا ہے۔ قرآن کریم اور اسلام کو بھی جواب دے دیجئے کیونکہ ان ہی دونوں کی عداوت میں تو آپؐ کے متعلق "یہ سب کچھ" کہا جاتا ہے' ورنہ اس حدیث نے نہ تو مخالفین اسلام کا کچھ بگاڑا ہے' اور نہ آپ جیسے "نام نہاد موافقین اسلام" کا کوئی نقصان کیا ہے۔

یہ حدیث بالاتفاق صحیح اور متواتر ہے

"یہ حدیث صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابو داوٗد' سنن نسائی' اور دوسری تمام معتبر کتب حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس حدیث کی سند پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ اسی ایک حدیث کی بنا پر (یہ فاضل و فقیہ مقالہ نگار کا تجاہل یا جہالت ہے' ورنہ دوسری احادیث بھی اس مسئلہ میں موجود ہیں' آئندہ سطور میں ان کا ذکر آئے گا۔ انشاء اللہ اور اگر بالفرض کوئی اور حدیث نہ بھی ہوتی' تو یہی "سو کی ایک" کیا کم تھی' بالخصوص جب کہ یہ مسئلہ قرآن کریم میں بھی مذکور ہے' اس کا بیان بھی ابھی آتا ہے۔ انشاء اللہ ۔ ناقل) فقہا و علما کا جم غفیر (بہ لفظ صحیح ایک دو غیر معتبر اور شاذ اقوال کو چھوڑ کر امت کے تمام علماء کا اجماع صحیح۔ ناقل) صغر سنی کی شادیوں کے جواز کا قائل چلا آ رہا ہے اور جو لوگ صغر سنی کی شادیوں کے

عدم جواز کے قائل ہیں' وہ بھی لڑکیوں کی حد تک یا تو جواز کے قائل ہیں' (صغر سنی کی شادیوں کی عدم جواز کے حق میں "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" نے کل تین نام پیش کئے تھے' اگرچہ اس فہرست کے ثبوت میں بھی کلام کیا جا سکتا ہے' لیکن خیر تین نام مان لیجئے) جب ان تینوں میں سے بھی بعض "لڑکیوں کی حد تک تو جواز کے قائل" ہیں تو مطلقاً عدم جواز کے قائل کتنے رہ گئے۔؟ ناقل) یا پھر اس واقعہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات پر محمول کرتے ہیں' (اس سے واضح ہو گیا ہو گا' کہ یہ حدیث باجماع امت روایتاً و درایتاً صحیح ہے اور سلف و خلف میں سے کسی بھی قابل اعتبار شخصیت نے اسے روایتاً صحیح اور درایتاً غلط نہیں کہا' اب اسے درایتاً غلط کہنا کسی ملحد اور زندیق ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اگر فکر و نظر کے "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" میں ایمانی رمق کسی درجہ میں بھی باقی ہوتی تو تمام امت کی درایت کو (جن میں ان کے پیش کردہ تین نام بھی شامل ہیں) غلط ٹھہرا کر ملاحدہ مغرب کی کورانہ تقلید میں اسے رد نہ کرتے' زیادہ سے زیادہ اسے خصوصیت پر محمول کر لیتے' تو مسلمانوں کو ان سے متعلق کسی حد تک حسن ظن کی گنجائش تو رہ جاتی۔ ناقل) لیکن اس موقعہ پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ کہ مذکورہ بالا حدیث کتنی ہی قوی اور سند کے اعتبار سے کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو لیکن بہرحال وہ ایک خبر واحد ہے جو قرآن کی نص صریح کے مقابلہ میں قابل قبول نہیں ہو سکتی۔" بلفظہٖ قسط دوم ص ۳۳)

سبحان اللہ۔ یہاں آ کر تو ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ نے اپنی فضیلت و فقاہت کا سارا بھانڈا ہی پھوڑ دیا‘ ذرا سوچئے کہ جو حدیث خود ان کے بقول‘ مشرق و مغرب‘ جنوب و شمال‘ عرب و عجم‘ ترک و تاجیک‘ الغرض تمام خطہ زمین کی ”تمام معتبر کتب حدیث‘ تفسیر‘ فقہ‘ سیر اور تاریخ میں صحیح ترین سندوں کے ساتھ موجود ہو اور امت کے اولین و آخرین‘ اور سلف و خلف کے تمام علماء‘ فقہا‘ محدثین نے اسے قبول کیا ہو‘ اور اس کی اسانید صحیح اس کثرت سے ہوں کہ اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو بلا مبالغہ ایک ضخیم کتاب بن جائے‘ کسی ”فاضل و فقیہ“ سے نہیں ادنیٰ ہوش و حواس کے آدمی سے پوچھ دیکھئے کہ کیا وہ خبر واحد کہلائے گی‘ یا تمام امت کی مسلمہ اور متواتر۔؟ جب ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ کو بھی تسلیم ہے کہ امت مرحومہ کا ہر طبقہ از اول تا آخر اس پر مہر تصدیق ثبت کرتا رہا ہے اور کبھی کسی نے بقائمی ہوش و حواس‘ اس کے خلاف کبھی کوئی آواز نہیں اٹھائی تو اسے
”خبر واحد“ کہہ کر رد کرنے کو جنون کہا جائے یا زندیقیت اور رد کرنے والے کو دماغی ہسپتال کا مشورہ دیا جائے‘ یا کسی مغربی یونیورسٹی کا۔؟

ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق ادارہ تحقیقات کی مہذب زبان

”عقل انسانی اسے کسی طرح باور نہیں کرتی کہ ایک نو سال کی ”الھڑ لڑکی“ اپنے میکہ میں ان تمام علوم و فنون میں اس قدر مہارت کی مالک ہو سکتی ہے کہ اس کا علم پوری امت کی عورتوں سے بڑھ جائے۔“

(بلفظہ قسط دوم ص ۴۸)

صغر سنی کی شادیوں کے جواز پر ایک اور حدیث :

"صغر سنی کی شادیوں کے جواز پر بعض فقہاء کرام نے ایک دوسری روایت سے بھی استدلال کیا ہے۔ (ابھی ابھی "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" فرماتے تھے کہ نابالغی کے نکاح کی بنیاد صرف ایک حدیث پر ہے۔ مقام شکر ہے کہ ان کو ایک دوسری روایت بھی نظر آگئی۔ ناقل) وہ روایت یہ ہے :۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے' کہ مجھے عبداللہ ابن ابی بکر بن حزم اور عبداللہ ابن حارث اور ایک ایسے آدمی نے بتایا جسے میں متہم نہیں سمجھتا' کہ عبداللہ ابن شداد کا بیان ہے' کہ جس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کیا تھا وہ ان کے بیٹے سلمہ تھے' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت حمزہ کی صاحبزادی سے فرما دیا تھا اور یہ دونوں ان دنوں چھوٹے بچے تھے۔ مگر دونوں کی موت واقع ہو جانے کی وجہ سے یہ دونوں یکجا نہیں ہو سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے' کہ کیا میں نے سلمہ کی اس بات کا بدلہ کہ اس نے اپنی ماں کے ساتھ میرا نکاح کرا دیا تھا' اتار دیا ہے۔"؟

یہ روایت سند کے اعتبار سے جیسی کچھ ہے' (یہ "جیسی کچھ ہے" جرح مبہم ہے' جو قابل قبول نہیں' بظاہر سند بے غبار ہے' یوں بھی جب "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" کے دربار میں کلبی مرحوم کی "مجلسی خوش گپیاں" یہاں تک درجہ استناد حاصل کر لیتی ہیں کہ ان کی بنیاد پر متواتر احادیث کو رد کر دیا جاتا ہے' تو یہ حدیث اس

سے بہرحال بدرجہا فائق ہے' اس سے ایک فرعی مسئلہ کیوں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ناقل) اہل علم پر مخفی نہیں' لیکن بر سبیل تنزل اسے قابل اعتماد تسلیم کرلیا جائے' تب بھی اس سے استدلال صحیح نہیں۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بنص قرآن مومنین پر ولایت عامہ حاصل تھی' اس لئے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف بلوغ کے بعد کر سکتے تھے' اسی طرح بلوغ سے پہلے بھی کر سکتے تھے' (بحمد اللہ ہمیں تو نہ آپ کی ولایت عامہ میں کوئی اشکال ہے' نہ آپ کے کسی کا نکاح قبل از بلوغ یا بعد از بلوغ کرا دینے میں کوئی دقت ہے' لیکن بے چارے "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" کے لئے یہ سب چیزیں مشکل ہیں' کیونکہ ان کے نزدیک نکاح کی عمر بلوغ ہے' اس لئے بلوغ سے پہلے ان کے نزدیک نکاح کی صلاحیت ہی مفقود ہوتی ہے۔ پس جس طرح شکم مادر میں بچہ نکاح کی صلاحیت نہیں رکھتا' اسی طرح بلوغ سے پہلے بھی' اس صورت میں ان کی یہ تاویل کیسے چل سکتی ہے کہ نابالغی میں نکاح کرا دینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔ کیونکہ جب محل' محل نکاح نہیں' نہ اس میں نکاح کی صلاحیت ہے تو وہاں نکاح کا تصور ہی غلط ہوگا۔ چہ جائیکہ اس کے لئے خصوصیت کا نکتہ تلاش کیا جائے' اور اگر وہ یہ تسلیم کرلیں' کہ نابالغ بچہ بھی محل نکاح ہو سکتا ہے' اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اس کا نکاح کر دیا جائے' تو ہم گزارش کریں گے کہ جب عاقد میں صلاحیت موجود ہے' اور محل بھی صالح للعقد ہے تو مانع جواز کیا ہے۔ یعنی

جب ولایت عامہ کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نابالغ کا نکاح کرا سکتے ہیں' تو ولایت خاصہ کی وجہ باپ یا ولی کیوں نہیں کرا سکتے۔؟ نیز اس صورت میں ''نص صریح'' کے ڈھونگ کا کیا بنے گا' دیکھئے فاضل و فقیہ مقالہ نگار کی خود رائی نے ان کے لئے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا کیا خوب سماں پیدا کر دیا۔ ناقل) اس لئے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے' دوسرا کوئی شخص اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یا لفظ تزویج کو وعدہ نکاح پر محمول کیا جائے'

(یہ جواب تو محض وزن بیت ہے' جس پر ان کا شکست خوردہ ضمیر خود بھی ملامت کرتا ہوگا۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ میں اس ''تاویل بیجا'' کی کوئی گنجائش نہیں۔ ناقل)۔''

صغر سنی کے نکاح کا جواز قرآن مجید سے ثابت ہے

''ملک کے چودہ مقتدر علمائے کرام نے نص صریح کے علی الرغم۔ اس مسئلہ پر خود قرآن کریم ہی سے استدلال کی سعی نا مشکور فرمائی۔ (فاضل و فقیہ مقالہ نگار پہلے نص صریح ثابت کریں۔ پھر اس کی موافقت یا مخالفت کا قصہ زیر بحث لائیں۔ ناقل) چنانچہ والّٰئی لم یحضن سے انہوں نے یہ نکالا' کہ ''نابالغ طلاق شدہ لڑکیوں کی عدت تین ماہ بیان فرمائی گئی اور عدت طلاق نکاح کے بعد ہی ہو سکتی ہے' اس طرح صریح طور پر قرآن مجید نابالغ لڑکیوں کے ساتھ نکاح کی اجازت دیتا ہے۔''

چودہ علماء کے اس استدلال سے گردن مارے ندامت کے جھک

جاتی ہے' کیونکہ یہ تو واضح ہے' کہ عدت طلاق کا سوال مقاربت کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر اس آیت سے بالفاظ صریح یا صریح الفاظ میں نابالغ لڑکیوں سے نکاح کا جواز ثابت ہوتا ہے' تو الفاظ صریح اور صریح الفاظ میں ان سے مقاربت کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے' کیا قرآن کریم اسے جائز قرار دے سکتا ہے۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ یہ قرآن کریم پر انتہائی افسوسناک اتہام ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

تلخیص (قسط دوم ص ۵۰۔ ۵۱)

اگر یہ "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" کی فقاہت میں انتہائی افسوسناک اتہام ہے' تو انہیں اطمینان رکھنا چاہئے' کہ یہ بیچارے چودہ مقتدر علماء کرام کی طرف سے نہیں' بلکہ زبان روکو نبیؐ تک اور نبیؐ کے مہربان تک بات پہنچے گی' کیونکہ : ابن جریر' ابن اسحٰق' اور مستدرک میں بہ سند صحیح مروی ہے :

"واخرج ابن جریر و اسحاق بن راھویہ والحاکم و غیر ھم بسند صحیح عن ابی بن کعب قال لما نزلت الا یۃ فی سورۃ البقرۃ فی عدۃ النساء قالوا قد بقی عدد من النساء لم یذکرن الصغار والکبار واولات الاحمال فنزلت واللائی یئسن من المحیض من نساء کم الا یہ۔"

(تفسیر مظہری ص ۳۲۲ ج ۹)

ترجمہ :"امام ابن جریر' اسحاق بن راہویہ اور حاکم و غیرہ نے "بہ

سند صحیح" حضرت ابی بن کعب سے روایت کی ہے کہ جب عورتوں کی عدت کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کی کہ عورتوں کی کچھ تعداد باقی رہ گئی ہے۔ جن کا ذکر (اس آیت میں) نہیں کیا گیا' یعنی نابالغ 'عمر رسیدہ اور حاملہ عورتیں' اس پر یہ آیت نازل ہوئی واللائی یئسن من المحیض من نساء کم الایۃ"

اس کے علاوہ کسی بھی بڑی چھوٹی تفسیر کی کتاب کو اٹھا کر دیکھ لیجئے' آپ صحابہ کرام' تابعین' ائمہ فقہ' ائمہ حدیث اور ائمہ عربیت کی جانب سے واللائی لم یحضن کی یہ تفسیر ملے گی' کہ "اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کو صغر سنی کی وجہ سے ایام آنا شروع نہ ہوئے ہوں۔" اب فرمایا جائے' کہ یہ تہمت چودہ مقتدر علماء کرام نے لگائی ہے' یا فکر و نظر کے فاضل اور فقیہ مقالہ نگار کے غلط تصور اور کج فہمی نے یہ طوفان برپا کیا ہے۔؟ اور نابالغ طلاق شدہ لڑکیوں کی عدت' خدا و رسول' صحابہ و تابعین نے بیان فرمائی ہے یا چودہ علماء نے۔؟ اور اسی سے فاضل و فقیہ مقالہ نگار کے اس برخود غلط دعویٰ کی بھی قلعی کھل گئی کہ "دور نبوی میں صغر سنی کے نکاح کا رواج نہیں تھا" حق تعالیٰ علم کے ساتھ ذہن کی سلامتی اور فکر میں اصابت بھی عطا فرمائیں' تب ہی کام چلتا ہے' ورنہ "نام نہاد فاضل و فقیہ مقالہ نگار" کی طرح آدمی فاضلہ اللہ علی علم کا مصداق بن کر ادھر ادھر کی واہی تباہی ہانکنے لگتا ہے۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا' وھب لنا
من لدنک رحمۃ' انک انت الوھاب

(الحق شوال ۱۳۸۶ھ)

تعدد ازدواج اور اسلام

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

"تمام مدافعین اسلام کی سادہ لوحی (اور حماقت)"

"یورپ کے مستشرقین نے اس بات کو سامنے رکھ کر کہ اسلام تعدد ازدواج کا حامی ہے' اسلام کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کرنے کے لئے اب تک ہزارہا صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کی طرف سے مدافعت کرنے والوں نے بھی اپنی سادہ لوحی سے اس "غلط تہمت" کو قبول کر کے ان کے جوابات کے سلسلہ میں کچھ کم صفحات سیاہ نہیں کئے۔ ان مدافعت فرمانے والوں کا انداز بالکل ایسا ہی ہے' جیسے اپنے دامن پر کچھ ناخوشگوار دھبے دیکھ کر دل ہی دل میں شرما رہے ہوں۔"

(فکر و نظر جلد ا ش ۱۱ ص ۱۳)

لیکن معاف کیجئے یہ غلط تہمت آپ کے ڈاکٹر فضل الرحمان کے بقول "قرآن کی قانونی سطح" اور اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ نے لگائی۔ ناقل۔

(ملاحظہ ہو فکر و نظر جلد ۴ ش ا ناقل)

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

"اسلام کی نظر میں تعدد ازدواج بہرحال ایک ناقابل حمایت برائی ہے":

"اسلام نے جن حالات میں تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے' اس کی حیثیت قطعاً ایسی ہی ہے جیسا کہ ہم کسی بڑی برائی سے بچنے کے لئے بعض اوقات کسی چھوٹی برائی کو اختیار کر لیتے اور اس کی اجازت دے دیتے ہیں۔ لیکن اس اجازت سے قطعاً یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ہم اس برائی کی حمایت کر رہے ہیں۔ برائی بہرحال برائی ہی رہتی ہے۔ اور ہر صورت میں ناقابل حمایت"۔

(ایضا ص ۱۱۴)

لیکن اس بہرحال ناقابل حمایت برائی' کے خلاف امت اور امت کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیوں آواز نہ اٹھائی؟ اور اس "ناقابل حمایت برائی" کا انکشاف " اپوا کی بیگمات" کی بیجا ضد کے بعد یکایک کیسے ہو گیا' قرآن کی وہ کونسی نئی آیت نازل ہو گئی جس کی روشنی میں انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین کو' محض فرضی ضرورت کی آڑ میں' مسلسل عمل قبیح پر عمل پیرا قرار دیا گیا۔ ناقل)

انبیا علیہم السلام اسی برائی پر عمل پیرا رہے:

"کہا جاتا ہے کہ تعدد ازدواج انبیا علیہم السلام اور اسلاف کی سنت رہی ہے۔ جہاں تک انبیا علیہم السلام کا تعلق ہے' تو ضروری نہیں کہ انہوں نے جو کام کئے ہوں' وہ سب کے سب ہمارے لئے بھی سنت کا درجہ رکھتے ہوں"۔

(ایضاً)

صدیقین، شہدا، اور صالحین کا یہ متواتر "عمل بد" کسی ضرورت سے ہو گا :

" رہ گئے ہمارے اسلاف و اکابر تو ان تمام حضرات کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں ان حالات کا جائزہ بھی لینا چاہئے، جن میں انہوں نے تعدد ازدواج پر عمل فرمایا تھا۔ اگر انہوں نے واقعتاً کسی بڑی برائی سے بچنے کے لئے یا کسی بلند تر مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کو اختیار فرمایا تھا، تو ضروری نہیں کہ ہم بھی ان کی پیروی کریں اِلّایہ کہ ہم بھی انہیں جیسے حالات سے دو چار نہ ہو گئے ہوں"۔

(ایضاً)

انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کا عمل متواتر سنت نہیں

" پھر سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ کیا خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم و تابعین نے یا ہمارے اسلاف و اکابر نے کبھی بھی تعدد ازدواج کو سنت نبوی قرار دیا ہے؟ اور اس کی لوگوں کو ترغیب دی ہے؟ یا اس پر کسی ثواب کا وعدہ کیا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے، تو آج ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم ان حضرات کے علی الرغم اسے سنت قرار دے دیں"۔

(ایضاً)

(اگر انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کا بلانکیر عمل متواتر بھی

سنت نہیں ہوتا تو اسلام میں "سنت نبوی" کا وجود ہی کہنا چاہئے کہ سرے سے نہیں ہے۔ ناقل)

ان حضرات کا یہ عمل متواتر قانون فطرت کے خلاف تھا:

"اگر وحدت ازدواج قانون فطرت نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ قدرت کو کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی تھی کہ آدم کے لئے ایک سے زیادہ بیویاں پیدا کر دی جاتیں' اور اس طرح نسل انسانی کو جلد از جلد بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع مہیا کر دیئے جاتے۔ لیکن اس وقت بھی جب کہ ضرورت تھی' قدرت نے ایسا کوئی انتظام نہیں فرمایا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قانون فطرت یہی ہے' کہ مرد کے لئے ایک ہی بیوی ہونی چاہئے"۔

(حوالہ بالا ص ۲۱)

ان حضرات کا یہ عمل متواتر قانون قدرت کے بھی خلاف تھا:

"علاوہ ازیں قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بات بھی نہایت وضاحت سے معلوم ہو جاتی ہے۔ کہ قانون قدرت بھی یہی ہے' کہ ایک نر کے لئے ایک مادہ ہو۔ قدرت نے انسانوں کو اسی انداز سے پیدا کیا ہے۔ (چند آیات نقل کرنے کے بعد) لہٰذا جب قانون قدرت یہی ہے' کہ وہ ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کرتا ہے' ایک نر اور ایک مادہ' نباتات' حیوانات اور انسانوں میں سب میں یہی

قانون کارفرما اور بقائے نسل کے لئے وہ اسی کو کافی سمجھتا ہے۔ چنانچہ طوفان نوح کے سلسلہ میں اس نے ہر چیز کا ایک ایک جوڑا رکھنا ہی کافی سمجھا تھا۔ تو ایک مرد کے لئے ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا قانون قدرت کے بھی خلاف ہے"۔

(ص ۲۳)

ان حضرات کا یہ عمل متواتر "الطیبات للطیبین" کے فطری اصول کی ضد تھا:

سورہ نور کی آیت الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات۔ الایۃ۔ ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"یہاں بھی جمع کے صیغے کو جمع کے لئے ثابت کیا گیا ہے، جیسا کہ اضافت جمع بسوئے جمع کے سلسلہ میں ہم پہلے بتا چکے ہیں، ایسی صورتوں میں جمع کے ہر فرد کے لئے دوسری جمع کا ایک ایک فرد مراد ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اسی اصول کے ماتحت ہر خبیث عورت کے لئے ایک ایک مرد اور ہر خبیث مرد کے لئے ایک ایک خبیث عورت مراد ہے۔ جیسا کہ ہر پاکیزہ مرد کے لئے ایک ایک پاکیزہ عورت اور ہر پاکیزہ عورت کے لئے ایک ایک پاکیزہ مرد ہو سکتا ہے۔ یہاں اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک پاکیزہ مرد کے لئے چار چار پاکیزہ عورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا ایک خبیث مرد کے لئے چار چار خبیث عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔"

(حوالہ بالا ص ۲۹)

مقالہ نگار "پاکستان کی عائلی شریعت" کا تقدس ثابت کرنے کے لئے' انبیا' صدیقین' شہدا' صالحین کے عمل متواتر پر قانون لغت' قانون فطرت اور قانون قدرت (اور نامعلوم کس کس قانون) کی مخالفت کا فتویٰ صادر فرمائیں' بہرحال ان کے "حق نمک" کا تقاضا ہے' اس "حق ادائی" میں وہ تکویناً معذور ہیں' لیکن اتنے حواس باختہ تو انہیں نہیں ہونا چاہئے کہ جس ذات اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حق میں الطیبات للطیبین کی آیت نازل ہوئی تھی' انہیں کے بارے میں یہ دعویٰ کریں کہ یہ آیت ان پر صادق نہیں آسکتی' اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نوامہات المومنینؓ بھی (جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی) اس آیت کا مصداق نہیں' تو فرمایئے کہ یہ اصول آخر کس پر منطبق ہوگا۔ ناقل۔

امت کے تمام مفسرین اور مجتہدین نے تعدد ازدواج کی آیت کے مفہوم میں ٹھوکر کھائی' جس سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں

"لیکن ہمارے مفسرین و مترجمین نے اس آیت کا وہ مطلب نہیں لیا جو ہم نے بیان کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں' یہاں نمونے کے طور پر ہم مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ اور تفسیر نقل کرتے ہیں۔ باقی تمام مفسرین و مترجمین نے بھی اسی انداز کے ترجمہ اور تفسیریں فرمائی ہیں۔ مولانا آزاد اس آیت کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں۔"

(ایضاً ص ۳۰)

جی ہاں تمام صحابہ' تابعین اور مفسرین کی تفسیر سے تو "بڑی پیچیدگیاں" پیدا ہو

گئیں' (ان میں سب سے بڑی پیچیدگی تو یہی ہے کہ اس سے عائلی قوانین کی دفعہ ٦ کا لغو' لچر اور مہمل ہونا لازمی آتا ہے) لیکن مقالہ نگار کی "ایمرجنسی تفسیر" سے تمام عقدے حل ہو گئے' چودہ طبق روشن ہو گئے۔ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرامؓ تک کا عمل "بہرحال ایک ناقابل حمایت برائی" قرار پایا۔ ناقل)۔

ان حضرات نے قرآنی عبارت کو بالکل الٹ اور "من مانے" معنی پہنا دیئے

" ہم ان تراجم و تفاسیر کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مولانا آزاد نے جو فرمایا ہے اور بین القوسین جس قدر عبارتیں اپنی طرف سے بڑھائی ہیں' وہ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے' جس نے عبارت قرآنی کو ایسے معنی پہنا دیئے ہیں جو اصل عبارت کے بالکل ہی الٹ ہیں"۔

(ایضاً ص ۳۳)

مولانا آزاد مرحوم اور دوسرے تمام مفسرین نے بین القوسین چند توضیحی الفاظ بڑھا دیئے تو یہ حضرات قرآنی عبارت میں بالکل الٹ اور من مانے معنی پہنانے کی وجہ سے گردن زدنی قرار پائے' لیکن مقالہ نگار نے قوسین کی قید سے آزاد ہو کر تین چار صفحے آیت کی فرضی مراد واضح کرنے کے لئے سیاہ کر دیئے' اور "فاضل وفقیہ" کے خطاب کے مستحق ہو گئے۔

ان حضرات نے جس اصول شکنی کا ارتکاب کیا' اصل قصور اس کا ہے

" واقعہ یہ ہے' کہ اس میں نہ مولانا ابوالکلام آزاد کا کوئی

قصور ہے۔ اور نہ حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کا اور نہ دیگر مفسرین و مترجمین کا، قصور اس اصول شکنی کا ہے، جو اس سلسلہ میں سرزد ہو گئی ہے۔"

(ایضاً ۳۴)

جی ہاں، ان بیچاروں (تمام مفسرین) کو معاذ اللہ اتنی بصیرت اور عقل کہاں نصیب تھی، کہ قرآن کی شرح و تفسیر میں کسی اصول کی پابندی کا لحاظ رکھتے، اور تمام انبیا و اولیا کے عمل متواتر کو "عمل بد" قرار دینے کی ہمت کرتے۔ یہ تمام چیزیں مقالہ نگار کی فضیلت و فقاہت ہی کو نصیب ہیں۔

تمام مفسرین نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و تابعین کے الفاظ کو خود ساختہ معنی پہنا دیئے

"اس سلسلہ میں دشواری یہ ہے، کہ ہم دلیل میں الفاظ تو حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور تابعین کے پیش کرتے ہیں۔ اور ان کو معنی وہ پہنا دیتے ہیں جو ہم نے خود اپنے ہاں متعین کر رکھے ہیں، حالانکہ ہمیں ان حضرات کے الفاظ کا وہی مفہوم لینا چاہئے، جس میں وہ حضرات خود ان الفاظ کو استعمال کرنے کے عادی تھے نہ اپنا خود ساختہ مفہوم"۔

(ایضاً ۴۰)

شان نزول کی حدیث کو سامنے رکھ کر مفسرین نے آیت کے ترجمہ و تفسیر میں تصرفات کئے:

"اس تمہید کے بعد آیئے اس حدیث پر غور کریں جو

آیت زیر بحث کے شان نزول کے سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے اور جس کی بنیاد پر آیت کا ترجمہ اور اس کی تفسیر میں وہ تصرفات کئے گئے ہیں' جو آپ پہلے دیکھ چکے ہیں"۔

(ایضاً ص ۳۸)

اسلام میں "مقالہ نگار" کے "خود ساختہ اصول" کو اہمیت ہے' لیکن صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم' تابعین' اور تمام فقہا کی شخصیت' ان کی سمجھ بوجھ' اور ان کے عمل متواتر کو کوئی اہمیت حاصل نہیں

"اس سلسلہ میں ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے' کہ اگر بات یہی ہے' جو تم بیان کر رہے ہو تو پھر چودہ سو سال سے مسلمانوں میں تعدد ازدواج کا رواج کیوں چلا آ رہا ہے۔ تم سے پہلے بڑے بڑے جید علماء اور بڑے بڑے مقتدر فقہاء کرام گزر چکے ہیں۔ ان کی سمجھ میں بات کیوں نہیں آئی جو تم کہہ رہے ہو اور انہوں نے عام حالات میں مسلمانوں کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے سے کیوں نہیں روکا۔ بلکہ تاریخ تو ہمیں بتاتی ہے کہ وہ خود بھی تعدد ازدواج پر عمل کرتے رہے ہیں۔ کیا اتنے بڑے بڑے اکابر ایک غلط اور ناجائز کام کرتے رہے۔ اس کا ایک جواب تو اصولی ہے' اور وہ یہ کہ اسلام میں اہمیت اصول اور قانون کو ہے۔ شخصیتوں کو نہیں ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ قرآن و سنت سے ہمیں کیا ہدایات ملتی ہیں۔ اور ان پر ہی ہمیں عمل کرنا چاہئے۔

اگر کسی شخصیت کا عمل قرآن و سنت کی ہدایات کے خلاف نظر آتا ہے تو تاویل یا توجیہہ قرآن و سنت میں نہیں کی جانی چاہئے بلکہ اس شخصیت کے عمل میں کی جانی چاہئے"۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۱ ص ۴۶)

امت کے چودہ سو سالہ عمل کی زیادہ سے زیادہ یہ توجیہہ ممکن ہے، کہ اسلام کی چودہ صدیاں ہنگامی حالات سے دوچار رہیں

" ویسے ہمیں یقین ہے کہ ان حضرات کا عمل قرآن کریم اور سنت نبویؐ کے خلاف نہیں ہو گا۔ اگر ہم اس سلسلہ میں یہ بات ثابت نہیں کر سکتے کہ انہیں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی سخت ضرورت لاحق تھی تو دوسری طرف ہم ان کے سلسلہ میں یہ بات بھی تو ثابت نہیں کر سکتے کہ انہوں نے بغیر جائز ضرورت ہی کے ایک سے زیادہ بیویاں رکھ چھوڑی تھیں۔ قرآن و سنت کی وہ تمام ہدایات جو آج ہمارے سامنے ہیں، یقیناً ان کے سامنے بھی تھیں بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ یہ تمام ہدایات ہم تک انہی حضرات سے پہنچی ہیں۔ اگر ہم ان کے خلاف کسی سوء ظنی میں مبتلا نہیں ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اب تمام ہدایات کو جانتے ہوئے خود ان کے خلاف عمل کرتے ہوں۔ حسن ظن کا تقاضا تو یہ ہے، کہ ہم یہ بات تسلیم کریں کہ یقیناً ان کے دور میں اسلامی معاشرہ عمومی طور پر یا خود ان کے اپنے ذاتی اور خاندانی

حالات، خصوصی طور پر اس امر کے مقتضی ہوں گے کہ وہ اس ہنگامی یا خصوصی ہدایت پر عمل پیرا ہوں"۔

(ایضاً ص ۴۷)

ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ امت مسلمہ کا موقف یہ ہے کہ اسلام میں "ایمر جنسی" کی شرائط کے بغیر بھی تعدد ازدواج کی (چار تک) اجازت ہے۔ اور مقالہ نگار اور ان کے موکلین کا موقف یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں یہ بہرحال ایک ناقابل حمایت برائی ہے، جسے خصوصی حالات اور ہنگامی صورت میں جائز قرار دیا گیا ہو گا۔ لیکن اسلامی تاریخ میں ایک لمحہ کے لئے نہ یہ شرط کبھی غائب ہوئی، نہ عدم جواز کا سوال کبھی زیر بحث آیا۔ نتیجہ کے طور پر اس موقف کو تسلیم کرلینا ان کو بھی ناگزیر ہوا جس کی امت مسلمہ قائل چلی آئی ہے، اب ہم یہ فیصلہ عقلاء پر چھوڑتے ہیں کہ ان دونوں میں کون سا موقف حق بجانب ہے۔

(الحق ذو القعدہ ۱۳۸۶ھ)

طلاق کے احکام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد'

جناب عمر احمد عثمانی اس وقت فتنہ انکار حدیث کے سربراہ غلام احمد پرویز کے دست وبازو اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تحریک انکار دین کے سرپرست اور روحِ رواں ہیں' موصوف اس نسبت سے اکثر وبیشتر اسلام کے متفقہ مسائل پر مشق ناز فرمایا کرتے ہیں۔ ذیل میں ان کے ایک مضمون "طلاق کے احکام" (جو ماہنامہ فکر و نظر جلد ۲ شمارہ ۲ تا ۷ میں شائع ہوا ہے) میں کی گئی تحریفات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔ موصوف کے تمام تر اقتباسات فکر و نظر کے درج بالا شماروں سے بلفظہٖ نقل کئے گئے ہیں۔ مقالہ پر تنقید عنوانات اور تعلیقات اور بین القوسین جملوں کی شکل میں ہوگی۔ ذیل میں ان کی تحریفات ملاحظہ ہوں۔

ماڈرن اسلام کی ماڈرن تفسیر:

"الطلاق مرتان فامساک بمعروف اوتسریح باحسان (الی قولہ تعالیٰ) فان طلقھا فلا تحل لہ من بعد حتیٰ تنکح زوجاً غیرہ۔"

ترجمہ :"(ترجمہ کے بعد) ان آیات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے طلاق کا طریقہ یہ ہے کہ ہر طرح کی مصالحتی کوشش بروئے کار آنے کے بعد (لیکن موجودہ فیملی لاز کی شریعت میں قرآنی آیات کے علی الرغم تین طلاقیں دینے کے بعد مصالحتی کوشش بروئے کار لانے' کا فتویٰ صادر فرمایا جاتا ہے' کیا یہ قرآن کی صریح مخالفت تو نہیں ہے؟ (ناقل) جب یہ ثابت ہو جائے کہ میاں بیوی میں نباہ کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی تو شوہر طلاق دے کر معاہدہ نکاح کو فسخ کرنے کا اعلان کر سکتا ہے اس اعلان (ایک طلاق رجعی) سے نکاح با لکلیہ منقطع ہو جاتا ہے؟ یا بدستور باقی رہتا ہے۔ اگر باقی ہے تو مزید طلاق کا حق کیوں نہیں۔؟ ناقل) پہلی مرتبہ اس اعلان کے بعد شوہر کو پھر بھی یہ اختیار باقی رہتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو عدت کے دوران طلاق سے رجوع کرے' قریب تین ماہ کا عرصہ (قرآن کریم ایسی عورتوں کے لئے جنہیں ایام آتے ہوں' عدت طلاق تین حیض (یا تین طہر علیٰ اختلاف القولین بتلاتا ہے لیکن عائلی شریعت میں نوے دن کی عدت کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ ناقل) کچھ کم نہیں ہوتا شوہر اس عرصہ میں اپنے فیصلہ پر نظرثانی کر سکتا ہے' بیوی بھی شوہر کو منانے اور راضی کر لینے کی کوشش کر سکتی ہے' اگر اس عرصہ عدت میں شوہر نے طلاق سے رجوع کر لیا۔ فبہا ورنہ عدت گزر جانے کے بعد رشتہ نکاح با لکلیہ منقطع ہو گیا تاہم اب بھی میاں بیوی کو اس کی اجازت ہے کہ اگر وہ چاہیں تو تجدید معاہدہ کے ساتھ از سرِ نو

دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں اگر شوہر نے عدت کے دوران رجوع کر لیا تھا یا عدت گزر جانے کے بعد تجدید نکاح کر لی تھی، لیکن مزید تجربہ کے بعد پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دونوں کا نباہ ممکن نہیں، اور وہ ایک دوسرے کے حقوق و واجبات کماحقہ ادا نہیں کر سکتے اور شوہر دوسری مرتبہ بھی طلاق دے دیتا ہے تو اس دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد بھی اس کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ دونوں اب بھی اپنی اصلاح کر لیں جو باتیں ایک دوسرے کے لئے وجہ شکایت ہوں ان کا ازالہ کر لیں۔ لہٰذا اگر صورت حال سدھر جانے کی توقع ہو تو شوہر کو اس مرتبہ بھی یہ حق باقی رہتا ہے کہ وہ عدت کے زمانہ میں طلاق سے رجوع کر لے۔ اگر عدت گزر چکی ہے تو میاں بیوی پھر باہمی رضامندی سے تجدیدی معاہدہ کے ذریعے از سر نو نکاح کر سکتے ہیں، اگر اس مرتبہ بھی تجربہ سے یہی ثابت ہوا کہ وہ دونوں واقعی نباہ نہیں کر سکتے اور شوہر تیسری مرتبہ پھر طلاق دے دیتا ہے، تو اب یہ عورت اس کے لئے قطعاً حرام ہو گئی، اب وہ نہ عدت کے دوران اس سے رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدت کے بعد تجدید نکاح کر سکتا ہے، اب یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرے لیکن اگر اس کا گزارا وہاں بھی نہ ہو سکے اور دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے یا وفات پا جائے تو اب یہ عورت اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے کیونکہ اس قدر دھکے کھا لینے کے بعد اب توقع کی جا سکتی ہے کہ شوہر کو بھی اپنی حماقتوں کا احساس ہو گیا ہو گا اور وہ بھی

واقعتاً اس کے ساتھ نباہ کر لینے کے لئے تیار ہو گیا ہو گا۔"

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۹۹۔۱۰۰)

اس تفسیر کا حاصل صرف یہ ہے کہ ایک طلاق کے بعد جب تک رجعت نہ کر لی جائے (یا ختم عدت کے بعد تجدید نکاح نہ کر لی جائے) نہ تو مزید طلاق دینے کا حق ہے اور نہ وہ نافذ ہوں گی لیکن یہ مقالہ نگار کی ذہنی اپج اور خیالی مفروضہ ہے جو عائلی شریعت کی وجہ جواز پیدا کرنے کے لئے تراشا گیا ہے' ورنہ قرآن کریم کے الفاظ سے، اس کی تائید ہوتی ہے شریعت اسلامیہ میں ایک نکاح کے لئے طلاق کا کامل نصاب تین طلاقیں اور اس کے برعکس عائلی شریعت ایک نکاح میں ایک طلاق کا فتویٰ دیتی ہے۔

طلاق سنت میں صحابہؓ اور فقہا کے مذاہب کی تفصیل

"اہل علم کا اس میں اختلاف ہے کہ ان عورتوں کے لئے جنہیں ایام آتے ہوں طلاق سنت کیا ہوتی ہے چنانچہ ہمارے اصحاب (تمام علمائے احناف) نے کہا ہے کہ بہترین طلاق دینے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو س وقت طلاق دے جب وہ ایام سے پاک ہو چکی ہو اور وہ اس کے پاس نہ گیا ہو' پھر وہ اسے چھوڑ دے تاآنکہ اس کی عدت پوری ہو جائے' اور اگر وہ اسے تین طلاقیں دینا چاہتا ہو' تو ہر طہر کے وقت ایک طلاق دے دے' اس کے پاس جانے سے پہلے پہلے ---- سفیان ثوریؒ کا قول یہی ہے' اور امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ ہمیں ابراہیم نخعیؒ کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے متعلق یہ بات پہنچی ہے کہ وہ اسی کو پسند کرتے تھے کہ لوگ ایک سے زیادہ طلاقیں نہ دیں حتی کہ

عورت کی عدت گذر جائے اور یہ صورت ان کے نزدیک اس سے افضل ہے کہ آدمی ہر طہر کے وقت ایک ایک طلاق کر کے اسے تین طلاقیں دے دے"۔(اگرچہ یہ دوسری صورت بھی ان کے نزدیک جائز تھی' اور وہ تین طہروں میں دی گئی تین طلاق کو شرعاً صحیح اور نافذ سمجھتے تھے' اور یہی حنفیہؒ کا مذہب ہے جیسا کہ اوپر معلوم ہوا۔ ناقل) امام مالکؒ بن تعزیر بن سلمتہ الماجشونؒ' لیث بن سعدؒ' حسن بن صلاحؒ' اور امام اوزاعیؒ نے کہا ہے کہ طلاق سنت یہ ہے کہ عورت کو طہر میں مقاربت سے پہلے ایک طلاق دے دی جائے یہ حضرات عورت کو تین طہروں میں تین طلاقیں دینے کو مکروہ (ناپسند) سمجھتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ اگر آدمی اس سے رجوع کرنا نہیں چاہتا تو وہ ایک طلاق دے کر اسے چھوڑ دے تاآنکہ اس کی عدت پوری ہو جائے (تاہم یہ تین طلاقیں ان کے نزدیک نافذ اور شرعاً معتبر ہوں گی کمافی الموطا۔ ناقل) امام شافعیؒ نے فرمایا ہے' جیسا کہ مزنی نے ان سے روایت کی ہے کہ شوہر کے لئے تین طلاقیں دینا حرام نہیں' اگر شوہر اپنی بیوی سے کہہ دے کہ تجھے سنت کے مطابق تین طلاقیں ہیں' اور عورت پاک ہو چکی ہو اور شوہر اس کے پاس نہ گیا ہو تو تینوں طلاقیں ایک ساتھ پڑ جائیں گی۔"

(بحوالہ امام ابوبکر جصاصؒ احکام القرآن ص ۴۲۶ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۱۰۳)

ان تمام مذاہب کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگر تین طلاقیں' تین طہروں میں متفرق کر کے واقع کی جائیں تو باجماع نافذ ہو جائیں گی' اور بیوی مغلظہ ہو جائے گی البتہ

احناف کے نزدیک یہ صورت غیر احسن ہے تمام صحابہؓ کے نزدیک غیر افضل ہے اور امام مالکؒ وغیرہ کے نزدیک کراہت اور ناپسندیدگی کا پہلو رکھتی ہے لیکن نہ تو ایک سے زائد طلاق کا ایک نکاح اور متفرق طہروں میں کسی نے کبھی حق سلب کیا ہے' نہ اسے غیر نافذ' غیر معتبر' لغو اور لایعنی قرار دیا ہے۔

تمام امت کا یہ فتویٰ کہ تین طہروں میں تین طلاقیں واقع کرنا صحیح اور نافذ ہے تلاعب بالقرآن ہے:

"اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس شخص کا جرم جو اپنی بیوی کو تین طہروں میں تین طلاقیں دے کر اسے اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے' اس شخص کے مقابلے میں زیادہ شدید ہے جو بیک وقت تین طلاقیں دے کر اسے اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے' کیونکہ یہ دوسرا شخص محض خدا کے ایک حکم کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے مگر پہلا شخص قرآن کے الفاظ سے کھیلتا ہے اور قرآن کے منشا کے خلاف عمل کرتے ہوئے خود قرآن ہی کے الفاظ کی آڑ لیتا ہے"۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۶۵)

تین طہر میں تین طلاق کے قائلین قرآنی منشا سے منحرف' یہودی ذہنیت کے مالک اور قرآنی روح کے پامال کنندہ ہیں' خطرہ ہے کہ کہیں انہیں بندر نہ بنا دیا جائے

"لیکن کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جو قرآن کے اس منشا پر تو عمل کرنا نہیں چاہتے حکم کی روح کو کچل کر حکم کے الفاظ کی آڑ لینا

چاہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ قرآن نے یہی فرمایا ہے تاکہ تین طلاقیں تین مرتبہ کر کے مختلف اوقات میں دی جائیں' لہٰذا ہم بھی یہ تین طلاقیں تین طہروں میں کر کے دے دیتے ہیں' تاکہ قرآن کے الفاظ کی گرفت سے بھی بچ جائیں' اور بیوی کو اپنے اوپر یوں حرام بھی کر لیں' یہ وہی "یہودی ذہنیت" ہے جو وحی الٰہی کے منشا کے خلاف وحی کے الفاظ سے کھیلنے کی عادی رہ چکی ہے۔ (یہاں اصحاب السبت کا واقعہ مذکور ہے۔ ناقل) بعینہ یہ حال ان لوگوں کا ہے کہ وہ بھی یہودیوں کی طرح قرآن کی روح کو پامال کر کے قرآن کریم کے الفاظ سے کھیلنا چاہتے ہیں ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی صورتیں مسخ کر کے ان کو ذلیل بندر بنا دیا تھا۔"

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۶۵۔۱۶۶)

کچھ لوگ نہیں بلکہ خود مقالہ نگار کی نقل کے موافق تمام صحابہؓ' تابعینؒ' اور ائمہ مجتہدینؒ بلکہ "عائلی شریعت" کے نافذ ہونے سے قبل کی تمام امت اگر فاضل و فقیہہ مقالہ نگار کے نزدیک ان بد ترین جرائم کے مرتکب صرف "کچھ لوگ" ہیں تو وہ ان "بہت سے لوگوں" کا نام بتلائیں جن کے نزدیک تین طہروں کی تین طلاقیں شرعاً غیر معتبر ہیں۔ اور وہ ان تینوں کو صرف ایک رجعی طلاق قرار دیتے ہیں۔

ایک عجیب و غریب نکتہ "یقیناً — اور — ہوں گے"

" ان میں "یقیناً" ایسے لوگ بھی ہوں گے جو سیدھی سادھی طرح خدا کی نافرمانی کر کے سبت کے دن بھی مچھلیوں کا شکار کھیل

لیتے "ہوں گے" مگر خدا نے ان کو یہ سخت سزا نہیں دی تھی۔"

(فکر و نظر جلد ۲ شمارہ ۳، ص۱۶۶-۱۶۷)

اصحاب سبت کا واقعہ قرآن کریم میں بھی مذکور ہے لیکن یہ "یقیناً ہوں" گے کی منطق کہاں مذکور ہے، کیا یہ مقالہ نگار کا اجتہاد فی التاریخ تو نہیں۔" (ناقل)۔

ان تمام حضرات کا یہ فتویٰ الفاظ قرآن کے خلاف ہے :

" یہ طریقہ طلاق جسے بد قسمتی سے طلاق مسنون کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ کے خلاف ہے۔"

(حوالہ بالا ص ۱۷۵)

بلکہ عقل و بصیرت کے بھی

"صرف اتنا ہی نہیں کہ" مروجہ مسلک (جس کی تائید صحابہ کرامؓ کے اجماعی فتوی سے حاصل ہے۔ (ناقل) قرآن کریم کے خلاف ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو عقل و بصیرت کے خلاف بھی معلوم ہوتا ہے۔"

(حوالہ بالا ص ۱۷۶)

دور فاروقی کا حسین مرقع محمد حسین ہیکل کی زبانی :

" اغلب گمان یہ ہے کہ جو لوگ حضرت عمرؓ کے عہد میں اپنی بیویوں کو طلاقیں دیتے تھے، وہ طلاق دینے کے بعد بیویوں کے ساتھ مہربانی کا کوئی سلوک نہیں کرتے تھے بات یہ تھی کہ عراق و شام سے گرفتار ہو ہو کر بیشمار عورتیں آ گئی تھیں، مدینہ منورہ بلکہ تمام جزیرہ

عرب کے لوگ ان کے حسن و جمال کے گرویدہ ہو رہے تھے' لہٰذا لوگ اپنی بیویوں کو دھڑادھڑ طلاقیں دینے لگے تھے' تاکہ ان حسین و جمیل لڑکیوں کی رضامندی حاصل کر سکیں جو ان کے دلوں پر قبضہ جما چکی تھیں' یہ لوگ تین طلاقیں ایک ہی لفظ سے دیتے تھے' تاکہ وہ "ناز آفریں حسینائیں" بھی مطمئن ہو جائیں کہ اب وہ شوہروں کے دلوں پر تنہا حکمرانی کر سکیں گی' اور انہیں رجوع کرنے کا حق بھی رہے گا)۔ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۷ ص ۴۱۷)

یاد رہے کہ محمد حسین ہیکل اور محمد امین مصری' مصر کے فضل الرحمٰن اور پرویز ہیں' محمد حسین صاحب نے 'اغلب گمان یہ ہے' کے ساتھ یہ ساری افسانہ طرازی کی ہے جس کا وجود ان کے اغلب گمان سے خارج نہیں پایا جاتا اور یہ خالص مغاربہ اور ان کے ہم رنگ مشارقہ کا انداز ناول نویسی ہے' بدقسمتی ہے کہ یہ لوگ خلفا راشدین' بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو بھی ناول اور افسانہ کے رنگ میں لکھنے پڑھنے کے خوگر ہیں' ان کی تحقیقات کا بیشتر حصہ محض فرضی ہوتا ہے۔

نیز بین القوسین کا اضافہ فاضل و فقیہ مقالہ نگار کی جانب سے ہے ورنہ ہیکل کو بھی یہ نہیں سوجھی۔

خلیفہ راشد نے "عربی عصبیت" کی خاطر قرآن کا حکم بدل دیا؟

"حضرت عمرؓ اپنی قوم کے مزاج سے خوب واقف تھے' وہ جانتے تھے کہ اگرچہ وقتی جوش کے ماتحت عرب نوجوان عجمی عورتوں کے حسن و جمال کے گرویدہ ہو رہے ہیں لیکن ان کی عربی عصبیت کا

ایک ابھرتی ہوئی قوم کے لئے اپنی قومی عصبیت کا تحفظ بھی انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے اس عربی عصبیت کو برقرار رکھنے کے لئے اس سے (تین طلاقوں کے نافذ کرنے سے) یہ فائدہ اٹھایا۔"

(فکرو نظر جلد ۲ ش ۷ ص ۴۲۲-۴۲۳)

یہ فیصلہ قرآنی حکم کی روح کو پامال کرنے اور اس کے استخفاف واستہزا پر مشتمل ہے:

" اس مضمون کی پچھلی قسط میں ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے طلاقیں صرف تین مرتبہ الگ الگ وقفہ کے ساتھ ہو سکتی ہیں اور ایک عدت کے شروع میں ایک طلاق ہی ہو سکتی ہے۔ پہلی دو مرتبہ کی طلاقوں میں مرد کو رجوع کرنے کا حق ہوتا ہے اور تیسری مرتبہ کی طلاق میں رجوع کرنے کا حق نہیں رہتا' قرآن کریم کی رو سے کئی کئی طلاقیں (دو یا تین) ایک وقت میں نہیں دی جاسکتیں۔ اور نہ مختصر وقفوں کے ساتھ ہی ایک ایک طہر میں ایک ایک طلاق کر کے دی جا سکتی ہیں یہ صورت قرآنی حکم کی رو کو پامال کرنے اور اس کے استخفاف و استہزا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بیک وقت کئی کئی طلاقیں دے دینے سے بھی بری ہے۔"

(ایضا ص ۴۲۴-۴۲۵)

صحابہ' تابعین اور ائمہ فقہا کا فیصلہ محرف حکم کی اتباع میں تھا

" صحابہ' تابعین' اور ائمہ فقہا کی اکثریت کا فیصلہ دراصل

حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کے ماتحت تھا لہٰذا اگر وہ وجوہ موجود نہیں' جو حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کا باعث بنی تھیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ قرآن کریم' سنت رسول اور قیاس' اور مصالح عامہ کو مسلسل نظرانداز کیا جاتا رہے' اور جو فیصلہ (قرآن کریم سنت رسول' قیاس اور مصالح عامہ ان سب کے علی الرغم وقتی ضروریات اور ہنگامی مصالح (یعنی قومی عصبیت کی حفاظت۔ ناقل) کے ماتحت کسی ایک وقت میں ضرورتاً کرلیا گیا تو (اور اس پر بقول خود ان کے اجماع منعقد ہوگیا تھا۔ ناقل) اسے دوامی حیثیت دے دی جائے۔"

(ایضاً ص ۴۲۶)

نتیجہ! نتیجہ!! نتیجہ!!!

"لہٰذا چونکہ وہ ضرورتیں اور مصلحتیں جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں پیدا ہوگئی تھیں (جن کی وجہ سے ان کے بقول قرآن کے اصل حکم کو بدل کر روح حکم کے استخفاف و استہزا اور اس کی پامالی کا ارتکاب کیا گیا تھا (ناقل) اب باقی نہیں رہیں' اس لئے ہمیں اصل حکم کی طرف لوٹنا چاہیئے' جو شریعت اسلامی نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے۔"

(فکر و نظر ج ۲ ش ۷ ص ۱۲۷)

گویا مقالہ نگار امت مسلمہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہمیں فرضی ضرورتوں کے لئے معاذ اللہ حضرت عمرؓ صحابہؓ تابعینؒ اور ائمہ فقہاؒ کی طرح شریعت اسلامی کے اصل حکم کو بدل کر ان قبیح جرائم کے ارتکاب کی مزید غلطی نہیں کرنی چاہیئے اور جو مطلقہ

عورتیں حضرت عمرؓ صحابہ و تابعین اور ائمہ فقہا کے فیصلہ کے موافق اپنے شوہروں کے لئے قطعی حرام ہو گئی ہوں انہیں مطلقہ رجعیہ قرار دے کر تین طلاق دینے والے شوہروں کے پاس ٹھہرنے پر قانوناً مجبور کرنا چاہیئے اس طرح عائلی شریعت کی روح بھی خوش ہو جائے گی اور زناکاری کے لئے شرعی جواز بھی پیدا ہو جائے گا اور خاندانی منصوبہ بندی کی بدولت بن باپ کے بچوں کی تعداد میں اگر کچھ کسر رہ جائے گی تو اس شرعی جواز سے پیدا شدہ فرضی باپ کے بچوں سے وہ بھی پوری ہو جائے گی۔

پھر کون نہیں جانتا کہ اسلام قومی عصبیت کے بت توڑنے کے لئے آیا تھا، لیکن مقالہ نگار کے تفقہ کی داد دیجئے کہ انہوں نے ہیکل صاحب کی افسانہ نگاری سے خلیفہ راشدؓ کے خلاف (معاذاللہ) قومی عصبیت کی برقراری کے لئے تحریف حکم قرآن کی دستاویز بھی مرتب کر لی اور محرف کے حکم پر صحابہؓ و تابعینؒ کے جمع ہو جانے کو بھی جائز قرار دے لیا۔(ناقل)

(ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک ۱۳۸۶ھ اپریل ۱۹۶۷ء)

یتیم پوتے کی وراثت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی۔ اما بعد'

جناب عمر احمد عثمانی صاحب اس وقت منکرین حدیث اور ڈاکٹر فضل الرحمان ایسے ملحدین کے ترجمان اور سرپرست کا کردار ادا کررہے ہیں' جناب عثمانی صاحب اپنے افکار ونظریات کو تحریر کا جامہ پہنا کر خامہ' قرطاس پر لاتے ہیں تو ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب اپنی تنقیدات و تحقیقات کی عمارت اس پر اٹھاتے ہیں۔

ذیل میں یتیم پوتے کی وراثت کے بارہ میں جناب عمر احمد عثمانی کی تحریفات مشمولہ فکر و نظر جلد ۳ ش ۴۔۵۔۶ سے مندرجہ ذیل اقتباسات بہ لفظہ ماخوذ ہیں۔ تنقید' عنوانات' بین القوسین اور تفصیلی تنقیدات کی شکل میں ہے۔

مولانا مودودی کا فتویٰ

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

"فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وارث نہیں ہوتا' بلکہ

وارث اس کے چچا ہوتے ہیں جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے علاوہ کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا ہے، جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جا سکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں، اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔"

(رسالہ ترجمان بابت ماہ مارچ ۱۹۵۲ء) (فکرو نظر اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۳۰۴)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ اقتباس (مع اختصار) اس لئے نقل کرنا ناگزیر ہوا کہ فاضل مقالہ نگار نے اسی کو طرح مصرع قرار دیا ہے اسے نقل کئے بغیر ان کے آئندہ اقتباسات کا مفہوم واضح نہ ہو سکتا۔

مولانا مودودی کا یہ کہنا کہ "جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے علاوہ کسی کا اختلاف نہیں" یہ مولانا کا تسامح ہے ورنہ شیعہ حضرات کا بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں، چنانچہ ان کی معتبر کتب "من لا یحضرہ الفقیہ" "الاستبصار" اور "فروع کافی" وغیرہ میں تصریح ہے، کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مولانا کی نقل کا ماخذ کیا ہے؟

بات کا بتنگڑ

عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

" مولانا موصوف نے اپنے اس جواب میں اس امر کا اعتراف فرما لیا ہے کہ مولانا موصوف کو اپنی انتہائی کوشش (یہ

"انتہائی کوشش" کا صریح پیوند' مذکورہ عبارت سے کیسے نکل آیا؟۔ ناقل) کے باوجود قرآن و حدیث میں ایسا کوئی صریح حکم نہ ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنیاد قرار دیا جا سکے (نفی "صریح حکم" کے ملنے کی کی گئی ہے' یا "وجود حکم کی قطعی نفی" کا دعویٰ کیا گیا ہے جو حکم قرآن وحدیث میں صراحتاً موجود نہ ہو بلکہ کسی آیت یا حدیث سے صحیح اصول استنباط کے ساتھ مستنبط اور سلف سے خلف تک تمام امت کا بلا کسی اختلاف کے اس کے استنباط کی صحت پر اتفاق ہو آپ اسے کس "صریح دلیل" سے رد کردیں گے۔ ناقل)

اور نہ صرف یہ کہ مولانا موصوف ہی کو ایسا کوئی صریح حکم نہیں مل سکا جسے فقہا کے متفقہ فیصلہ کی بنیاد کہا جا سکے بلکہ اس پورے بارہ سال کے عرصہ میں پورے ملک میں کسی دوسرے عالم دین نے بھی آج تک نہ کوئی قرآن کریم کی صریح آیت پیش فرمائی ہے (یہ برخود غلط پروپیگنڈا ہے جو فکرو نظر کے فاضل و فقیہ مقالہ نگار کی ذہنی غذا ہے' اس کے لئے کم از کم بینات دسمبر ۱۹۶۲ء اور ماہ جنوری ۱۹۶۳ء میں مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی کے عالمانہ مقالہ کا مطالعہ فرما لیا جائے لیکن اس کا کیا علاج کیا جا سکتا ہے کہ الحاد اور زندقہ کے پردے عقل وبصیرت پر چھائے ہوئے ہیں۔

ع چہ کنم چشم بد خو نہ کند بکس نگاہے۔ ناقل)

اور نہ کوئی صریح اور صحیح حدیث نبوی' جس کے معنی

یہ ہیں کہ پورے پاکستان میں کسی عالم دین کو آج تک کوئی قرآن و حدیث کا ایسا صریح حکم نہیں مل سکا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنیاد بنایا جاسکے۔"

(فکر و نظر اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۳۰۶)

سلف سے خلف تک تمام امت پر تحریف کا الزام اور اس کے مبادیات

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

"مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے خلافت راشدہ کے آخری وقت (اس سے کسی کو یہ وہم نہ ہونا چاہئے کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک خلافت راشدہ ۳۵ھ پر ختم ہو گئی اور یہ کہ معاذ اللہ شاہ صاحب کے نزدیک حضرت علیؓ کی خلافت، خلافت راشدہ نہ تھی بلکہ یہاں خلافت راشدہ سے مراد وہ خلافت خاصہ ہے جس میں دور نبوت کی برکات پوری طرح موجود تھیں، تفصیل کے لئے ازالۃ الخفا کا مطالعہ فرمایا جائے۔ ناقل) یعنی شہادت عثمان غنیؓ (۳۵ھ) تک شاہ صاحبؒ کی تحقیق میں مسلمانوں میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ (یعنی عقاید و نظریات کا اختلاف، ورنہ فروعی مسائل کا اختلاف اس وقت بھی تھا، ملاحظہ ہو حجتہ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۴۰ باب اسباب اختلاف الصحابتہ والتابعین فی الفروع۔ ناقل) وہ اس

دور کو دور اجماع کہتے تھے' (یعنی جو مسائل اس دور میں بلا کسی اختلاف کے تسلیم کئے گئے وہ مسائل اجماعی مسائل کہلائیں گے آئندہ کسی کو ان میں اختلاف کرنے کی گنجائش نہ ہو گی۔ ناقل) اس کی تفصیل ازالۃ الخفاء میں مذکور ہے۔ شہادت عثمانؓ کے بعد اختلاف شروع ہوا اب وہی اجماع مستند ہو گا جو مذکورہ دور اول کے تتبع میں منعقد ہو' شاہ صاحبؒ اسی دور کو خیر القرون قرار دیتے ہیں۔ اس کی پوری تفصیل ازالۃ الخفا میں موجود ہے"۔

(ماہنامہ الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ نمبر)

اس کے بعد خود حضرت شاہ صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ :

"اور اسباب تحریف میں اجماع کی پیروی ہے' اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ حاملین دین کا ایک فرقہ (گروہ جماعت) جن کی نسبت عام لوگوں کا یہ گمان ہو کہ ان کی رائے اکثر یا ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ کسی امر پر اتفاق کرے' اور اس اتفاق سے یہ خیال کیا جائے کہ ثبوت حکم کے لئے یہ اتفاق قطعی دلیل ہے' اور یہ اجماع ایسے امر میں ہے جس کی قرآن و حدیث میں کوئی اصل نہیں ملتی۔

(یہ اجماع اس اجماع کے علاوہ ہے جس پر امت کا اتفاق ہے کیونکہ سب کے سب لوگ ایسے اجماع پر متفق ہیں' جس کی سند قرآن و حدیث میں ہو' یا ان دونوں میں سے کسی نہ کسی سے مستنبط ہو' اور لوگوں نے ایسے اجماع کو جائز قرار

نہیں دیا جس کی سند قرآن و حدیث میں کوئی بھی نہ ہو۔)
چنانچہ اس قول الٰہی میں اسی طرف اشارہ ہے اور جب کفار سے کہا جاتا ہے کہ ان چیزوں پر ایمان لے آؤ جو خدا تعالیٰ نے نازل کی ہیں تو وہ بھی جواب دیتے ہیں کہ ہم تو ان ہی باتوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔"

(اردو ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۲۰۸ مطبوعہ نور محمد کراچی)

ان تصریحات کی روشنی میں (لیکن کیا انہی تصریحات کی روشنی میں مقالہ نگار اپنے اور اپنے ادارہ تحقیقات کے موقف کا جائزہ لینے کے لئے بھی تیار ہوں گے۔ ناقل) ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ :

۱ ــــ کیا شہادت عثمانؓ سے پہلے پہلے حضرات صحابہ کرام نے کبھی کسی مقام پر جمع ہو کر بالاتفاق اپنے اس فیصلے کا اعلان فرمایا تھا کہ ہم اس امر پر اجماع کرتے ہیں کہ یتیم پوتا اپنے دادا کی میراث سے حصہ نہیں پا سکے گا۔ اور سارا ترکہ اس کے چچا کو مل جائے گا اگر حضرات صحابہ کرامؓ نے ایسا کوئی اعلان شہادت عثمانؓ سے پہلے پہلے فرمایا تھا تو کہاں اس کی نشاندہی ہونی چاہئے۔

۲ ــــ اگر ایسا اجماع منعقد ہو چکا ہے تو اس کی سند قرآن کریم کی کون سی آیت یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کون سے ارشاد سے ملتی ہے؟ یا وہ کون سی قرآنی آیت یا

کون سی حدیث نبوی سے مستنبط ہے۔ کیونکہ شاہ صاحبؒ کی تصریح کے موافق اس کے بغیر فقہا کرام کے نزدیک کوئی اجماع حجت نہیں ہو سکتا۔

۳ ------- اگر ایسی کوئی بات نہیں (اور ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے) تو کیا ایسے کسی اجماع یا اتفاق کو جس کی سند قرآن و حدیث سے نہ مل سکے اور نہ ہی وہ قرآن و حدیث سے مستنبط ہو فقہا کے متفقہ فیصلہ کی بنا پر جائز کہا جا سکتا ہے؟

۴ : ------ کیا ایسے کسی اجماع یا اتفاق کو جو قرآن و حدیث سے مستند یا مستنبط نہ ہو حضرت شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں (کیونکہ یہ بات کسی دوسرے آدمی کے بس کی بات نہیں تھی اسے شاہ صاحبؒ جیسا آدمی ہی کہہ سکتا تھا) اسباب تحریف میں سے ایک سبب شمار نہیں کیا جائے گا۔

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۴ ص ۳۰۸ تا ۳۱۰)

"محقق" مقالہ نگار کے اس طویل اقتباس میں چند امور لائق توجہ ہیں:

○ مقالہ نگار نے امت کے اس اجماعی فیصلہ کو کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا۔ تحریف قرار دینے کے لئے بلا فہم و تدبر، شاہ صاحبؒ کی دو عبارتیں پیش کیں، ایک حضرت سندھیؒ کی روایت سے، اور دوسری خود شاہ صاحبؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے اردو ترجمہ سے ہم نے یہ دونوں عبارتیں یہاں من و عن نقل کر دی ہیں لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان دونوں

عبارتوں سے امتِ کے سلف سے خلف تک پر تحریف کا قرطاس ابیض کیسے مرتب کر لیا گیا کیونکہ پہلی عبارت کا مفاد صرف اتنا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک خلافت خاصہ کا دور دور اجماع کہلانے کا مستحق ہے اس لئے اس دور میں جو مسائل محل نزاع نہیں بنے' ان کو اجماعی مسائل کہا جائے گا' اور بعد میں کسی کو یہ حق نہیں ہوگا' کہ ان میں مشاغبہ کرے' چنانچہ ازالۃ الخفا میں--- جس کا حوالہ مولانا سندھیؒ نے دیا' اور مقالہ نگار کو اصل کتاب سے نقل کرنے کی جرأت نہ ہوئی ٹھیک یہی بات شاہ صاحبؒ نے فرمائی ہے' فرماتے ہیں :

" شرائع ملت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) دو قسم است' قسمے آنست کہ پردہ ازروئے حقیقت دراں قسم برانداختہ شد و تکلیف ناس باں متحقق گشت' اگر کسے بہ شبہ ضعیفہ متمسک شدہ بخلاف آں قائل شود معذور نہ گردد' ومقلد آں قائل نیز معذور نہ باشد' فی الحقیقت مدار شریعت ہماں احکام است و تسنن و ابتداع بہ قبول ورد آں منوط وعندکم من اللہ فیہ برھان ۔ براں صادق و آں ماخوذ است از صریح کتاب یا صریح سنت مشہورہ یا اجماع طبقہ اولیٰ' یا قیاس جلی برکتاب و سنت' چوں حکمے بایں وجہ ثابت شود مجال خلاف نماند و مخالف آں معذور نباشد۔"

(ازالۃ الخفا طبع جدید ج ۱ ص ۳۰۷)

ترجمہ :"دین محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام دو قسم کے ہیں' ایک قسم وہ ہے کہ ان میں اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیا

گیا ہے۔ (شریعت نے ان کو صاف کھول کر بیان کر دیا) اور لوگوں کا ان احکام کے ساتھ مکلف ہونا ثابت ہو چکا ہے اب اگر کوئی شخص کسی کمزور شبہ کو دستاویز بنا کر ان احکام کی مخالفت کرتا ہے وہ قطعاً معذور نہ ہوگا اور نہ اس کا مقلد معذور ہوگا' درحقیقت مدار شریعت یہی احکام ہیں سنی اور بدعتی ہونا ان ہی احکام کے قبول کرنے یا رد کر دینے سے وابستہ ہے' اور عندکم من اللہ فیہ برھان (تمہارے پاس اللہ کی جانب سے اس میں واضح دلیل آ چکی ہو) جو صریح کتاب اللہ یا صریح سنت مشہورہ یا طبقہ اولی کے اجماع یا کتاب و سنت پر قیاس جلی سے حاصل شدہ ہوں چنانچہ جب کوئی حکم ان چار میں سے کسی ایک وجہ سے ثابت ہوگا' اس میں مخالفت کی کوئی گنجائش نہ رہے گی اور ایسے حکم کی مخالفت کرنے والا معذور نہ ہوگا۔"

اس کے بعد "دوسری قسم اجتہادی مسائل" کو ذکر کرنے کے بعد اگلے صفحہ پر خلفائے راشدین کی قریشیت ان کے سوابق اسلامیہ اور بشارت جنت کو قسم اول میں شمار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" حجۃ اللہ بر منکران آنہا قائم است و شبہات رکیکہ ایشان عنداللہ معذور نہ ساخت ایشاں را و منکر ایشاں مبتدع است دور از حق برہان اللہ اورا از بساط محمدیین صلی اللہ علی متبوعھم مطرود و مقہور گردانیدہ بدعۃ مکفرۃ عند البعض و مفسقۃ عند الاخرین۔" (ازالۃ الخفاج ۱ ص ۳۰۸)

ترجمہ :"ان امور کے منکرین پر حجت الٰہی قائم ہے' اور ان کے واہی تباہی شبہات انہیں عنداللہ معذور نہیں بنا سکتے ان امور کا منکر مبتدع ہے۔ حق سے دور ہے برہان الٰہی نے اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بساط سے مطرود و مقہور کر کے باہر نکال دیا ہے ان کی یہ بدعت بقول بعض موجب کفر ہے اور بعض کے نزدیک بدترین فسق کی موجب ہے۔"

شاہ صاحبؒ کی ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو احکام طبقہ اولیٰ میں محل نزاع و بحث نہیں رہے' بلکہ انہیں بالاتفاق تسلیم کیا گیا' ان میں اور کسی مخالف رائے کا اظہار اس دور میں نہیں ہوا وہ احکام اسی طرح قطعی ہیں جس طرح صریح کتاب اللہ' اور صریح سنت مشہورہ سے ثابت شدہ احکام قطعی ہیں ایسے احکام کی مخالفت کرنے والا شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں بدعتی' حق سے دور' اور ملت اسلامیہ سے مطرود و مقہور کہلائے گا وہ ہزاروں شبہات رکیکہ پیش کرے لیکن نہ وہ عنداللہ ان شبہات کی وجہ سے معذور ہوگا' نہ اس کے یہ شبہات کسی درجہ میں مستحق توجہ قرار دئے جائیں گے۔

اب ہم مقالہ نگار سے ان ہی کی پیش کردہ شہادت کو سامنے رکھ کر سوال کرتے ہیں کہ کیا دور نبوت اور دور خلافت راشدہ (یا مولانا سندھیؒ کے الفاظ میں دور اجماع) میں کسی پوتے کو بیٹے کی موجودگی میں میراث دلائی گئی؟ یا کیا یہ مسئلہ دور اجماع میں کبھی نزاع و اختلاف کا نشانہ بنا؟ کیا ہیکل اور محمد امین مصری جیسے لوگوں نے بھی کوئی ایسا واقعہ نقل کیا؟ اگر نہیں (اور یقیناً نہیں) تو کیا وہ خود اپنے پیش کردہ آئینہ میں اپنی بدعت مکفرہ یا مفسقہ حق سے دوری' اور بساط محمدیین سے مطرودیت و مقہوریت کا بھیانک چہرہ دیکھنا پسند کریں گے؟

لگے ہاتھوں یہ بھی فرما دیا جائے کہ آپ کا نام نہاد "ادارہ تحقیقات" جو صرف اجماعی مسائل کو نہیں بلکہ صریح کتاب اور صریح سنت مشہورہ کے قطعی مسائل کو بھی وقتی اور عامی قرار دے کر بدل ڈالنا "کار ثواب" قرار دیتا ہے شاہ صاحبؒ کے نزدیک اس کی بدعت حق سے دور، مطرودیت مقہوریت، خروج از ملت اسلامیہ اور تکفیر عند البعض یا تفسیق اشد الفسق عند آخرین کا مقام بلند کیا ہو گا؟

○ موصوف کا یہ کہنا کہ "اسباب تحریف میں اجماع کی پیروی ہے"۔ یہ دوسری عبارت ہے جو امت پر تحریف کی فرد جرم عائد کرنے کی غرض سے مقالہ نگار نے حجتہ اللہ کے اردو ترجمہ سے نقل کی ہے، ہم نے اپنے ناظرین کی سہولت کے لئے اسے قوسین کے ذریعہ دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے حصہ میں شاہ صاحب (اسباب تحریف کو شمار کرتے ہوئے) ایسے اجماع کو موجب تحریف قرار دیتے ہیں جس کی دعوت آج کل ادارہ تحقیقات اسلامی کی جانب سے دی جا رہی ہے یعنی کسی ملک کے یا چند ممالک کے کچھ لوگ مل کر اگر کسی مسئلہ پر اتفاق کر لیں، خواہ قرآن و حدیث میں اس کی کوئی سند نہ ہو تو اس کے بارے میں یہ باور کرایا جائے گا کہ ہمارے دور میں یہی دینی مسئلہ ہے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں، کہ یہ شرعی مسئلہ نہیں ہو گا، بلکہ اسے شرعی مسئلہ قرار دینا شریعت محمدیہؐ میں تحریف ہے، اگر ایسے نام نہاد اجماع کو صحیح مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ چند ہی سالوں میں دین اسلام کا حلیہ بگڑ جائے گا، اور شریعت محمدیہ بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گی۔

بظاہر شاہ صاحبؒ کا مقصد یعنی اسباب تحریف کا بیان کرنا اتنے فقرہ سے پورا ہو جاتا تھا لیکن ان کی "ایمانی فراست" کو فوراً تنبہ ہوا کہ کہیں ان کی اس

عبارت سے کسی زندیق کو اجماع امت کے خلاف زہر افشانی کا موقع نہ مل جائے' اس لئے وہ معاً بطور استدراک فرماتے ہیں :

(واضح رہے کہ) یہ "اجماع' اس اجماع کے علاوہ ہے جس پر امت کا اتفاق ہے۔

اب اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحبؒ اجماع امت کی طرف سے خودبخود بطور وکیل صفائی پیش ہو کر اعلان فرماتے ہیں کہ سلف سے خلف تک کے کسی متفقہ فیصلہ اور اجماعی مسئلہ کو اسباب تحریف قرار دے کر ٹھکرا دینا نہ صرف غیر صحیح ہے بلکہ خود تحریف کا موجب ہے اب اس پر شاہ صاحبؒ کی دلیل سنیئے' فرماتے ہیں :

"کیونکہ "سب کے سب لوگ" ایسے اجماع پر متفق ہیں جس کی سند قرآن و حدیث میں ہو' یا ان دونوں میں سے کسی نہ کسی سے مستنبط ہو۔"

یعنی شاہ صاحبؒ پوری ذمہ داری سے اعلان کرتے ہیں کہ امت محمدیہؐ کا اجماع صرف ان ہی مسائل پر ہوا ہے اور سب کے سب لوگ صرف اسی اجماعی مسئلہ پر متفق ہوئے ہیں جس کی سند قرآن و حدیث میں صراحتاً یا استنباطاً پائی جاتی ہے اور ایسے کسی مسئلہ پر امت متفق نہیں ہوتی جس کی سند قرآن و حدیث میں موجود نہ ہو۔ نہ ایسے اجماع کو صحیح کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک امت کے تمام اجماعی مسائل قرآن و حدیث کی صراحت یا استنباط پر مبنی ہیں اور چونکہ استنباط کبھی خفی ہوتا ہے' اس لئے ضروری نہیں کہ کالج کے چند گریجویٹوں یا کسی مغربی قسم کی یونیورسٹی کے چند پروفیسروں کو بھی سند اجماع کا علم ہو' اور یہ کہ اجماع امت کی مخالفت براہ

راست قرآن و حدیث ہی کی مخالفت ہے اس لئے خرق اجماع حرام ہے بلکہ بعض مواقع میں کفر ہے۔ (ملاحظہ ہو اکفار الملحدین فی ضروریات الدین)۔

اب مقالہ نگار بتلائیں کہ شاہ صاحبؒ کی یہ دونوں عبارتیں انہوں نے کس مرض کے علاج کے لئے نقل کر دیں، کیا وہ شاہ صاحبؒ کی تصریح کے علی الرغم صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ کے اجماع کو چیلنج کریں گے؟ کیا ان کی عقل یہ باور کرتی ہے کہ تمام صحابہؓ، تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ دین میں تحریف کے مرتکب رہے اور یا ان کے اس خانہ ساز نظریہ میں کوئی جان ہے کہ چودہ صدیوں کی امت قرآنی حکم (پوتے کی میراث بیٹے کی موجودگی میں) کے بارے میں ٹھوکریں کھاتی رہی اور جب سے قلم مقالہ نگار ایسے اہل تحقیق کے ہاتھ آیا تب لوگوں کی آنکھیں کھلیں ان کے لئے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اور انہیں یکایک انکشاف ہوا کہ اف! تمام امت تو اس مسئلہ میں غلط کار ہی رہی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

○ مقالہ نگار کا یہ کہنا کہ "کیا صحابہ کرامؓ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت سے پہلے کسی مقام پر جمع ہو کر یتیم پوتے کے وارث ہونے کے اجماع کا اعلان کیا تھا؟"

اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ "اجماع صحابہ" کا مفہوم ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یعنی دور صحابہؓ میں وہ مسئلہ بغیر کسی اختلاف کے رہا ہے، ابھی ابھی آپ کے سامنے آئے گا، کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتے کے وارث نہ ہونے پر صحابہ کرامؓ کا اجماع تھا، البتہ اجماع صحابہ کا یہ عجیب و غریب مفہوم جس کا مطالبہ مقالہ نگار فرماتے ہیں، یعنی صحابہؓ کا کسی ایک مقام پر جمع ہو کر بالاتفاق اعلان کرنا یہ بجائے خود غلط، خانہ ساز، اور مضحکہ خیز ہے اس کے لئے بھی شاہ صاحبؒ ہی کی تصریح ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں :

"و معنی اجماع کہ بر زبان علمائے دین شنیدہ باشی آں نیست کہ ہمہ مجتہدان لا۔شذ فرد در عصرواحد بر مسئلہ اتفاق کنند زیراکہ این صورتے ست غیرواقع بل غیر ممکن عادی۔"

(ازالۃ الخفاج ا ص ۱۰۰)

ترجمہ :"اجماع کا لفظ تم نے علما کی زبان سے سنا ہوگا اس کے معنی یہ نہیں کہ تمام مجتہدین سب کے سب کسی زمانہ میں کسی مسئلہ پر اس طرح اتفاق کرلیں کہ کوئی مجتہد بھی اس سے خارج نہ رہے کیونکہ یہ صورت نہ صرف یہ کہ واقعہ کے خلاف ہے بلکہ عادۃً ناممکن بھی ہے۔"

شاہ صاحبؒ صحت اجماع کے لئے عصرواحد کے تمام مجتہدین کے اتفاق کی شرط کو طفلانہ تصور قرار دیتے ہیں لیکن مقالہ نگار اس میں ایک مقام پر جمع ہو کر متفقہ اعلان کی شرط کا اضافہ فرماتے ہیں۔

○ ازراہ کرم پہلے اجماع صحابہؓ کے مفہوم کی تصحیح کرلیجئے۔ اس کے بعد وہ کہاں ہے کہ نشاندہی کا سنئے' امام مالکؒ فرماتے ہیں :

الف : ---------وہ امر جس پر ہمارے یہاں سب کا اتفاق ہے' اور جس پر میں نے ہمارے شہر (مدینہ طیبہ) کے اہل علم کو پایا ہے۔ یہ ہے کہ پوتوں کی حیثیت وہی ہے جو بیٹوں کی ہے بشرطیکہ ان سے اوپر کے درجہ میں بیٹے موجود نہ ہوں' پوتوں کا حکم اس صورت میں بیٹوں کا سا ہے۔ اور پوتیوں کا بیٹیوں کا سا۔ وہ بیٹوں کی طرح وارث اور حاجب ہوں گے' البتہ صلبی بیٹا اور پوتا جمع ہو جائیں تو اس صورت میں میراث صرف صلبی بیٹے کو ملے گی اور پوتے پوتی کا

میراث میں کوئی حق نہ ہوگا۔" (موطا امام مالکؒ)

ب : --------یہ تو امام دارالہجرت کی شہادت اپنے وطن مالوف (مدینہ طیبہ) کے تمام اہل علم (صحابہ و تابعین) کے اجماع کے متعلق ہوئی' اب اس پر شاہ صاحبؒ نے جو مہر تصدیق ثبت فرمائی ہے' اسے بھی ملاحظہ فرمایئے :

قلت علی هذا اتفق اهل العلم

(المسوی علی الموطا۔ مطبوعہ مکہ مکرمہ ج۲ ص۸۴)

ترجمہ :"میں کہتا ہوں کہ تمام اہل علم کا اسی پر اتفاق ہے۔"

ج : --------مقالہ نگار کے مسلم و معتمد علیہ قاضی شوکانیؒ تفسیر فتح القدیر میں فرماتے ہیں :

ولا خلاف ان ابناء البنين فى الميراث كالبنين مع عدمهم

(ج۱ ص۳۹۶)

ترجمہ :"اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ پوتوں کا حکم بیٹوں کا سا ہے' بشرطیکہ بیٹے موجود نہ ہوں۔"

د :——— مقالہ نگار نے امام ابوبکر جصاص رازیؒ کی طویل عبارت تو نقل فرمادی لیکن اس کا آخری فقرہ ہضم کر گئے یعنی :

وهذا قول اهل العلم جميعا من الصحابة والتابعين۔

(احکام القرآن ج۲ ص ۱۰۲)

ترجمہ :"اور (بیٹے کی موجودگی میں پوتے کا وارث نہ ہونا) یہ تمام اہل علم یعنی صحابہؓ و تابعینؒ کا قول ہے۔"

یہ تین چار حوالے ہم نے صرف ان اکابر کے نقل کئے ہیں جن سے مقالہ نگار نے بار بار استشہاد کیا ورنہ ابن حجرؒ' ابن تیمیہؒ' ابن قیمؒ' علامہ عینیؒ' حافظ ابن حزمؒ' وغیرہ تمام اکابر امت کی معتبر کتب اٹھا کر دیکھئے آپ کو اس مسئلہ میں صحابہؓ' تابعینؒ' اور تمام امت کا اجماع ہی ملے گا' اگر مقالہ نگار اور ان کی جماعت کو ان حضرات میں سے کسی کی نقل پر بھی اعتماد نہیں تو ہم خدا حافظ کے سوا اور کیا عرض کر سکتے ہیں---- مقالہ نگار خدا لگتی کہیں کہ اگر یہی شہادتیں ان کے حق میں ہوتیں تو وہ کسی کو ان لن ترانیوں کی اجازت دیتے؟

اس مسئلہ پر اجماع منعقد ہونے کے بارہ میں قرآن و سنت سے شہادت مانگنا مضحکہ خیز ہے کیونکہ ہم اس سے پہلے اس مسئلہ میں اجماع صحابہؓ و تابعینؒ کی شہادتیں ایسے اکابر سے جن پر مقالہ نگار کو بھی اعتماد کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں---- پیش کر چکے ہیں۔ پھر اجماع امت بالخصوص طبقہ اولیٰ کی اہمیت بھی شاہ صاحبؒ کی تصریحات سے عرض کر چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ شاہ صاحبؒ کی جس عبارت کو سامنے رکھ کر مقالہ نگار نے امت کے خلاف تحریف کی دستاویز مرتب کی ہے' اس کی وضاحت بھی کر چکے ہیں کہ خود یہی عبارت اجماع امت کی ذمہ داری لیتی ہے ان تمام امور کے پیش نظر سب سے پہلے تو اجماع صحابہ کی سند کا مطالبہ ہی نادرست ہے اس لئے کہ اس مطالبہ کی تہہ میں یہ برخود غلط تصور کارفرما ہے کہ صحابہ کرامؓ خدا اور رسول اور کتاب و سنت کے منشا کے خلاف پر جمع ہو سکتے ہیں' اسلام میں اس تصور ہی کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں' بلکہ اس نظریہ کا حامل بقول شاہ صاحبؒ :

زندیق است' اورا مے باید بقتل رسانید۔

(ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۹۹)

ترجمہ :"زندیق ہے' اسے سزائے موت ہونی چاہئے۔"

اور اگر (شاہ صاحبؒ کے بقول) اس زندیقانہ مطالبہ کو ایک سیکنڈ کے لئے صحیح بھی فرض کر لیا جائے' تو اس کا جواب خود ان کی اپنی عبارت میں موجود ہے' چنانچہ آگے چل کر الاقرب فالاقرب کی بحث میں وہ فرماتے ہیں۔

"دوسرے اصول الاقرب فالاقرب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن کریم کی آیت سے مستنبط ہے' للرجال نصیب مماترک الوالدان والاقربون" اب یہ بحث تو اسی جگہ آئے گی' کہ یہ قرآن کریم کی تصریح ہے' یا اس سے مستنبط ہے' اور یہ کہ یہ استنباط صحیح ہے یا نہیں' لیکن اتنی بات تو مقالہ نگار نے بھی تسلیم کر لی ہے کہ یہ مسئلہ قرآن کریم کی فلاں آیت سے مستنبط قرار دیا گیا ہے۔ پس سند اجماع وہی آیت ہے۔

○ گزشتہ معروضات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ مقالہ نگار کی "ایسی کوئی بات نہیں" کی بات محض "بات بنانا" ہے مگر :

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

○ قرآن کی سند خود ان کے اقرار سے ثابت کی جا چکی ہے' اور حدیث کی سند کے لئے الاقرب فالاقرب کی بحث کا ذرا سا انتظار فرمایئے۔

○ صحابہؓ' تابعینؒ' اور ائمہ دینؒ کے متفقہ فیصلہ کو تحریف قرار دینا تو "فاضل و فقیہ مقالہ نگار" اور ان کے رفقا ہی کو زیب دیتا ہے' لیکن اس مسئلہ میں تو وہ اہل اجماع" کو مفت میں بدنام کرتے ہیں' جیسا کہ ابھی معلوم ہو گا ان حضرات کا قصور تو صرف اتنا ہے کہ وہ فیصلہ خداوندی اور فیصلہ نبوت پر کیوں جمع رہے' اگر ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا۔ تو مقالہ نگار آپ ﷺ کے

بارے میں کیا فرمائیں گے اور خود اپنے متعلق ان کا کیا فتویٰ ہو گا؟ مولانا رومیؒ نے کیا خوب فرمایا تھا ------بے ادب محروم گشت از لطف حق ------ ہمیں مجتہدین عصر حاضر کی حرمان نصیبی پر رحم آتا ہے جو بیک جنبش قلم نہ صرف اول سے آخر تک پوری امت پر تحریف کا فتویٰ صادر کرتے ہیں بلکہ ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس لپیٹ میں لے آتے ہیں۔ قاتلہم اللہ انی یوفکون۔

بے مایہ پاسنگ کو دنیا بھر کے پہاڑوں کے ہم وزن ہونے کا خبط

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

"واقعہ یہ ہے کہ ہمارا علم و تفقہ اپنی پوری بے مائیگی کے ساتھ اس علم و تفقہ کا پاسنگ بھی نہیں ہے' جو ہمارے فقہا کرام کا حصہ تھا لیکن اس کے باوجود ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ حضرات بہرحال انسان تھے' فرشتے اور معصوم نہیں تھے' لہٰذا علمی دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ مسائل کی تحقیق میں ہم ان جذبات سے بلند ہو کر غور و فکر کریں۔"

(ایضاً ص ۳۱۲)

اگر یہ فقرہ مقالہ نگار کا تکلف' بناوٹ اور تصنع محض نہیں تو کیا ان کے بے مایہ علم و تفقہ سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ جس بے مایہ پاسنگ کی شیخی اور تعلی میں دنیا بھر کے سر بفلک پہاڑوں کے ہم پلہ تلنے بلکہ ان سے بھاری ثابت ہونے کی خواہش چٹکیاں لے' یا جو شخص بہ سلامتی ہوش و حواس اسی بے مایہ

پاسنگ کی غلط اندیش تعلی کے فریب میں آکر دنیا بھر کے پہاڑوں سے اسے بھاری ثابت کرنے پر ایک سو ایک دلائل پیش کر دے' ان دونوں کے لئے ادارہ تحقیقات کے لغاتچہ میں کون سا لفظ وضع کیا گیا اور اس کے پیش کردہ دلائل کا مرتبہ عقلا کی عدالت میں کیا ہو گا؟

چراغ مردہ کجاؤ آفتاب کجا

○ یہ بظاہر خوشنما عقیدہ اکثر زنادقہ کی طرف بکثرت دہرایا جاتا رہا ہے' لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ اگر سلف سے خلف تک پوری کی پوری امت کا مجموعہ بھی مقالہ نگار کی بارگاہ عالی میں غلطی سے محفوظ ثابت نہیں ہوتا تو ان کے واسطہ سے نقل شدہ قرآن اور اسلام دونوں کیسے محفوظ رہے' اور اگر یہ دونوں بھی اپنے غیر محفوظ ناقلین کی بدولت معصوم نہیں' تو غیر معصوم پر ایمان لانے کا حکم کیوں ہے' اور کیسے ہے؟۔

پھر یہ سوال بھی اپنی جگہ کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں کہ اگر تمام صحابہؓ' تابعینؒ' فقہا اور پوری امت کا مجموعہ بھی معصوم نہیں تو مقالہ نگار اینڈ کمپنی کو فرشتہ معصوم ہونے کا پروانہ کہاں سے اور کب سے مل گیا ہے؟ اور اگر مقالہ نگار اپنے اور اپنی جماعت کے لئے بھی فرشتہ معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتے جیسا کہ ان کی "پوری بے مائیگی" سے بظاہر یہی واضح ہے۔تو کیا وجہ ہے کہ پوری امت کی بجائے غلط کار' تحریف کنندہ' جی چاہی کرنے والے اور "قرآنی فہم سے ناآشنا" قسم کے معزز القاب' ہم ان ہی پر کیوں چسپاں نہ کرلیں۔ جن کی پوری امت کے خلاف جرح سے دین میں رخنہ اندازی کا دروازہ چوپٹ کھلتا ہے۔

○ مقالہ نگار ہمیں معاف رکھیں' یہ نری جذباتی بات نہیں بلکہ شرعاً' اخلاقاً اور

قانوناً یہ اصولی بحث ہے، خود سوچئے کہ آج کے جمہوری دور میں پوری امت کے مقابلہ میں آپ کی تحقیقات کون قبول کرے گا۔

امام ابوبکر جصاص قابل اعتماد ہیں

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

"ہم نے شیخ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازیؒ کے اقتباسات اس لئے پیش کر دیئے ہیں کہ وہ فقہ حنفی کے ایک جلیل القدر امام ہیں۔ ان کے ارشادات ہمارے علماء کرام کے نزدیک بھی مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۵ ص ۳۷۰)

بلاشبہ امام جصاصؒ کی شخصیت قابل اعتماد ہے، مگر جب وہی صحابہؓ و تابعینؒ کا اجماع نقل کرتے ہیں کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا، تو کیا وجہ ہے کہ مقالہ نگار فقہ حنفی کے جلیل القدر امام، شیخ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ کی اس نقل پر اعتماد کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ لن یصلح العطار ما افسدہ الدھر۔"

آئندہ مباحث میں مقالہ نگار کی تحقیقات کا ماخذ

"الاقرب فالاقرب کی یہ بحث اور اس کی مثالیں مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کے رسالہ "محجوب الارث" سے مستفاد ہیں۔"

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۶ ص ۴۰۹)

جب علم فرائض جیسے دقیق مباحث میں مقالہ نگار کے راہنما آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ، تابعینؒ اور فقہا مجتہدینؒ کی جگہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری ایسے بزرگ ہوں تو ان کی سرگردانی کی توجیہ کیا مشکل ہے؟ مقالہ نگار کی منقبت میں مدیر فکرونظر کا درج ذیل خراج تحسین ایک دفعہ پھر ملاحظہ فرمائیے :

"ہمارے فاضل دوست کے طرز تحریر کا امتیازی وصف یہ ہے، کہ وہ مسئلے کے ہر گوشے پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنی ذاتی تنقید کو ائمہ سلف کی تنقیدات کا ہمیشہ تابع رکھتے ہیں"۔
(جلد ۲ ص ۵-۶)

اور پھر ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ :

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

تقسیم میراث کے شرعی اصول

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

"ہمارے فقہا کرام نے حجب کے لئے دو اصول مقرر کئے ہیں ۱۔ اگر کوئی شخص مورث کے ساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطہ سے رشتہ رکھتا ہو، وہ اس وقت تک حصہ نہیں پا سکتا جب تک وہ درمیانی واسطہ موجود ہے۔ ۲۔ حجب حرمان کا دوسرا اصول الاقرب فالاقرب کا ہے۔ یعنی قریب کا رشتہ دار دور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے۔"

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۶ ص ۱۰۷)

اصول دوم میں صحابہ' تابعین' فقہا' مجتہدین بلکہ معاذاللہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مراد خداوندی کو نہیں سمجھا۔

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

دوسرے اصول کے بارے میں کہا جاتا ہے' کہ یہ قرآن کریم کی اس آیت سے مستنبط ہے للرجال نصیب مماترک الوالدان والاقربون الایتہ (مع ترجمہ) اس آیت کریمہ میں یہ دونوں باتیں خصوصیت کے ساتھ غور طلب ہیں' کہ حق تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں وہ انداز بیان کیوں اختیار نہیں فرمایا جو ہمارے فقہا نے اس آیت کریمہ سے نکالا ہے قریب ترین رشتہ داروں' مردوں اور عورتوں کو اس ترکہ میں حصہ ملے گا' جو ان کے والدین اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ جائیں" بلکہ اس کے برعکس یہ انداز بیان کیوں اختیار فرمایا ہے کہ ---"مردوں اور عورتوں کو اس ترکہ میں سے حصہ ملے گا' جو ان کے والدین اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ جائیں" نیز یہ بات کچھ کم غور طلب نہیں کہ قرآن کریم نے "الاقربون" کی موجودگی میں اپنے مفہوم کے لحاظ سے تمام قریبی رشتہ داروں کو شامل ہے' جس میں ظاہر ہے کہ والدین بھی بدرجہ اولیٰ داخل ہیں "الوالدان" کی جداگانہ صراحت کو کیوں ضروری سمجھا؟ صرف "الاقربون" کے لفظ پر کیوں اکتفا

نہیں فرمایا؟"۔

(فکر و نظر جلد ۳ ش ٦ ص ۴۰۷۔۴۰۸)

اس بحث میں مقالہ نگار کا بیان کل تین دعووں پر مشتمل ہے :

۱ : -------الاقرب فالاقرب کا اصول قرآن کریم کی محولہ آیت سے مستنبط کہا جاتا ہے۔

۲ : ——— یہ اصول ہمارے فقہا نے نکالا ہے۔

۳ : -------یہ استنباط چونکہ قرآنی انداز بیان کے برعکس ہے اس لئے صحیح نہیں۔ آیئے ان تین دعووں پر غور کریں۔

اول---- قرآن کریم کے الفاظ آپ کے سامنے ہیں' تقسیم میراث کا جو اصول قرآن کریم نے بیان فرمایا ٹھیک ان ہی الفاظ کو "الاقرب فالاقرب" کے اصول میں لے لیا گیا ہے' صرف اتنا فرق ضرور نظر آتا ہے کہ قرآن نے الاقربون کے ایک ہی لفظ (بصیغہ جمع) میں تمام اقارب کو درجہ بدرجہ لے لیا ہے۔ اور الاقرب فالاقرب کے اصول میں اس تدریج و ترتیب کی وضاحت کے لئے دو مفرد لفظوں کے درمیان فاء تعقیب لائی گئی ہے ۔اب اس اصول کو قرآنی لفظ کی شرح و تفسیر کہنا تو بجا ہو گا لیکن اسے استنباط قرار دینا (جب کہ اس اصول میں قرآن کی اصل تعبیر کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔) مقالہ نگار ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اہل علم ودانش سے اس کی توقع نہیں کی جانی چاہیئے۔

دوم----- یہ دعویٰ جسے بار بار مقالہ نگار نے دہرا کر غلط تاثر دینے کی ناکام کوشش کی ہے کہ یہ فقہائے کرام کا نکالا ہوا اصول ہے' قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے' یہ فقہا کا نکالا ہوا اصول نہیں' بلکہ خود صاحب قرآن صلی اللہ علیہ

وسلم کی بیان فرمودہ شرح و تفسیر ہے۔ چنانچہ صحیح بخاریؒ، صحیح مسلمؒ، سنن نسائیؒ، سنن ابوداؤدؒ، جامع ترمذیؒ، سنن ابن ماجہؒ، مسند دارمیؒ، مسند احمد بن حنبلؒ، مسند امام ابوحنیفہؒ، اور سنن دار قطنی میں مختلف، متعدد اور متواتر المعنی، اسانید کے ساتھ اس آیت کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے۔

"الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فلاولی رجل ذکر"۔

(قرآن و سنت کے مقرر کردہ حصے ان کے مستحقین کو دے دو، پھر جو مال باقی رہ جائے وہ قریب تر رشتہ دار مرد کا حق ہے)

اس حدیث پاک میں "اولیٰ" بمعنی اقرب ہے، چنانچہ شاہ صاحبؒ اس حدیث پاک پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

(اقول) قدعلمت ان الاصل فی التوارث معنیان وقد ذکرناھما وان المودۃ والرفق لایقبرالافی القرابۃ القریبۃ جدا، کالام والاخوۃ، دون ماسواذالک، فاذا جاوزھم الامرتعین التوارث بمعنی القیام مقام المیت، والنصرۃ لہ وذالک قوم المیت واھل نسبہ و شرفہ الاقرب فالاقرب۔

(حجۃ اللہ البالغہ ج۲ ص۱۲۱)

ترجمہ :"میں کہتا ہوں کہ یہ بات تم کو معلوم ہو چکی ہے کہ توارث کے اندر اصل دو چیزیں ہیں، جن کو ہم بیان کر چکے ہیں

اور یہ کہ محبت و شفقت کا صرف اس قرابت میں لحاظ کیا جاتا ہے، جو بہت ہی قریب ہو جیسے ماں اور بھائی، ان کے ماسوا میں نہیں۔

پس جب یہ موجود نہ ہوں (یا ان کے حصص ادا کرنے کے بعد بھی مال باقی رہ جائے) تو اب توریث، میت کے قائم مقام ہونے، اور اس کی معاونت کرنے کے اعتبار سے معین ہو گی، اور وہ میت کی قوم اور اس کے اہل نسب و شرافت ہیں، جن میں "الاقرب فالاقرب" کا لحاظ ہو گا۔"

قرآن کریم کے لفظ "الاقربون" کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو امور کی وضاحت فرمائی:

۱۔ تقویم ذوی الفروض۔ ۲۔ اور عصبات میں الاقرب فالاقرب کے اصول کی رعایت، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی صرف زبانی تشریح پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ عملاً اسے جاری بھی فرمایا، اور حسن اتفاق یہ کہ اس کے اجرا کے لئے صورت بھی وہی اختیار فرمائی جس میں آج کل شغب کیا جا رہا ہے، چنانچہ مسلم شریف کے علاوہ تمام صحاح ستہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ موجود ہے، کہ بیٹی کے لئے نصف ترکہ ہے پوتی کے لئے چھٹا حصہ، اور باقی ماندہ حقیقی بہن کا ہے۔ (میت کے یہی تین وارث تھے) شاہ صاحبؒ اس فیصلہ نبوت کی توجیہ اس طرح فرماتے ہیں:

(اقول) وذالک لان الابعد لا یزاحم الاقرب فیما یحوزہ فما بقی فان الابعد احق بہ حتی یستوفی ما جعل اللہ لذالک الصنف،

فالابنة تاخذالنصف كملا وابنة الابن فى حكم البنات فلم تزاحم البنت الحقيقة واستوفت ما بقى من نصيب البنات، ثم كانت الانت عصبة لان فيها معنى من القيام مقام البنت وهى من اهل شرفه۔

(حجتہ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۲۲)

ترجمہ :"میں کہتا ہوں کہ وجہ اس کی یہ ہے کہ الابعد (دور کا رشتہ) اقرب (نزدیک کے رشتہ دار) سے اس کے حصہ میں مزاحم نہیں ہو سکتا، البتہ جو مال باقی رہ جائے، ابعد اس کا حقدار ہے تاآنکہ حق تعالیٰ نے جو کچھ اس صنف کے لئے مقرر فرمایا اسے حاصل کر لے، پس بیٹی (چونکہ پوتی کی بہ نسبت اقرب ہے اس لئے وہ) پورا نصف لے گی، اور پوتی بیٹیوں کے حکم میں داخل تو ہے (مگر چونکہ ابعد ہے) اس لئے وہ حقیقی بیٹی سے مزاحمت نہیں کر سکتی اور بیٹیوں کا باقی ماندہ حصہ (۱٫۶) حاصل کرے گی، پھر بہن عصبہ ہے، کیونکہ اس میں بیٹی کے قائم مقام ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں، اور وہ میت کے اہل شرف میں سے بھی ہے۔"

پھر قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ اصول "الاقرب فالاقرب" کی روشنی میں صحابہ کرامؓ نے بیٹے کی موجودگی میں پوتے کے وارث نہ ہونے کا کھل کر "اجماعی فتویٰ" دیا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فتویٰ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور سلیمان بن ربیعہؓ

کی مہر تصدیق کے ساتھ تو اسی مذکورہ بالا حدیث میں مذکور ہے' اور حضرت زید بن ثابتؓ کا فتویٰ صحیح بخاری میں موجود ہے' حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ بات تو تقریباً ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو علم فرائض کی سند عطا کرتے ہوئے فرمایا تھا افرضکم زید (تم سب میں علم فرائض کے سب سے بڑے عالم زید ہیں) مگر یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہو گی' کہ علم میراث کی مشکلات حل کرانے کے لئے خلیفہ راشد امیرالمومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خود بنفس نفیس زید بن ثابت کے در دولت پر حاضری دیا کرتے تھے' اور ان کے فتویٰ کو سند اور حجت مانتے تھے' (ملاحظہ ہو کنز العمال میراث الجد) ان حقائق کے پیش نظر فکرونظر کے فقیہ مقالہ نگار سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ "الاقرب فالاقرب" کا اصول بیچارے فقہا کرام کا نکالا ہوا ہے۔ یا صاحب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان فرمودہ ہے؟ اور بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو وارث قرار نہ دینے کی وجہ سے' کیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم' عبداللہ بن مسعود' زید بن ثابت' حضرت عمرؓ' ابو موسیٰ اشعری' سلیمان بن ربیعہ اور ان کے فتاویٰ کو قبول کرنے والے تمام صحابہؓ اور خود شاہ صاحبؒ پر بھی تحریف کی زبان طعن دراز کرنے کی جرات فرمائیں گے۔؟ مقالہ نگار کا تیسرا دعویٰ یہ تھا کہ "الاقرب فالاقرب" کا اصول چونکہ قرآنی تعبیر "الاقربون" کے برعکس ہے' اس لئے یہ صحیح نہیں' اس کا کافی جواب تو یہ ہے' کہ یہ اصول خود صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان فرمودہ ہے' فقہائے کرام' تشریح نبویؐ سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہوئے' اس لئے مقالہ نگار کی تمام تر جرح وتنقید کا اصل نشانہ فقہا کرام کے مقتدا۔۔۔ اور امت کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرار پاتے ہیں۔ (معاذ اللہ

منہ) اور صاف جواب یہ ہے کہ اگر مقالہ نگار اتنا بھی نہیں جانتے تو ان دقیق مباحث پر خامہ فرسائی کی کیوں زحمت اٹھائی کہ قرب وبعد نسب متکررہ ہیں' جب آپ زید کو عمر کا اقرب قرار دیں گے' تو لامحالہ عمر زید کا اقرب قرار پائے گا' پس اگر بیٹا' پوتے کی نسبت اقرب الی المیت ہے' تو میت بھی پوتے کی نسبت بیٹے کی اقرب ہوگی' یہ عجیب غریب فلسفہ کسی نے کب سنا ہوگا' کہ بیٹا تو بلاشبہ اقرب ہے' لیکن مرنے والا اپنے بیٹے کا اقرب نہیں' بلکہ اس کا قرب بیٹے اور پوتے کے ساتھ یکساں ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ' مورث کو اقرب کہا جائے' یا وارث کو دونوں کا مال صرف ایک ہے' البتہ جہاں علت توریث کو ذکر کیا جائے گا وہاں مورث کی اقربیت ذکر کی جائے گی اور جہاں علت توراث کا ذکر چھڑے گا وہاں اقربیت وارث کا ذکر ہوگا۔

ان تمام حضرات کی "جی چاہی" بات

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

> "مسائل میراث کے عمیق مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہمارے فقہا کرام نے یہ قانون تو مستنبط فرما لیا ہے' لیکن اس کے نفاذ میں انہوں نے کسی باقاعدگی کو مدنظر نہیں رکھا' بلکہ جہاں ان کا جی چاہا اس قانون کا نافذ فرما لیا اور جہاں ان کا جی چاہا اسے نظرانداز کردیا۔"

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۶ ص ۴۰۸)

مسائل میراث کا عمیق مطالعہ تو جیراجپوری صاحب کے محجوب الارث سے استفادہ ہی سے ظاہر ہے' رہا فقہائے کرام کے بارے میں "جی چاہا" کا

افسانہ اس کی حقیقت سابقہ معروضات سے کھل گئی ہو گی' مقالہ نگار کے وارد کردہ نقوض کا حل بھی ان ہی گذارشات سے بادنی تامل معلوم کیا جا سکے گا ورنہ نادان کے لئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔

الاقرب فالاقرب کا ماڈرن مفہوم

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

"اگر اس قانون کو صحیح ماننا ہے تو ہمیں اس کا ایسا مطلب لینا ہو گا جس سے یہ قانون ہر جگہ فٹ بیٹھ جائے' اس لئے لازماً اس قانون کا یہی اور صرف یہی مطلب لینا ہو گا کہ اقرب وہ رشتہ دار ہے جو بلاواسطہ میت سے رشتہ رکھتا ہو یا بالواسطہ رشتہ رکھتا ہو' لیکن مورث کی وفات کے وقت وہ واسطہ باقی نہ رہا ہو"۔ (ص ۴۱۵)

○ مقالہ نگار قرآن و سنت اور اجماع صحابہ کے مقرر کردہ اصول کو صحیح مانیں یا نہ مانیں یہ ان کا اپنا ایمانی معاملہ ہے البتہ فٹ آتی پھانسی دینا عقلاً جانتے ہیں کہ کہاں ہوتا ہے۔

○ مقالہ نگار صاحب جیراجپوری صاحب کی تقلید میں کتاب و سنت' صحابہ و تابعین' اور فقہاء مجتہدین کے اعتماد کو تو جواب دے ہی چکے تھے' لیکن "الاقرب فالاقرب" کا ماڈرن مفہوم بیان کرنے بیٹھے تو ہدایت عقلیہ کو بھی خیرباد اور خداحافظ کہہ گئے' یعنی یہ اقرار ہے کہ بیٹا بلاواسطہ رشتہ دار ہے اور پوتا بالواسطہ رشتہ رکھتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اصرار ہے کہ عقل و خرد

کے علی الرغم ان دونوں کو ایک ہی درجہ میں "اقرب" قرار دیا جائے' عجب نہیں کہ ان کی اس تحقیق پر یتیم پوتوں کو بھی ہنسی آ جائے۔

نتیجہ' نتیجہ' نتیجہ

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

"لہٰذا ہم نہایت دیانتداری کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں' کہ یتیم پوتوں کی اپنے دادا کی وراثت سے محرومی کسی صحیح بنیاد پر مبنی نہیں ہے' لہٰذا ہمیں اپنی فقہ کی اس فروگزاشت کو تسلیم کر کے ان مظلوموں کے ساتھ انصاف برتنے میں کسی قسم کی علمی عصبیت کو رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہئے۔ اور ہمیں کھلے دل کے ساتھ تسلیم کر لینا چاہئے کہ یتیم پوتے اپنے دادا کی میراث سے حصہ پانے کے ہر اعتبار سے مستحق ہیں۔ الخ"۔

(ص ۲۱۷ آخری فقرہ)

مقالہ نگار کی "نہایت دیانتداری" سر آنکھوں پر' لیکن معاف کیجئے ہم اس سے پہلے "نہایت دیانتداری" کے ساتھ قسمیں کھانے والے کے فریب کو آزما چکے ہیں۔ (وقاسمهما انی لکما لمن الناصحین) اس لئے ہم خدا اور رسول کے احکام کے مقابلہ میں نہ تو کسی کی "نہایت دیانتداری" پر اعتماد کرنے کی ہمت رکھتے ہیں' نہ کسی کی عقل و خرد پر۔

فقہ اور فقہا کی فروگزاشت نہیں بلکہ جرأت سے کام لیجئے اور اسلام اور صاحب اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فرضی فروگزاشتیں لوگوں کو تسلیم کرائیے کیونکہ فقہا کرام تو محض صاحب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سر و چشم کی

تعمیل کر رہے ہیں' ان بے چاروں پر برسنا تو ایسا ہی ہو گا کہ زید کی عداوت میں اس کے نشان قدم کو پیٹنا شروع کر دیا جائے۔

لیکن کیا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین نے ان فرضی مظلوموں کو محروم کر کے انصاف نہیں کیا۔؟

فقہا پر "علمی عصبیت" کا الزام مقالہ نگار کو مبارک ہو' یہ علمی عصبیت نہیں بلکہ "ایمانی تقاضا" ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

(ماہنامہ الحق محرم ۱۳۸۷ھ)

ڈاکٹر گورایہ کے اجتہادات

ڈاکٹر گورایہ اور تعبیر شریعت کا اختیار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد'

"علامہ اقبال اور جدید اسلامی ریاست میں تعبیر شریعت کا اختیار" کے عنوان سے ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ ایم اے۔ پی ایچ ڈی کا ایک مضمون روزنامہ جنگ لاہور ۱۱۔۱۴۔۱۸ فروری ۱۹۸۷ء کی اشاعتوں میں ادارتی صفحات میں شائع ہوا ہے' جس میں موصوف نے علامہ اقبال کی کتاب "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کے حوالے سے (جو انگریزی کے علامہ کے خطبات مدراس کا مجموعہ ہے) علامہ کے چند اجتہادی افکار کی اپنے ذوق کے مطابق تشریح کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب محکمہ اوقاف پنجاب کے ایک ذمہ دار سرکاری افسر ہیں' اس حیثیت سے انہیں بڑی حد تک سرکاری فکر کا ترجمان بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ پیش نظر مضمون میں' جو خالص پرویزی رنگ میں لکھا گیا ہے' انہوں نے دور ایوبی کے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی یاد تازہ کردی ہے' جس سے صاف جھلکتا ہے کہ وہ موجودہ حکومت کی بھی اسی طرح رہنمائی کرنا چاہتے ہیں جس طرف ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے فیلڈ مارشل ایوب خان کی رہنمائی کی تھی' اور وہ اس حکومت کو بھی اسی انجام سے دوچار کرنا چاہتے ہیں جو فیلڈ مارشل صاحب کا ہوا تھا۔

جناب گورایہ صاحب کے خیالات کا جائزہ لینے سے پہلے اجتہاد کے موضوع پر

چند امور کا عرض کر دینا مناسب ہوگا :

ا ــــــ جو شخص دین اسلام پر عقیدہ رکھتا ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا دعویٰ رکھتا ہو اس کو شرعی احکام کے قبول کئے بغیر چارہ نہیں، قرآن کریم میں بار بار "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" کی تاکید کی گئی ہے، اور اطاعت کے معنی قبول احکام کے سوا کچھ نہیں۔

شرعی احکام کی چند قسمیں ہیں :

اول ــــــ وہ احکام جو قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں صراحۃً مذکور ہیں۔ یہ احکام خواہ عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے، اور دینی امور سے متعلق ہوں یا دنیوی امور سے، ان کا قبول کرنا لازم ہے اور ان سے انحراف کی کسی امتی کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے :

وما کان لمومن ولا مومنة اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا۔

(سورہ احزاب۔۳۶)

ترجمہ :"اور کام نہیں کسی ایماندار مرد کا، اور نہ ایماندار عورت کا، جب کہ مقرر کر دے اللہ اور اس کا رسول کوئی کام، کہ ان کو رہے اختیار اپنے کام کا، اور جس نے نافرمانی کی اللہ کی اور اس کے رسول کی تو وہ راہ بھولا صریح چوک کر"۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

یہ آیت کریمہ ایک خاص دنیوی امر کے بارے میں نازل ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کے نکاح کے لئے اپنی پھوپھی کی لڑکی

زینب بنت جحش کا انتخاب فرماکر پیغام نکاح دیا۔ حضرت زید پر چونکہ یہ عرفی عیب لگا ہوا تھا کہ آزادہ کردہ غلام تھے' حضرت زینب اور ان کے بھائی عبد اللہ بن جحش نے اس رشتہ سے انکار کردیا کہ ہم باعتبار خاندان ونسب کے ان سے اشرف ہیں' اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت کو حضرت زینب اور ان کے بھائی نے سنا تو سمع وطاعت بجالائے۔ اور نکاح پر راضی ہوگئے۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ اگر کسی دنیوی معاملہ میں بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے کوئی فیصلہ صادر ہوجائے اس کو دل وجان سے قبول کرنا شرط ایمان ہے۔ اور اس سے انحراف صریح گمراہی ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے :

امرت ان اقاتل الناس حتٰی یشھدوا ان
لا الہ الا اللہ ویومنوا بی وبما جئت بہ۔

(صحیح مسلم۔ ص۳۷ ج۱)

ترجمہ :"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ "لا الہ الا اللہ" کی گواہی دیں' اور مجھ پر اور ان تمام امور پر' جو میں لے کر آیا ہوں' ایمان لائیں"۔

دوم ـــــ حضرات خلفائے راشدینؓ کے وہ فیصلے جن سے صحابہ کرامؓ نے اتفاق فرمایا' اور جو صحابہ کرامؓ کے دور سے پوری امت کے نزدیک مسلم اور متفق علیہ چلے آتے ہیں۔ یہ امور بھی قرآن وسنت کے ساتھ ملحق ہیں اور ہمارے لئے قطعی ویقینی ہیں' ان کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمودات کی روشنی میں لازم ہے' اور ان سے انحراف کرنا ناجائز ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کے طریقہ کو "سبیل المومنین" فرمایا ہے' اور اس کے چھوڑنے والوں کو جہنم رسید کرنے

کا اعلان فرمایا ہے' چنانچہ ارشاد ہے :

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ما تولیٰ ونصله جهنم وساءت مصیرا۔

(النساء۔ ۱۱۵)

ترجمہ :"اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ' اور چلے سب مسلمانوں کے رستہ کے خلاف' تو ہم حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت بری جگہ پہنچا"۔

(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات خلفائے راشدینؓ کے طریقہ وسنت کو مضبوط پکڑنے کی تاکید بلیغ فرمائی ہے :

فانه من یعش منکم بعدی فیریٰ اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین' تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ' وایاکم ومحدثات الامور' فان کل محدثة بدعة' وکل بدعة ضلالة۔

(مشکوۃ۔ ص ۳۰)

ترجمہ :"کیونکہ جو شخص تم میں سے میرے بعد جیتا رہا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا پس تم میری سنت کو اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑنا' اس کو مضبوطی سے تھام لینا اور

کچلیوں سے اس کو پکڑلینا' اور خبردار! نئے نئے امور سے بچتے رہنا'
کیونکہ ہر نیا امر بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے"۔

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ حضرات خلفائے راشدینؓ کی سنت' سنت نبوی (علیٰ صاحبھا الصلوۃ والسلام) کا تتمہ ہے' اور وہ بھی قرآن وسنت ہی کی طرح امت کے لئے واجب العمل ہے۔ ان کے طریقہ کے خلاف جو طریقہ ایجاد کیا جائے وہ بدعت وگمراہی ہے۔

سوم ــــــ جن مسائل کا حکم صراحتًا قرآن وحدیث میں مذکور نہیں' اور نہ ان کے بارے میں حضرات خلفائے راشدینؓ کا کوئی فیصلہ ہی سامنے آیا' قرآن وسنت کے نصوص میں غور کرکے ان کا حکم دریافت کرنا "اجتہاد واستنباط" کہلاتا ہے۔ اسی طرح جن مسائل میں بظاہر دلائل کا تعارض ہو' وہاں بھی کسی جانب کو اختیار کرنے کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہوگی۔ احکام کی پہلی دو قسمیں محل اجتہاد نہیں' صرف آخری قسم محل اجتہاد ہے۔

۲ ــــــ مندرجہ بالا بحث سے دو باتیں معلوم ہوگئیں :

اول ــــــ اجتہاد کی تعریف : یعنی جن مسائل کا حکم کتاب وسنت میں منصوص نہیں' نہ اجماع سے ثابت ہے ان کا حکم شرعی معلوم کرنے کے لئے مجتہد کا اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔

دوم ــــــ یہ کہ محل اجتہاد صرف وہ مسائل ہیں جن کا حکم کتاب وسنت میں منصوص نہیں' نہ اجماع امت سے ثابت ہے' کیونکہ منصوص اور اجماعی احکام اجتہاد سے بالاتر ہیں۔

۳ ــــــ جو شخص اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو اس پر غیر منصوص مسائل کا حکم

شرعی معلوم کرنے کے لئے اپنے اجتہاد پر عمل کرنا واجب ہے اور جو شخص اس کی صلاحیت نہیں رکھتا اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ کسی مجتہد سے رجوع کرے۔

۴ـــــ اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ اجتہاد کی صلاحیت کون رکھتا ہے' اور کون نہیں؟ اور یہ کہ کسی شخص کے مجتہد ہونے کے لئے کیا شرائط درکار ہیں؟ اصول فقہ میں اس پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے' جس کا خلاصہ امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "ازالہ الخفا" میں تحریر فرمایا ہے' اختصار کے پیش نظر میں اسی خلاصہ کو یہاں نقل کردیتا ہوں' وہ تحریر فرماتے ہیں :

"واصل معنی اجتہاد آنست کہ جملہ عظیمہ از احکام فقہ دانستہ باشد بادلہ تفصیلیہ از کتاب وسنت واجماع وقیاس۔ وہر حکمے را منوط بدلیل او شناختہ باشد۔ وظن قوی بماں دلیل حاصل کردہ۔ پس دریں زمانہ مجتہد نمے تواند شد مگر کسے کہ جمع کردہ باشد پنج علم را :

۱۔ علم کتاب۔ قراءۃ وتفسیرا۔

۲۔ وعلم سنت باسانید آں ومعرفت صحیح وضعیف دراں۔

۳۔ وعلم اقاویل سلف در مسائل۔ تا از اجماع تجاوز نہ نماید۔ ونزدیک اختلاف علی قولین قول ثالث اختیار نہ کند۔

۴۔ وعلم عربیت ازلغت ونحو وغیر آں۔

۵۔ وعلم طرق استنباط ووجوہ تطبیق بین المختلفین۔

بعد ازاں اعمال فکر کند در مسائل جزئیہ۔ وہر حکمے را منوط بدلیل او شناسد ولازم نیست کہ مجتہد مستقل باشد مثل ابی

حنیفہ وشافعی بلکہ مجتہد منتسب کہ تحقیق سلف را شناختہ واستدلالات ایشاں فہمیدہ ظن قوی در ہر مسئلہ بہم رساند کافی است"۔

(ازالہ الخفا فارسی ص ۴)

ترجمہ :"اور اصل معنی اجتہاد کے یہ ہیں کہ احکام فقہ کے ایک بہت بڑے مجموعہ کا، ان کے تفصیلی دلائل یعنی کتاب وسنت اور اجماع وقیاس کے ساتھ علم رکھتا ہو۔ اور ہر حکم کے اس کی دلیل کے ساتھ مربوط ہونے کو پہچانتا ہو۔ اور ہر مسئلہ کا ظن قوی اس کی خاص دلیل کے ساتھ حاصل کئے ہوئے ہو، پس اس زمانے میں مجتہد نہیں ہو سکتا مگر وہی شخص جو پانچ علوم کا جامع ہو :

۱۔ کتاب کا علم، قرات وتفسیر کے اعتبار سے۔

۲۔ سنت کا علم، اس کی اسانید کے ساتھ اور اس میں صحیح وضعیف کی معرفت بھی رکھتا ہو۔

۳۔ تمام مسائل میں علمائے سلف کے اقوال کا علم رکھتا ہو تاکہ اجماع امت سے نہ نکل جائے۔ اور جس مسئلہ میں دو قول ہوں وہاں تیسرا قول اختیار نہ کرے۔

۴۔ عربیت سے متعلقہ علوم پر حاوی ہو۔ مثلاً لغت، صرف ونحو، اشتقاق وغیرہ۔

۵۔ استنباط کے طریقوں کا علم رکھتا ہو، اور دو مختلف دلیلوں کے درمیان کس طرح تطبیق دی جاتی ہے ان وجوہ تطبیق سے واقف ہو۔

ان علوم کے بعد اس کی بھی صلاحیت رکھتا ہو کہ اپنی فکر وبصیرت کو مسائل جزئیہ میں استعمال کرے اور ہر حکم کا جس دلیل پر مدار ہے اسے پہچانے۔

اور لازم نہیں ابو حنیفہؒ وشافعیؒ کی طرح مجتہد مطلق ہو بلکہ مجتہد منتسب بھی کافی ہے جس نے سلف کی تحقیق کو پہچان رکھا ہو' اور ان کے استدلالات کو سمجھ رکھا ہو' اور ہر مسئلہ میں دلیل کے ساتھ ظن قوی حاصل کر رکھا ہو"۔

ان علوم پنج گانہ میں سے ہر علم ایک ایسا وسیع الاطراف دریائے محیط ہے کہ عمریں کھپ جائیں مگر اس کا آخری کنارہ ہاتھ نہ آئے۔

مثلاً قرآن کریم ہی کو لیجئے۔ حافظ سیوطیؒ نے "الاتقان فی علوم القرآن" میں اس سلسلہ میں اسی علوم کی فہرست اور ہر علم سے متعلق مختصر سی بحث ذکر کی ہے' جن کا جاننا ایک عالم قرآن کے لئے ناگزیر ہے۔ اسی پر حدیث' علم فقہ' علم اصول اور دیگر علوم دینیہ کو قیاس کرلیا جائے' کہ ان میں سے ہر علم میں مہارت کے لئے کتنی صلاحیت درکار ہے؟۔ حضرت شاہ صاحبؒ علوم قرآن کا اجمالی تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" وتحقیق آنست کہ احیائے تفسیر قرآن نیز بغیر ایں علوم پنجگانہ میسر نیست' لیکن معتبر آنجا احادیث اسباب نزول' ومناسب اوست۔ وآثار سلف در باب تفسیر۔ وحفظ وقوت فہم سیاق وسباق۔ وتوجیہ ومانند آں۔ وبر علم تفسیر قیاس باید کرد جمیع فنون دینیہ را' واللہ اعلم۔"

(ازالۃ الخفاص۵)

ترجمہ :"اور تحقیق یہ ہے کہ تفسیر قرآن کا احیا بھی ان علوم پنج گانہ کے بغیر میسر نہیں، لیکن وہاں معتبر ہے اسباب نزول کی احادیث اور اس کے مناسبات کا علم ہونا، تفسیر کے باب میں آثار سلف کا معلوم ہونا، حافظہ، سیاق وسباق کے فہم کی قوت، اور اس کی توجیہہ وغیرہ۔ اور علم تفسیر پر باقی فنون دینیہ کو قیاس کرلیا جائے"۔

الغرض مجتہد کے لئے لازم ہے کہ ان علوم پنجگانہ میں مہارت وامامت کا درجہ اسے نصیب ہو۔ اسی کے ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ کے کلام سے دو فائدے اور معلوم ہوئے :

اول —— یہ کہ صرف ان میں مہارت وحذاقت اجتہاد کے لئے کافی نہیں، بلکہ اسی کے ساتھ اسے ملکہ اجتہاد کا حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔ اور ملکہ اجتہاد ان علوم میں مہارت سے ماورا چیز ہے۔ جس طرح علم عروض میں مہارت، اور اوزان شعریہ کے ضبط کرلینے اور دواوین شعر کے حفظ کرلینے سے کوئی شاعر نہیں بن جاتا۔ بلکہ شعر گوئی ایک ملکہ ہے جو کسی شخص کی فطرت میں ودیعت رکھا جاتا ہے۔ اور علم عروض کی مہارت اور دواوین شعر کا حفظ اس کے لئے معین اور آلہ کی حیثیت رکھتا ہے ٹھیک اسی طرح یہ علوم پنج گانہ شرط اجتہاد ضرور ہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جو شخص ان میں مہارت رکھتا ہو وہ مجتہد بھی ہوجائے۔ بلکہ اجتہاد ایک فطری صلاحیت اور ملکہ ہے جو کسی شخص کی فطرت میں ودیعت رکھا جاتا ہے۔ تاکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے بقول اس کے ذریعہ :

" اعمال فکر کند در مسائل جزئیہ وہر حکمے را منوط بدلیل او بشناسد"۔

"ترجمہ : اپنی فکر وبصیرت کو مسائل جزئیہ کے استخراج

میں استعمال کرے اور ہر حکم کا جس دلیل خاص پر مدار ہے اسے پہچانے۔"

اور یہ ملکہ اسی شخص کو نصیب ہوتا ہے جو علوم پنج گانہ کے ساتھ ساتھ طہارت وتقویٰ کے درجہ علیا پر فائز ہو' اور فہم وذکا اور نور بصیرت سے آراستہ وپیراستہ ہو۔

دوسرا ـــــ فائدہ حضرت شاہ صاحبؒ کے کلام سے یہ معلوم ہوا کہ یہ شرائط جو ذکر کی گئی ہیں مجتہد مطلق کی نہیں بلکہ مجتہد منتسب کے لئے بھی یہ شرائط لازم ہیں' اجتہاد مطلق کا مرتبہ ومقام اس سے کہیں بلند وبالا ہے۔
شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علیؒ نے حاشیہ کنز الدقائق کے مقدمہ میں ان شرائط کا ذکر کرنے کے بعد صحیح لکھا ہے :

"وھذہ الشروط ھی آیة المجتھد فمن ادعاہ وھو خال عنھا فمثلہ کمثل من یدعی ان فی قوتہ صعود السماء بلا معراج۔"

ترجمہ :"اور یہی شروط کسی شخصیت کے مجتہد ہونے کی علامت ہیں' پس جو شخص ان شرائط کے بغیر اجتہاد کا دعویٰ کرے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ سیڑھی کے بغیر آسمان پر چڑھنے کی طاقت رکھتا ہے"۔

اوپر مجتہد کے ملکہ اجتہاد کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے اس پر گفتگو کرتے ہوئے مولاناؒ لکھتے ہیں :

"ولا بد بعد ذلک ان یحصل عندہ ملکة

بسبب ممارسة هذه العلوم والتامل فی الادلة یتمکن بها من استنباط الاحکام من ادلتها ولا بد بعد هذه الملکة من تاسیسه قواعد یخرج علیها استنباطاته وتفریعاته کقواعد الشافعی وباقی الائمة وهذه القواعد هی التی اعجزت الناس عن بلوغ حقیقة مرتبة الاجتهاد اذ لا یکفی فی الاجتهاد معرفة ما تقدم بدون حصول الملکة المذکورة وتاسیس القواعد المذکورة فمن جهل شیئا مما تقدم او علم جمیعه ولم تحصل له هذه الملکة المتقدمة او حصلت ولم یوسس بها قواعد وادعی الاجتهاد لقد اخطا وعلیه البیان والاثبات"۔

ترجمہ :"اور ان شرائط کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ ان علوم میں حذاقت ومہارت اور دلائل شرعیہ میں غور وفکر کی وجہ سے اسے ایسا ملکہ حاصل ہوجائے جس کی بدولت اسے دلائل شرعیہ سے استخراج کرنے پر قدرت حاصل ہو۔ اور تنہا اس ملکہ کا حصول بھی کافی نہیں۔ بلکہ لازم ہے کہ اس ملکہ کے بعد وہ ان قواعد کی تاسیس کرے، جن پر اس کے استنباط وتفریعات کی بنیاد ہو۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کے اور باقی ائمہ کے قواعد ہیں۔

اور یہی وہ قواعد ہیں جنہوں نے لوگوں کو مرتبہ اجتہاد کی حقیقت تک پہنچنے سے عاجز کردیا ہے، کیونکہ اجتہاد میں علوم مذکورہ کا

جاننا پہچاننا کافی نہیں، جب تک کہ یہ ملکہ اجتہاد حاصل نہ ہو، اور قواعد اجتہاد کی تاسیس نہ رکھی جائے۔

پس جو شخص علوم مذکورہ بالا سے جاہل ہو یا تمام مذکورہ بالا علوم پر حاوی ہو مگر اسے یہ ملکہ اجتہاد نصیب نہ ہو، یا یہ ملکہ بھی حاصل ہو، مگر وہ قواعد اجتہاد کی تاسیس نہ کرے، اس کے باوجود اجتہاد کا دعویٰ کرے تو وہ خطا کا مرتکب ہے، اور اس پر لازم ہے کہ اپنے مرتبہ اجتہاد کو دلیل سے ثابت کرے"۔

(مقدمہ حاشیہ کنز الدقائق ص۵)

۵ ـــــ اجتہاد کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے۔ کسی نے اسے بند نہیں کیا۔ البتہ ائمہ اربعہ کے بعد ائمہ اربعہ کے مرتبہ کا کوئی مجتہد پیدا نہیں ہوا کیونکہ علم کی خاصیت یہ ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے علم کا پھیلاؤ اور اس کا طول وعرض بڑھتا جارہا ہے، اور اسی تناسب سے اس کا عمق اور اس کی گہرائی گھٹتی جارہی ہے اور جس تناسب سے علم کی گہرائی کم ہوتی گئی اسی تناسب سے مرتبہ اجتہاد میں تنزل آتا رہا۔

مجتہد مطلق سلف میں بہت سے اکابر ہوئے ہیں، اور ان میں سے بہت سے حضرات مستقل فقہی مکتب فکر کے بانی بھی ہوئے جن میں امام لیث بن سعد، امام سفیان ثوری، اور امام اوزاعیؒ وغیرہ کے اسمائے گرامی بطور خاص لائق ذکر ہیں، لیکن حق تعالیٰ شانہ کی عنایت خاصہ، مشیت مطلقہ اور حکمت بالغہ نے ائمہ اربعہ کے مذاہب کو ایسا شرف فروغ عطا فرمایا کہ ان کے سامنے باقی تمام فقہی مسالک ماند پڑگئے، نہ ان ائمہ اربعہ کی طرح ان کے اجتہادات کے اصول وفروع مرتب ومدون ہوسکے، اور نہ ان کے فقہی سرمایہ کی تنقیح وترجیح اور تہذیب وترتیب ہوسکی۔ نتیجہ یہ کہ امت ان چار فقہی مسالک پر متفق ہوگئی۔ اور ان کے علاوہ دیگر فقہی اجتہادات پس منظر میں

چلے گئے۔

ان ائمہ اربعہ کے بعد بھی بہت سے حضرات اجتہادی صلاحیتوں کے مالک ہوئے۔ (اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے' اس کا سلسلہ جاری رہے گا)۔ لیکن چوتھی صدی کے بعد کوئی مجتہد مطلق امت میں پیدا نہیں ہوا۔ اور پیدا نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ علمانے کسی منصوبہ بندی کے تحت ان کی پیدائش پر پابندی عائد کردی تھی۔ نہیں' بلکہ "اجتہادِ مطلق" کے لئے جن ضروری شرائط اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ ان صلاحیتوں کا حامل کوئی شخص پیدا نہیں ہوسکا۔ یہ حق تعالیٰ کی تکوینی حکمت تھی' چونکہ دین کی تشریح و تعبیر کا کام مکمل ہوچکا تھا۔ اس کے اصول و فروع مرتب ہوچکے تھے۔ اور پیش آنے والے جدید مسائل کا حل ان اصول و قواعد کی روشنی میں ہوسکتا تھا۔ اس لئے آئندہ انہی اصول پر اجتہاد کی راہ رکھی گئی۔ اور کسی مجتہد مطلق کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ امت میں بڑے بڑے اکابر اہل علم پیدا ہوئے' اور ان میں سے بہت سے حضرات علوم دینیہ کے جامع تھے مگر چوتھی صدی کے بعد کسی کو اجتہاد مطلق کے دعویٰ کا وسوسہ بھی نہیں آیا اور اگر وفور علم اور وسعت معلومات کی بنا پر کسی کو اس کا کچھ خیال ہوا بھی تو اہل علم نے دعویٰ اجتہاد کی دلیل طلب کرکے اس کا ایسا منہ بند کیا کہ ساری سٹی بھول گیا۔

مثلاً حافظ ابن تیمیہؒ کے دعویٰ اجتہاد کے لئے خود گورایہ صاحب نے بھی اقبال کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ حافظ ابن تیمیہؒ کی تالیفات دنیا میں موجود ہیں جو شخص ان کی کتاب پڑھے گا وہ اس کی شہادت دے گا کہ وہ اپنا انتساب امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی طرف کرتے ہیں۔ گویا کہ ان کو اگر دعویٰ بھی ہے تو مجتہد مطلق ہونے کا نہیں بلکہ مجتہد منتسب ہونے کا دعویٰ ہے۔ اجتہاد مطلق کا دعویٰ ان کی طرف منسوب کرنا ان پر بے جا تہمت ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ بلاشبہ علم کا بحر مواج ہیں اور یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جب کناروں سے اچھلتا ہے تو اس کا سیلاب بے کراں راستہ کی ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے' لیکن اجتہاد مطلق کی چوٹی اس سے بہت ہی دور و بلند و بالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے جن چند مسائل میں شذوذ و تفرد اختیار کیا انہیں ان کے تلامذہ میں بھی مکمل نفوذ ورواج نصیب نہ ہوا چہ جائیکہ ان کے اجتہاد مطلق کا مرتبہ امت میں تسلیم کیا جاتا۔ گویا حافظ ابن تیمیہؒ کے اجتہاد کی ترکتازیاں چند مسائل تک محدود رہیں اور وہ بھی لائق پذیرائی نہیں سمجھے گئے۔

حافظ جلال الدین سیوطیؒ کی وسعت علم اور جلالت قدر سے دنیا واقف ہے۔ کثرت تالیف میں انہیں گوئے سبقت حاصل ہے۔ دینی علوم میں سے شاید ہی کوئی فن ایسا ہوگا جس میں سیوطیؒ کی کوئی تصنیف نہ ہو' کہا جاتا ہے کہ انہیں بھی "اجتہاد مطلق" کا وہم ہوگیا تھا۔ اہل علم نے ایسے چند مسائل لکھ بھیجے جن میں شافعی مذہب کے دو قول ہیں' اور ان سے کہا گیا کہ اجتہاد کا ادنیٰ درجہ دو میں سے ایک قول کو ترجیح دینا ہے' ذرا اپنی علمی قوت سے ان مسائل میں دو قولوں میں سے ایک کو ترجیح دے کر اپنے لئے اجتہاد کا ادنیٰ ترین مرتبہ ہی ثابت کر دکھایئے' اجتہاد مطلق تو بہت دور کی چیز ہے' لیکن حافظ سیوطیؒ اس چیلنج کو قبول نہیں کرسکے۔ اور ان کا دعویٰ اجتہاد ہمیشہ کے لئے خاموشی کی غار میں دفن ہوگیا۔ حضرت شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ شروط اجتہاد ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں :

ترجمہ "چنانچہ حافظ سیوطیؒ نے باوجود اپنے علمی احاطہ کے اجتہاد کا دعویٰ کیا تو ان کے ہم عصر اہل علم ان کے مقابلہ میں کھڑے ہوگئے۔ چنانچہ مناوی لکھتے ہیں :

"سیوطیؒ پر اس کی وجہ سے قیامت برپا ہوگئی اور ان کا یہ

دعویٰ خود ان کے زمانے میں بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ اور اہل علم نے ان کو مناظرے کی دعوت دی مگر وہ اہل علم کا سامنا نہ کر سکے"۔

مناوی آگے لکھتے ہیں :

"اہل علم نے سیوطیؒ کو لکھا کہ جب آپ اجتہاد کے مدعی ہیں تو آپ پر لازم ہے کہ اسے دلیل سے ثابت کریں تاکہ جواب مطابق دعویٰ ہو اور آپ کو پانچویں فقہی مسلک کا بانی تصور کیا جائے"۔

علامہ شہاب الدین ابن حجرؒ (الہیتمی المکی المتوفی ۹۷۳ھ) لکھتے ہیں :

"جب جلال الدین سیوطیؒ نے اجتہاد کا دعویٰ کیا تو ان کے ہم عصر ان کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بیک زبان ہو کر ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ انہوں نے سیوطیؒ کے سامنے ایک سوالنامہ پیش کیا جس میں چند ایسے مسائل درج کئے جن میں مشائخ شافعیہ نے مطلقاً دو قول ذکر کر دیئے ہیں (اور ان میں سے کسی ایک قول کو ترجیح نہیں دی) اہل علم نے سیوطیؒ سے مطالبہ کیا کہ اگر انہیں (یعنی سیوطیؒ کو) اجتہاد کا ادنیٰ مرتبہ حاصل ہے جسے "اجتہاد فتویٰ" کہتے ہیں، تو ذرا یہ بتائیں کہ ان دو قولوں میں کون سا قول راجح ہے؟ اور مجتہدین کے قواعد کے مطابق اس کی ترجیح کی وجہ بھی بتائیں۔ لیکن سیوطیؒ نے یہ سوالنامہ بغیر جواب کے واپس کر دیا۔ اور یہ عذر کیا کہ میں بہت مصروف ہوں، اس لئے ان سوالات پر غور کرنے کی فرصت نہیں :

شیخ شہاب الدین ابن حجرؒ اس واقعہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں :

"اس سے اجتہاد کے ادنیٰ مرتبہ یعنی "اجتہاد فتویٰ" کی دشواری کا اندازہ کرو تمہیں ظاہر ہو جائے گا کہ اس ادنیٰ مرتبہ اجتہاد کا مدعی بھی اپنے معاملہ میں مبتلائے حیرت اور ذہنی و فکری فساد کا شکار ہے۔ وہ اندھی اونٹنی پر سوار ہو کر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے' چہ جائیکہ کوئی شخص اجتہاد مطلق کا دعویٰ کرے اور اجتہاد مطلق کے مرتبہ کا تصور جس شخص کے ذہن میں ہو اسے ان زمانوں کے کسی شخص کی طرف اس مرتبہ اجتہاد کو منسوب کرتے ہوئے شرم آئے گی۔ بلکہ شیخ ابن الصلاح اور ان کے متبعین کا کہنا ہے کہ "اجتہاد مطلق قریباً تین سو سال سے منقطع ہو چکا ہے"۔ اور ابن الصلاح کے زمانے کو بھی قریباً تین سو سال گزر چکے ہیں' گویا سیوطیؒ کے زمانے سے چھ سو سال پہلے اجتہاد مطلق منقطع ہو چکا تھا۔ (حافظ جلال الدین سیوطیؒ کی وفات ۹۱۱ھ میں ہوئی) بلکہ ابن الصلاح نے بعض اصولیین سے نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کے زمانہ سے اب تک کوئی مجتہد مطلق مستقل پیدا نہیں ہوا۔"

شیخ شہاب الدین ابن حجرؒ الہیتمی المکی آگے لکھتے ہیں :

" اور جب کہ ائمہ شافعیہ کے درمیان اس نکتہ پر طویل معرکہ آرائی ہوئی ہے کہ امام الحرمین اور حجتہ الاسلام امام غزالی--- اور ان دونوں کا علمی مرتبہ ومقام کسی کو معلوم نہیں--- آیا یہ دونوں حضرات "اصحاب وجوہ" میں سے ہیں یا

نہیں؟ جب کہ ''اصحاب وجوہ'' کا مرتبہ مجتہدین سے بہت ہی کم تر ہے تو دوسرے لوگوں کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟ بلکہ صاحب بحر نے تو صاف لکھا ہے کہ ''وہ اصحاب وجوہ میں سے نہیں تھے''۔ اور یہ باوجود ان کے اس قول کے ہے کہ ''اگر امام شافعیؒ کے فتاویٰ ضائع ہوجائیں تو میں ان کو اپنے حافظہ سے املا کراسکتا ہوں''۔

پس جب یہ اکابر بھی اجتہاد فی المذہب کے مرتبہ کے اہل نہ ہوئے تو جو شخص ان حضرات کی اکثر عبارتوں کو ٹھیک سمجھنے سے بھی معذور ہو اس کے لئے کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ وہ اس سے بھی اعلیٰ مرتبہ کے اجتہاد یعنی ''اجتہاد مطلق'' کا دعویٰ ہانکتا پھرے۔ سبحانک ھذا بھتان عظیم

اور ''انوار'' میں امام رافعیؒ نے نقل کیا ہے کہ :

'' قوم کا گویا اس پر اجماع ہے کہ آج کوئی مجتہد مطلق نہیں۔

اور دیار شام کے عالم ابن ابی الامؒ شروط اجتہاد کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

''ہمارے زمانے کے کسی عالم میں ان شروط اجتہاد کا وجود نہیں بلکہ آج روئے زمین پر کوئی مجتہد مطلق نہیں پایا جاتا۔ باوجودیکہ اہل علم نے تفسیر وحدیث اور اصول وفروع کی اس قدر کتابیں تصنیف کی ہیں کہ ان تصنیفات سے زمین کو بھر دیا ہے۔ اسکے باوجود کسی خطہ زمین میں نہ صرف یہ کہ مجتہد مطلق نہیں پایا جاتا بلکہ کسی امام کے مذہب کا ایسا مجتہد فی المذہب بھی موجود نہیں

جس کے اقوال کو اس کے امام کے مذہب میں تخریج شدہ روایت کا درجہ دیا جاسکے۔

اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس مرتبہ کی تحصیل سے عاجز کردیا ہے۔ اپنے بندوں کو یہ بتانے کے لئے کہ زمانہ ختم ہورہا ہے' اور قیامت کا قرب ہے' اور اجتہاد مطلق (کے درجے کے علم) کا اٹھ جانا بھی علامات قیامت میں سے ایک علامت ہے"۔

اور امام قفال جنہیں "شیخ الاصحاب" (شیخ الاصحاب سے مراد ہے "اصحاب وجوہ" کے استاذ' اصحاب وجوہ کا لفظ حضرات شافعیہ کے یہاں بولا جاتا ہے جس کی وضاحت آگے قفال کے قول میں آرہی ہے۔ ناقل) کا خطاب دیا گیا ہے' فرماتے ہیں :

" مجتہد فتویٰ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اجتہاد مطلق کے شروط کا جامع ہو۔ اور ایسا مجتہد اب دنیا میں موجود نہیں۔ دوسرا وہ جو ائمہ اجتہاد میں کسی کی طرف منسوب ہو۔ مثلاً امام شافعیؒ کی طرف' اور وہ اپنے امام کے مذہب کا ایسا ماہر وحاذق ہو کہ اس کا علم امام کے تمام اصول و فروع پر محیط ہو۔ اور امام کے اصولوں میں سے کوئی اصول اس کے علم سے خارج نہ ہو۔ پس جب اس سے کسی مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا جائے تو اگر اسے اپنے امام کی کوئی صراحت معلوم ہو تو اس کے مطابق جواب دے ورنہ اس کے مذہب میں اجتہاد کرکے اس کے اصولوں پر اس مسئلہ کی تخریج کرے۔ اور یہ مرتبہ کبریت احمر سے زیادہ نادر الوجود ہے۔

پس جب کہ امام قفال کا قول ان کی جلالت قدر کے باوجود یہ ہے' حالانکہ ان کے تلامذہ اور غلام بھی شافعی مذہب ہیں "اصحاب الوجوہ" کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ تو ہمارے دور کے علما میں سے کسی کے مرتبہ اجتہاد پر فائز ہونے کا کیا سوال ہے؟ یاد رہے کہ قاضی حسین قورانی' امام الحرمین کے والد جوینی' صید لانی' سنجی وغیرہم جیسے اکابر امام قفال کے غلاموں کی صف میں شامل ہیں۔ اور ان حضرات کے انتقال کے بعد اور امام حجتہ الاسلام ابو حامد غزالی کے شاگردوں کے انتقال کے بعد امام شافعیؒ کے مذہب میں تخریج وجوہ اور اجتہاد ومنتسب کا مرتبہ بھی ختم ہوگیا بعد میں صرف مذہب شافعیؒ کے ناقل وحافظ ہی رہ گئے۔ اور اس زمانے میں تو دنیا ہی ان سے خالی ہو گئی۔ اور زمانہ ان جیسے لوگ پیدا کرنے سے بانجھ ہوگیا"۔

اس اقتباس میں اس امر پر اظہار افسوس کیا گیا کہ "اجتہاد ومنتسب کے درجہ کا بھی کوئی شخص باقی نہیں رہا' اور صرف فقہی مذاہب کے حافظ وناقل ہی رہ گئے ہیں"۔ لیکن چار پانچ صدیوں کے مزید انحطاط کی بدولت اب واقعہ یہ ہے کہ فقہ حنفی یا شافعی ومالکی کے "حافظ" بھی دنیا سے ناپید ہورہے ہیں اور خال خال افراد ہی ایسے نظر آئیں گے جن کی نظر فقہی جزئیات پر محیط ہو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علیؒ آخر میں ابنائے زمانہ کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ومنه يعلم ايضا بطلان دعاوى قوم الاجتهاد من اهل عصرنا منهمكين فى الدنيا وجمعها وفى شهواتها ولذاتها يشغلون جميع

اوقاتهم بذلک لا یتصورون الاجتهاد بل ولا العلم وانما یدعون ذلک فهما منهم ان المجتهد یباح له ما لا یباح لغیره من المحرمات المجمع علیها وغیرها لا یعلمون ان من شروط الاجتهاد عدم معارضة الکتاب والسنة والاجماع"۔

ترجمہ :"یہیں سے ہمارے ابنائے زمانہ کے مدعیان اجتہاد کے دعویٰ کا باطل ہونا واضح ہوجاتا ہے۔ یہ حضرات سر سے پاؤں تک دنیا کے سمیٹنے میں منہمک ہیں' اور ہمہ وقت اس کی لذتوں اور شہوتوں کے حصول میں مشغول رہتے ہیں' ان کے ذہن میں نہ تو اجتہاد کا تصور ہے۔ اور نہ دین کا علم ہی رکھتے ہیں۔ ان کے دعویٰ کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجتہد کے لئے وہ چیزیں مباح ہوجاتی ہیں جو دوسروں کے لئے مباح نہیں ہوتیں' یعنی وہ چیزیں جو بالاجماع حرام ہیں مجتہد اپنے اجتہاد کے زور سے ان کو بھی حلال کرلیا کرتا ہے' یہ مسکین اتنا بھی نہیں جانتے کہ اجتہاد صحیح کیلئے یہ شرط ہے کہ وہ کتاب وسنت اور اجماع امت کے معارض نہ ہو"۔

۷ ــــــــایک طرف قرب قیامت اور علمی انحطاط کی بنا پر فہم شریعت کی صلاحیتیں رفتہ رفتہ کم ہورہی ہیں اور قلوب پر ہوائے نفس اور اعجاب بالرائے کے جذبات غالب آرہے ہیں۔ اور دوسری طرف جدید دور اور جدید تمدن نے بے شمار نئے مسائل پیدا کردیئے ہیں جن کے شرعی احکام دریافت کئے جاتے ہیں۔ اس مشکل

کا حل یہ ہے کہ وقت کے جامع ترین اہل علم اور قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کے ایسے ماہرین کے علم سے استفادہ کیا جائے، جن کا اخلاص و تقویٰ مسلم ہو۔ اور جن کا علم وفہم اور تدین لائق اعتماد ہو۔ ان کے اجتماعی غور و فکر سے ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔

حدیث شریف میں ہے:

عن علی رضی اللہ عنہ قال قلت یا رسول اللہ! ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر ولا نھی فما تامرنی؟ قال شاوروا فیہ الفقھا والعابدین، ولا تمضوا فیہ رای خاصۃ۔
(قال الھیثمی، رواہ الطبرانی فی الاوسط، ورجالہ موثوقون من الصحیح) *

(مجمع الزوائد ص۱۷۸ ج۱)

ترجمہ: "حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جس میں آپ کا کوئی بیان، کرنے یا نہ کرنے کا، نہ ملتا ہو تو آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں کیا کیا جائے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بارے میں فقہا وعابدین سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کریں، اور اس میں شخصی رائے کو دخل نہ دیں"۔

حضرت اقدس شیخ الاسلام مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ نے "بینات" بابت ربیعین ۱۳۸۳ھ میں اس پر تفصیلی بحث فرمائی تھی، اس سلسلہ میں

چند رہنما اصول بھی تحریر فرمائے تھے۔ اسے افادے کی غرض سے اس مضمون کے آخر میں بطور ضمیمہ نقل کر دیا گیا ہے۔

۸ ـــــ حق تعالیٰ شانہ نے مباحات کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے۔ اسلئے ایسے انتظامی امور جن کا حرام وحلال اور جائز وناجائز سے تعلق نہیں، اور نہ ان میں شارع کی طرف سے کوئی نص ہو، ان میں حکومت کے لئے یا پارلیمنٹ کے لئے قانون سازی کا وسیع میدان موجود ہے۔ جب کہ اس قانون سازی سے نہ تو کسی نص شرعی کی مخالفت لازم آتی ہو، اور نہ شریعت مطہرہ کے کسی قاعدے سے خروج لازم آتا ہو۔

اجتہاد کے موضوع پر ان چند تمہیدی نکات کے بعد اب ہم ڈاکٹر گورایہ صاحب کے خیالات کا جائزہ لیں گے۔

علامہ اقبال : مجتہد مطلق؟

ڈاکٹر گورایہ صاحب علامہ کے حوالے سے ایسے افکار پیش کرنا چاہتے ہیں جو کسی حساس مسلم معاشرہ میں آسانی سے ہضم نہیں ہو سکتے اس لئے انہیں ضرورت ہوئی کہ علامہ اقبال مرحوم کا قد مصنوعی طور پر بڑھایا جائے۔ ان کے لئے غیر واقعی بلندی ثابت کی جائے، اور پھر ان کی رفعت وعظمت کی بام بلند سے قوم کو خطاب کیا جائے۔ تاکہ گورایہ صاحب کے قارئین وسامعین کی گردنیں علامہ کی بلند قامتی کے آگے ایسی جھک جائیں کہ کسی کو ان کے نام پر پیش کئے گئے ناپختہ اور غیر منہضم خیالات پر دلیل طلب کرنے کا حوصلہ اور ان پر تنقید کا یارا نہ رہے۔

علامہ اقبال مرحوم کی عام شہرت ایک ملی شاعر، ایک نکتہ رس فلسفی، ایک دانشمند حکیم اور تہذیب جدید کے ایک دانائے راز ناقد کی حیثیت سے ہے، لیکن

گورایہ صاحب اپنی ضرورت کے لئے ان کی اپنی صف سے اٹھاکر انہیں ائمہ دین کی صف میں لاکھڑا کرتے ہیں' ہمارے سامنے ان کا تعارف دین و شریعت کے ایک مجتہد اعظم اور مجتہد مطلق کی حیثیت سے کراتے ہیں۔ ابو حنیفہ وشافعی (رحمہم اللہ) کو ان کے سامنے ہیچ ثابت کرتے ہیں' اور ان حضرات کے فقہی سرمایہ کو علامہ اقبال کی آرا کے مقابلہ میں باطل وفرسودہ قرار دیتے ہیں۔

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بو العجبیست

گورایہ صاحب بغیر کسی جھجک کے لکھتے ہیں :

"علامہ اقبال اجتہاد کے درجہ اول اجتہاد مطلق کے داعی ہیں' اور وہ خود مجتہد مطلق ہیں۔ ان دو اصطلاحوں کا استعمال وہ اپنے قلم سے خود کررہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اجتہاد کے اصول خود وضع کئے ہیں۔ اور انہیں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے ماخذ شریعت قرآن وحدیث' اجماع اور قیاس پر جو بحث کی ہے وہ نہایت بصیرت افروز ہے۔ جس سے ان کے اجتہاد کے وضع کردہ قواعد وضوابط واضح ہوجاتے ہیں"۔

"علامہ اقبال کی رائے میں گزشتہ فقہی افکار فرسودہ ہوچکے ہیں اور کسی قوم کے فرسودہ افکار اسکے احیا وتجدید کا ذریعہ نہیں بن سکتے"۔

جناب گورایہ صاحب کی اس تحریر کو پڑھ کر جو پہلا تاثر ذہن پر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شاید وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ "اجتہاد" کسے کہتے ہیں؟ اور مجتہد مطلق کون ہوتا ہے؟ ورنہ اگر ان الفاظ کی عظمت ان کے ذہن میں ہوتی تو ان الفاظ کے بے جا استعمال سے وہ ان مقدس اصطلاحات کی توہین وتذلیل نہ کرتے۔

اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ موصوف نے تین قسطوں میں "اجتہاد" پر مقالہ لکھا مگر کہیں ہلکا سا اشارہ بھی اس طرف نہیں کیا کہ اجتہاد کس چیز کا نام ہے؟ اس کی تعریف اور غرض وغایت کیا ہے؟ اجتہاد کے ضروری آلات و شرائط کیا ہیں؟ اجتہاد صحیح اور اجتہادباطل کے درمیان ما بہ الامتیاز کیا ہے؟ او ریہ کہ "مجتہد مطلق" کو کم سے کم کن صلاحیتوں کامالک اور کن صفات کا حامل ہونا چاہئے؟ جب آپ یہی نہیں بتاتے کہ اجتہاد کا مفہوم کیا ہے؟ اسکے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اور یہ نسخہ کس موقع پر استعمال کیا جاتا ہے؟ تو آپ کا خود ساختہ ترازو ہاتھ میں لے کر بیٹھ جانا اور یہ فیصلے دینا کہ فلاں کو اجتہاد کا حق ہے فلاں کو نہیں' یا یہ کہ فلاں شخص یا فلاں ادارہ چشم بد دور "مجتہد مطلق" ہے' اس پر قرآن کریم کی زبان میں یہی کہا جاسکتا ہے:

"ان هی الا اسماء سمیتموها انتم وآباکم"
(نجم۔ ۲۳)

ترجمہ :"یہ سب نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے"۔

گورایہ صاحب کے بقول علامہ مجتہد مطلق تھے۔ سوال یہ ہے کہ یہ آپ کا دعویٰ ہے اس کی دلیل؟ کیا علامہ نے خود مجتہد مطلق ہونے کا دعویٰ فرمایا تھا؟ کیا اس دعویٰ کو دلائل کی روشنی میں ثابت کر دکھایا تھا؟ کیا (گورایہ صاحب اور ان کے ہم نفسوں کے سوا) ان کے اس دعویٰ کو امت نے تسلیم کرلیا تھا؟ کیا علامہ نے اجتہاد کے اصول وفروع اور اس کے شرائط ولوازم اور مجتہد کے اوصاف اور آلات پر کوئی "اصول فقہ" مرتب فرمایا تھا؟ اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو کیا اجتہاد کے موضوع پر اپنے چند ذاتی رجحانات وخیالات پیش کرنے سے آدمی "مجتہد مطلق"

بن جاتا ہے ---- ؟ لیکن اس الحاد پرور دور میں گورایہ صاحب کا "اجتہاد" ذرا بھی لائق تعجب نہیں۔ جس زمانے میں مرزا غلام احمد قادیانی کو "محمد رسول اللہ" کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہو' جس زمانے میں "اللہ ورسول" کا ترجمہ "مرکز ملت (مرکزی حکومت) کے ساتھ کیا جاتا ہو' جس زمانے میں قرآن کریم کی تفسیر و تشریح کے لئے عقل وایمان کی شرط بھی غیر ضروری قرار دے دی گئی ہو' اور مسٹر پرویز اور مسٹر محمد علی لاہوری قادیانی ایسے لوگ "مفسر قرآن" کہلاتے ہوں۔ اس زمانے میں اگر گورایہ صاحب ایک قومی شاعر کو "مجتہد مطلق" قرار دے کر اسے ابو حنیفہؒ وشافعیؒ کے ہمدوش لاکھڑا کریں تو یہ ان کا ایک معمولی سا کارنامہ ہے' اور دور جدید کے مجتہدوں سے اسی قسم کے کارناموں کی توقع کی جاسکتی ہے :

"ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

گورایہ صاحب نے علامہ اقبال کو مجتہد مطلق کے منصب پر فائز کرکے ان کے "اجتہاد مطلق" کے چند نادر نمونے بھی پیش فرمائے ہیں جو ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں :

پہلا اجتہاد : خلافت نہیں' جمہوریت

موصوف "طرز حکومت" کا عنوان قائم کرکے علامہ اقبال کا پہلا اجتہادی نظریہ پیش فرماتے ہیں کہ ترکی کا الغائے خلافت کا "اجتہاد" صحیح تھا۔

موصوف لکھتے ہیں :

"علامہ اقبال کے نزدیک جمہوری طرز حکومت روح اسلام کے عین مطابق ہے۔ اور قانون سازی کا صحیح اور جائز حق ایک منتخب اسمبلی کو حاصل ہے۔ وہ ترکی کے اس "اجتہاد" کو روح اسلام کے عین مطابق قرار دیتے ہیں جس میں خلافت ایک منتخب اسمبلی کو

تفویض کرنے کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ اس پر وہ اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"ذاتی طور پر میرا ایمان ہے کہ ترکی کا اجتہاد کلی طور پر جائز ہے۔ یہ اتنا درست ہے کہ اس کی تائید میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ ایک تو جمہوری طرز حکومت مکمل طور پر روح اسلام کے عین مطابق ہے۔ ثانیاً ان نئی قوتوں کے پیش نظر جو عالم اسلام میں بیدار ہو چکی ہیں جمہوری طرز حکومت اور بھی ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے"۔

اس اجتہاد کے کئی پہلو غور طلب ہیں :

اولاً : اسلام یا روح اسلام؟

مندرجہ بالا مجتہدانہ عبارت میں "روح اسلام" کا لفظ کئی بار آیا ہے اور ہمارا جدت پسند طبقہ بڑی افراط سے اس لفظ کے استعمال کا عادی ہے۔ لیکن گورایہ صاحب نے اس امر کی وضاحت نہیں فرمائی کہ "روح اسلام" کیا چیز ہے؟ آیا یہ لفظ اسلام ہی کا مترادف ہے' یا اسلام سے الگ کوئی چیز ہے۔ اگر اسلام اور "روح اسلام" ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں تو اسلام کو چھوڑ کر "روح اسلام" کی اصطلاح کیوں استعمال کی جاتی ہے' یہ محض ایک فیشن ہے جس کے ذریعہ جدت پسندی اور مغربیت کی تقلید کے جذبہ کو تسکین دینا مقصود ہے' یا اس کے تحت کوئی گہری حکمت مضمر ہے؟

اسلام تو ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے موجود ہے' اور یہ وہ دین ہے جو حضرت حق جل شانہ نے نبی رحمت ﷺ کے ذریعہ انسانیت کو عطا فرمایا' لیکن یہ "اسلام کی روح" کس نے نکالی؟ کب نکالی گئی؟ اور یہ کہاں سے دستیاب ہوتی ہے؟ جس کا حوالہ جناب گورایہ صاحب دے رہے ہیں؟

شاید ہمارے کچھ دوست میرے اس نکتہ کی تضحیک فرمائیں کہ میں نے یہ کیا لفظی بحث شروع کردی ہے۔ ان کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ "روح اسلام" کی اصطلاح محض "بدعت الفاظ" نہیں بلکہ اس کے تحت ایک خوفناک الحاد مضمر ہے' ہمارا تجدد پسند طبقہ اس نظریہ کا قائل ہے (اور اسے مغربی یونیورسٹیوں میں شاید یہی سبق پڑھایا گیا ہے) کہ دنیا کا کوئی قانون غیر متبدل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اسلامی قوانین بھی غیر متبدل نہیں ہیں' خواہ وہ نصوص قطعیہ ہی سے ثابت ہوں۔ البتہ اسلام نے قانون سازی کا محور چند اعلیٰ وارفع اصولوں کو بنایا ہے۔ اسلام کی قانونی جزئیات بدل سکتی ہیں مگر یہ "راہنما اصول" غیر متبدل ہیں مثلاً عدل' مساوات' اخوت' انسانی ہمدردی وغیرہ وغیرہ۔ یہ چند مبہم اصول ان حضرات کے نزدیک اسلامی قانون کی روح ہیں۔ اور یہی اصول ان کی اصطلاح میں "روح اسلام" کہلاتے ہیں۔

ہمارے تجدد پسند طبقہ کا نظریہ یہ ہے کہ اسلام کے ان اصول عامہ (یا روح اسلام) کو باقی رکھتے ہوئے ہم دین اسلام کے تمام جزئیات میں اپنے دور کے مقتضیات کے مطابق تبدیلی کرسکتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہی اسلام کی دعوت ہے۔ یہی قرآن وسنت کا تقاضا ہے۔ اور یہی معنی ہیں اسلام کی ابدیت کے۔

ان کے بقول رسول اللہ ﷺ نے یا آپؐ کے خلفا راشدینؓ نے جو فیصلے کئے تھے وہ اپنے زمانے کے مقتضیات کے پیش نظر تھے' اور ہمیں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قانون سازی کرنی ہے۔ اس لئے نہ تو ہم خلفائے راشدینؓ کے کسی فیصلہ کے پابند ہیں' اور نہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کے۔ بعد کے ائمہ مجتہدین تو خیر کس شمار وقطار میں ہیں۔ راقم الحروف کی کئی تجدد پسندوں سے گفتگو ہوئی۔ ان کو اسی نظریہ کا قائل پایا۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن اپنی تحریروں میں کھل کر کہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ

کے فیصلے بھی ہمارے لئے زیادہ سے زیادہ قانونی نظیر ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر گورایہ صاحب بھی ائمہ مجتہدین کو لتاڑتے ہوئے ابھی صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ تک پہنچے ہیں (جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا) صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن عصمت پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ذرا جھجکتے ہیں' شاید کسی مصلحت کی وجہ سے۔ تاہم جب کہ ائمہ مجتہدین (ابو حنیفہؒ و شافعیؒ وغیرہ) ان کے اجتہاد کی برق رفتاری کے سامنے غبار راہ بن چکے ہیں' اور جب کہ خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں کے بدلنے کا وہ فتویٰ صادر فرما چکے ہیں' اگر ان کی اجتہادی ترقیات کی برق رفتاری کا یہی عالم رہا تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی آئندہ فتوحات کیا کیا ہوں گی؟

شاہ امسال دعوائے نبوت کردہ است
سال دیگر گر خدا خواہد خدا خواہد شدن

الغرض یہ ہے "روح اسلام" کی وہ اصطلاح' جو ہمارے متجددین کو مغرب سے القا ہوئی ہے۔ اور جس میں خوفناک الحاد و ارتداد کی روح مضمر ہے۔ یہ تھی وہ اصل وجہ جس کی بنا پر میں نے دور جدید کے مجتہد مطلق جناب گورایہ صاحب سے (جو حسن اتفاق سے میرے ہمنام بھی ہیں) یہ سوال کیا کہ آپ اسلام کے بجائے "روح اسلام" کے قائل کیوں ہیں؟ اسلام کو چھوڑنے کا سبب کیا ہے؟ اور "روح اسلام" کو اختیار کرنے کی کیا علت ہے؟

ثانیاً : خلافت یا جمہوریت؟

جہاں تک راقم الحروف کے ناقص علم کا تعلق ہے' جمہوریت دور جدید کی پیداوار ہے۔ اسلام کا نظریہ حکومت جدید دور کی جمہوریت نہیں' بلکہ خلافت ہے۔ قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں واضح طور پر نظریہ خلافت پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ

قرآن کریم بتاتا ہے کہ انسان کی تخلیق ہی خلافت کے لئے ہوئی ہے :

واذ قال ربک للملائکة انی جاعل فی الارض خلیفة

(البقرہ۔۳۰)

ترجمہ :"اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب"۔

(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

حضرت داود (علیٰ نبینا وعلیہ السلام) سے فرمایا گیا :

یا داود انا جعلناک خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الهوی فیضلک عن سبیل اللہ ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لهم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب

(ص ۲۶)

ترجمہ :"اے داود ہم نے کیا تجھ کو نائب ملک میں سو تو حکومت کر لوگوں میں انصاف سے' اور نہ چل جی کی خواہش پر' پھر وہ تجھ کو بچلادے اللہ کی راہ سے' مقرر جو لوگ بچلتے ہیں اللہ کی راہ سے ان کے لئے سخت عذاب ہے' اس بات پر کہ بھلادیا انہوں نے دن حساب کا"۔

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں :

عسیٰ ربکم ان یهلک عدوکم ویستخلفکم

فی الارض فینظر کیف تعملون۔

(الاعراف۔ ۱۲۹)

ترجمہ :"نزدیک ہے کہ رب تمہارا ہلاک کردے تمہارے دشمن کو' اور خلیفہ کردے تم کو ملک میں' پھر دیکھے تم کیسے کام کرتے ہو"۔

(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات) سے وعدہ فرمایا گیا ہے کہ انہیں زمین میں خلافت عطا کی جائے گی جیسا کہ ان سے پہلے حضرات کو عطا کی گئی :

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔

(النور۔۵۵)

ترجمہ :"وعدہ کرلیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کئے ہیں انہوں نے نیک کام' البتہ پیچھے حاکم کردے گا ان کو ملک میں جیسا حاکم کیا تھا ان سے اگلوں کو"۔

(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

یہ قرآن کریم کی چند آیات تھیں۔ چند احادیث بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ مثلاً ایک حدیث شریف میں ہے :

کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی' وانہ لا نبی بعدی وسیکون خلفا فیکثرون۔

(متفق علیہ' مشکوۃ ص۳۲۰)

ترجمہ :"بنی اسرائیل کی سیاست انبیا کے ہاتھ میں تھی۔ جب ایک نبی کا انتقال ہوجاتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی آجاتا۔ اور میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ البتہ خلفا ہوں گے اور بہت ہوں گے"۔

ایک اور حدیث میں ہے :

اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الآخر منهما۔

(رواہ مسلم مشکوۃ ص۳۲۰)

ترجمہ :"جب دو خلیفوں سے بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو قتل کردو"۔

ایک اور حدیث شریف میں ہے :

یکون فی آخر امتی خلیفة یحثی المال حثیا ولا یعدہ۔

(رواہ مسلم مشکوۃ ص۴۶۹)

ترجمہ :"میری امت کے آخری حصہ میں ایک خلیفہ ہوگا جو دونوں ہاتھوں سے بھر کر مال دے گا۔ اور گن کر نہیں دے گا"۔

ایک اور حدیث شریف میں ہے :

خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم یوتی اللہ الملک من یشا۔

(ابو داود ص۲۸۲ ج۲)

ترجمہ :"خلافت نبوت تیس سال ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں سلطنت عطا فرمائیں"۔

ایک اور حدیث شریف میں ہے :

لو کنت مستخلفا احدا عن غیر مشورة لاستخلفت ابن ام عبد۔

(ابن ماجہ ص۱۳)

ترجمہ :"اگر میں کسی کو بغیر مشورہ کے خلیفہ بناتا تو عبد اللہ بن مسعودؓ کو بناتا"۔

ایک اور حدیث شریف میں ہے :

ان ھذا الامر بدا نبوة ورحمة ثم یکون خلافة ورحمة ثم ملکا عضوضا ثم کائن جبریة وعتوا وفسادا فی الارض یستحلون الحریر والفروج والخمور' یرزقون علی ذلک وینصرون حتی یلقوا اللہ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰة ص۴۶۰)

ترجمہ :"یہ دین نبوت ورحمت سے شروع ہوا' پھر خلافت ورحمت ہوجائے گی' پھر کٹ کھنی سلطنت ہوگی پھر جبریت' سرکشی اور فساد فی الارض ہوگا۔

یہ لوگ ریشم کو' عصمتوں کو اور شراب کو حلال کرلیں گے' اس کے باوجود ان کو رزق بھی ملے گا اور ان کی مدد بھی ہوگی' یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جاملیں"۔

اس آخری حدیث سے واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں "طرز حکومت" کے سلسلہ میں چار دور ارشاد فرمائے ہیں :

پہلا دور نبوت ورحمت کا' یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دور نبوت وعصمت تھا۔

دوسرا دور خلافت ورحمت کا' یہ حضرات خلفائے راشدینؓ کا دور تھا جو ٹھیک ٹھیک منہاج نبوت پر قائم تھا۔ اور امت اسلامیہ کے لئے سراپا رحمت وبرکت تھا۔

تیسرا دور ملوکیت کا' جو خلفائے راشدینؓ کے بعد سے شروع ہوا اور خلافت عثمانیہ کے آخری تاجدار تک باقاعدہ رہا۔ اسکے بعد کہیں کہیں اس کے آثار ونشانات باقی رہ گئے۔

چوتھا دور جبریت وسرکشی اور فساد فی الارض کا' یہ ملوکیت کے بعد دور جدید کی جمہوریت ہے' اور اس میں جمہوریت کے نام پر دھونس اور دھاندلی' جبریت وسرکشی اور فساد فی الارض کے جو کارنامے انجام دیئے جارہے ہیں ان کا مشاہدہ کھلی آنکھوں ہر شخص کررہا ہے۔ گویا ملوکیت کے بعد جس دور کو جمہوریت کا سنہری دور کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جبریت کا سیاہ ترین دور ہے' جس میں پارلیمنٹ کو قانون سازی کے کلی اختیارات تفویض کردیئے جاتے ہیں۔ اور وہ حلال وحرام اور جائز وناجائز کی پروا کئے بغیر ہر قسم کی قانون سازی کی مجاز ہے "جمہوریت کی ماں" برطانیہ میں پارلیمنٹ نے "ہم جنسی شادی" کے جواز کا قانون وضع کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تصدیق کردی ہے کہ :

"یستحلون الحریر والفروج والخمور"

ترجمہ :"یہ لوگ ریشم کو' بدکاری کو اور شراب کو حلال کرلیں گے"۔

الغرض جہاں تک قرآن کریم اور احادیث نبویہؐ کی تعلیمات کا تعلق ہے ان سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام' جدید جمہوریت کا قائل نہیں بلکہ نظریہ خلافت کا داعی ہے۔ جس کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین میں بسایا گیا لیکن ہمارے مجتہد مطلق گورایہ صاحب' خلافت کے بجائے جمہوریت کو "روح اسلام" کے عین مطابق

قرار دیتے ہیں' معلوم نہیں اس "روح اسلام" کی وحی ان پر کہاں سے نازل ہوئی ہے۔

خلافت و جمہوریت ایک چیز نہیں' بلکہ طرز حکومت کے بارے میں یہ دو الگ الگ نظریے ہیں' اور ان دونوں کے درمیان مشرق و مغرب کا بعد اور زمین و آسمان کا فاصلہ ہے۔ (مشرق و مغرب اور زمین و آسمان کے الفاظ یہاں محض محاورے کی زبان میں استعمال کئے گئے ہیں' مگر ان میں یہ لطیفہ ہے کہ خلافت و جمہوریت پر ان کا حقیقی مفہوم بھی صادق آتا ہے۔ چنانچہ خلافت مشرقی چیز ہے' اور جمہوریت مغرب سے درآمد شدہ اصطلاح۔ خلافت آسمانی حکم ہے' اور جمہوریت زمین کی پیداوار۔ اس لئے واقعۃً ان کے درمیان مشرق و مغرب کا بعد اور آسمان و زمین کا فاصلہ ہے' ناقل) ان دونوں کے درمیان فرق و اختلاف کی تشریح ایک بسیط مقالے کا موضوع ہے۔ مگر میں یہاں ان دونوں کی تعریف نقل کرتا ہوں۔ اسی سے اہل فہم کو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں کے درمیان بنیادی فرق کیا ہے؟ چنانچہ خلافت کی تعریف 'امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے الفاظ میں یہ ہے :

هی الریاسة العامة فی التصدی لاقامة الدین باحیاء العلوم الدینیة واقامة ارکان الاسلام' والقیام بالجهاد وما یتعلق به من ترتیب الجیوش' والفرض للمقاتلة واعطائهم من الفئ- والقیام بالقضا واقامة الحدود ورفع المظالم والامر بالمعروف والنهی عن المنکر نیابةً عن النبی صلی الله علیه وسلم۔

(ازالة الخفا ص۲ ج۱)

ترجمہ :"خلافت نام ہے عوام کی ایسی سربراہی کا' جو آنحضرت ﷺ کی نیابت میں' اقامت دین کے اہتمام کی خاطر ہو' اور یہ اقامت دین مندرجہ ذیل امور کے ذریعہ ہوگی :

۱۔ دینی علوم کا احیا کرنا۔

۲۔ ارکان اسلام کو قائم کرنا۔

۳۔ جہاد اور متعلقات جہاد کا اہتمام کرنا۔ مثلاً لشکروں کی ترتیب وتیاری۔ مجاہدین کے لئے وظائف مقرر کرنا اور انہیں مال فئے میں سے دینا۔

۴۔ عدل وانصاف کا قائم کرنا۔ حدود شرعیہ کا جاری کرنا' اور ظالم سے مظلوم کا حق دلانا۔

۵۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام۔"

اور جمہوریت کی تعریف یہ کی گئی ہے :

"وہ طرز حکومت' جس میں بادشاہ کے بجائے عوام کے نمائندے کاروبار حکومت کو انجام دیتے ہیں"۔

(علمی لغات ص ۵۴۳۔ مولفہ جناب وارث سرہندی ایم اے)

دونوں کے مفہوم پر ذرا سا غور کیجئے تو دونوں کے درمیان مندرجہ ذیل فرق سامنے آجاتے ہیں :

۱ ـــــــ خلافت کا ادارہ آنحضرت ﷺ کی نیابت کے لئے ہے۔ اور جمہوریت میں عوام کے نمائندے عوام کی نیابت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

۲ ـــــــ خلافت کی غرض وغایت اقامت دین ہے۔ یعنی خدا کی زمین پر خدا کے

دین کا نفاذ۔ جب کہ جمہوریت کی غرض وغایت ہے' عوام کے پسندیدہ قانون کا جاری کرنا۔

۳ــــــ خلافت کا ادارہ شتر بے مہار نہیں' بلکہ وہ قانون الٰہی کا پابند اور شریعت الٰہی کے سامنے جواب دہ ہے۔ گویا شریعت خلافت سے بالاتر قانون ہے' اور کوئی شخص بھی شریعت سے انحراف کی صورت میں خلیفہ پر روک ٹوک کر سکتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے :

یٰا یھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئی فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر ذلک خیر واحسن تاویلا ۔

(النساء۔ ۵۹)

ترجمہ :"اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں' پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو طرف اللہ کے اور رسول کے' اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر' یہ بات اچھی ہے اور بہت بہتر ہے اس کا انجام"۔

(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے جو عہد لیا تھا اس میں ایک شق یہ تھی :

وان لا ننازع الامر اھلہ الاان تروا کفرا بواحا عندکم من اللہ فیہ برھان۔ (صحیح بخاری ص۱۰۲۵ ج۲)

ترجمہ :"اور ہم اہل حکومت سے حکومت کے معاملے میں منازعت نہ کریں۔ الا یہ کہ کھلا ہوا کفر دیکھو جس میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے برہان ودلیل ہے۔

قال النووی المراد بالکفر هنا المعصیة' ومعنی الحدیث لا تنازعوا ولاة الامور فی ولایتهم ولا تعترضوا علیهم' الا ان تروا منهم منکرا محققا' تعلمونه من قواعد الاسلام۔ فاذا رایتم ذلک فانکروا علیهم' وقولوا بالحق حیثما کنتم۔

(فتح الباری۔ ص۸ ج۱۳)

ترجمہ :"امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ کفر سے مراد یہاں معصیت ہے' اور حدیث کے معنی یہ ہیں کہ ارباب حکومت سے ان کی حکومت کے بارے میں منازعت نہ کرو' اور نہ ان پر اعتراض کرو۔ الا یہ کہ تم ان کی جانب سے کسی صریح منکر کا ارتکاب دیکھو۔ جس کا منکر ہونا تمہیں قواعد اسلام سے معلوم ہو۔ پس جب تم ایسی چیز دیکھو تو ان پر روک ٹوک کرو اور حق بات کہو خواہ تم کہیں بھی ہو"۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے اولین خطبہ خلافت میں حمد وثنا کے بعد فرمایا تھا :

ایها الناس انی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم' فان احسنت فاعینونی وان اسات فقومونی۔

(البدایہ والنہایہ ص۳۰۱ ج۶)

ترجمہ :"لوگو! مجھے تمہارا سربراہ بنادیا گیا ہے اور میں تم سے بہتر نہیں ہوں' پس اگر میں بھلائی کروں تو میری مدد کرو' اور اگر میں برائی کروں تو مجھے سیدھا کردو"۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک بار انہوں نے (لوگوں کا امتحان کرنے کے لئے) برسر ممبر فرمایا :

انما المال مالنا' والفئی فیئنا فمن شئنا اعطیناہ' ومن شئنا منعناہ۔

ترجمہ :"یہ (بیت المال) کا مال ہمارا ہے' اور یہ فئے ہماری ملک ہے۔ ہم جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں"۔

ان کو کسی نے جواب نہ دیا' اگلے جمعہ کو پھر یہی فرمایا' مگر کسی نے جواب نہ دیا' تیسرے جمعہ کو پھر یہی الفاظ دہرائے۔ اب کی بار حاضرین مسجد میں سے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہا :

کلا !انما المال مالنا' والفئی فیئنا' فمن حال بیننا وبینہ حاکمناہ الی اللہ باسیافنا۔

ترجمہ :"ہرگز نہیں! بلکہ یہ مال ہمارا (مسلمانوں کا) ہے اور یہ فئے ہماری ہے' جو شخص ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہو گا ہم اس کا فیصلہ اپنی تلواروں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کردیں گے"۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جمعہ سے فارغ ہوئے تو اس شخص کو بلا بھیجا اور

اسے اپنے ساتھ لے کر اندر تشریف لے گئے' لوگوں نے سمجھا کہ اس غریب کی تو شامت آگئی۔ لوگ اندر گئے تو دیکھا کہ وہ صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کی چارپائی پر بیٹھے ہیں' اور حضرت معاویہؓ لوگوں سے فرما رہے ہیں :

ان هذا احیانی احیاه الله سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول سیکون بعدی امرا یقولون ولا یرد علیهم' یتقاحمون فی النار کما تتقاحم القردة۔

ترجمہ :"بے شک اس نے مجھے زندہ کردیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو زندہ رکھیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میرے بعد کچھ حکام ہوں گے' وہ غلط باتیں کہیں گے مگر کوئی ان کو ٹوکے گا نہیں۔ یہ لوگ دوزخ میں ایسے گریں گے جیسے بندر ایک دوسرے پر گرتے ہیں"۔

میں نے پہلے جمعہ کو ایک بات کہی' مگر کسی نے میری تردید نہیں کی' اس پر مجھے اندیشہ ہوا کہ خدانخواستہ میں بھی انہی امرا میں سے ہوں۔ دوسرے جمعہ کو میں نے یہی بات دہرائی' مگر کسی نے میری تردید نہیں کی۔ تب میں نے دل میں سوچا کہ میں انہی لوگوں میں سے ہوں۔ تیسرے جمعہ کو میں نے پھر یہی بات دہرائی تو اس شخص نے کھڑے ہو کر میری تردید کر ڈالی۔

فاحیانی احیاه الله۔

ترجمہ :"پس اس نے مجھے زندہ کردیا اللہ اس کو زندہ رکھے"۔

(قال الہیثمی ج ۵ ص ۲۳۶) رواہ الطبرانی فی الکبیر الاوسط' ابو یعلی ورجالہ ثقات)

اسی ایک واقعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ حکمرانوں کی جو بات حدود شرعیہ سے متجاوز ہو اس پر روک ٹوک کرنا کتنا ضروری ہے۔ چنانچہ شریعت کے حوالے سے خلفا پر روک ٹوک کے واقعات اتنی کثرت سے ہیں کہ احاطہ شمار سے خارج ہیں۔

بر عکس اس کے جمہوری نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ مطلق العنان ادارہ ہے اور اس کا وضع کیا ہوا دستور سب سے بالاتر قانون ہے' اس سے بالاتر کوئی قانون نہیں جس کے حوالے سے ان پر روک ٹوک کی جاسکے۔ چنانچہ گزشتہ دنوں جب نفاذ شریعت کا سوال پیدا ہوا تو بعض روشن خیال دانشوروں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ شریعت کے ادارے کو پارلیمنٹ سے بالاتر تسلیم کرنا پارلیمنٹ کی توہین ہے اور اس کی بالادستی کو مجروح کرنا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پارلیمنٹ کے ارکان متفقہ طور پر کوئی قانون وضع کردیں تو کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔

گورایہ صاحب بھی شریعت کے مقابلہ میں "عوام کے منتخب نمائندوں" کی بالاتر حیثیت ہی کو منوانا چاہتے ہیں۔ الغرض خلافت کے بجائے جمہوریت کو "روح اسلام" کے عین مطابق کہنا صریحاً غلط ہے۔

ثالثاً : کیا جمہوریت واقعی جمہوریت ہے؟

گزشتہ معروضات سے معلوم ہوا ہوگا کہ جمہوریت کا بت مغرب کے سومنات میں تراشا گیا ہے جس کی "عوام" اور "عوامی نمائندگی" کے حوالے سے خوب نمائش ہی نہیں' بلکہ پرستش کی جاتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمہوریت کے نام سے عوام کا جس قدر استحصال کیا جاتا ہے اس کی مثالیں شاید دور ملوکیت میں بھی کم ہی مل سکیں گی۔ جمہوری نظام میں عوام کے نمائندے' حوالہ تو عوام کی خواہشات کا دیتے ہیں' لیکن واقعۃً انہیں عوام کی رائے کا کوئی احترام نہیں ہوتا' بلکہ وہ رائے عامہ کے

خلاف من مانیاں کرتے ہیں' اس کی واضح مثال "مسلمانوں کا عائلی قانون" ہے جو ایوب خان کے دور سیاہ میں جبر واستبداد کے ذریعہ عوام پر مسلط کیا گیا۔ اور بعد میں "عوامی نمائندوں" نے اس کو منظور کرلیا۔

پاکستان کے عوام کی اکثریت اس قانون کو غلط سمجھتی ہے لیکن ارباب اقتدار اور "عوام کے نمائندوں" نے عوام کی کثرت رائے کا کبھی احترام نہیں کیا۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ پاکستان کی ۹۵ فیصد اکثریت فقہ حنفی پر عمل پیرا ہے۔ اگر جمہوریت کے پجاریوں اور عوام کے نام نہاد نمائندوں کو عوام کی کثرت رائے کا ذرا بھی احترام ہوتا تو وہ فوراً فقہ حنفی کا نفاذ کردیتے۔ مگر آج تک کسی کو نہ عوام کے ایمان وعقیدہ کا خیال آیا' اور نہ عوام کی رائے کو لائق احترام سمجھا گیا۔ میں جناب گورایہ صاحب سے دریافت کرتا ہوں کہ پاکستان کے ۹۵ فیصد عوام کے مسلک وعقیدہ اور اس کی رائے اور خواہش کو چالیس سال تک مسلسل ٹھکراتے چلے آنا آخر جمہوریت کی کون سی قسم ہے؟ اور آنجناب اسمبلیوں کو "تعبیر شریعت کا اختیار" دینے کا جو فلسفہ تراش رہے ہیں کیا پاکستان کی ۹۵ فیصد رائے عامہ نے آپ کو اس کا اختیار دیا ہے؟ کیا یہی جمہوریت ہے جس میں ۹۵ فیصد عوام کی رائے کا کوئی احترام نہیں کیا جاتا' اور "فرقہ واریت" کا طعنہ دے کر اسے پامال کردیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ "جمہوریت" یا "سلطانی جمہور" کا نعرہ محض عوام کو دھوکہ دینے اور ان کو سبز باغ دکھا کر اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے ہے۔ ورنہ جمہوریت کے پجاریوں کے دل میں "جمہور کی رائے" ان کے عقیدہ وایمان اور ان کے مسلک ومشرب کا کوئی احترام نہیں۔ گویا جمہوریت وہ ہاتھی ہے جس کے دانت دکھانے کے اور' کھانے کے اور ہیں۔ اسکا ظاہر زن بازاری کی طرح عشوہ طراز ہے۔ مگر اس کا باطن گندگیوں سے لبریز۔

موجودہ جمہوریت کا طرزِ انتخاب بھی جمہوری نہیں۔ بلکہ یہ ایک مختصر سی اقلیت کو عوام کی گردنوں پر مسلط کرنے کی سازش ہے۔ اس کی مثال میں بھٹو صاحب کی "عوامی جمہوریت" کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بھٹو صاحب کو مشرقی پاکستان میں ایک ووٹ بھی نہیں ملا تھا اور مغربی پاکستان میں "عوام' عوام" کے مسلسل نعروں کے باوجود انہیں ۳۳ فیصد ووٹ مل سکے۔ گویا ۳۳ فیصد رائے دہندگان کے نمائندوں کی ایک مختصر سی اقلیت کو آٹھ کروڑ عوام کی تقدیر سے کھیلنے کا حق حاصل ہوگیا۔ اور پھر اس دور میں عوام کی جو گت بنائی گئی۔ جس طرح شرفا کی عزت و آبرو پر ہاتھ صاف کیا گیا۔ اور عوام کو سیدھا کرنے کے لئے جس طرح "دلائی کیمپ" کھولے گئے اس کی کہانی عوام کو کبھی نہیں بھولے گی۔ فرمایا جائے کہ کیا "جمہوریت" اسی کا نام ہے؟ اور یہی جمہوریت ہے جسے گورایہ صاحب روح اسلام کے عین مطابق قرار دے رہے ہیں؟

رابعاً : مصطفیٰ کمال کا اقدام روح اسلام کے عین مطابق؟

جناب گورایہ صاحب "جمہوری اجتہاد" کے شوق میں ترکی کے مصطفیٰ کمال کے اقدام کو حق وصواب اور روح اسلام کے عین مطابق قرار دیتے ہیں' شاید انہیں لیلائے جمہوریت کے عشق میں مصطفیٰ کمال کے وہ سیاہ کارنامے یاد نہیں رہے جو اس نے جمہوریت کے نام پر انجام دیئے' مثلاً :

۱ :—— خلافت اسلامیہ کا الغا' جس سے پورا عالم اسلام لرز گیا' اور اسلام کے ازلی دشمنوں کے گھر میں گھی کے چراغ جلے۔

۲ :—— اسلامی قانون کو معطل کرکے اس کی جگہ مغربی قانون کا نفاذ۔

۳ :—— عربی رسم الخط پر پابندی اور اس کی جگہ رومن رسم الخط کا جاری کرنا۔

۴ : ------دینی مدارس اور تکیوں کی منسوخی، دینی علوم کی تعلیم پر پابندی اور اسے لائق تعزیر جرم قرار دینا۔ اس زمانے کے ایک ترک عالم نے بتایا کہ مصطفیٰ کمال کے زمانے میں انہوں نے گھوڑوں کے اصطبلوں میں صحیح بخاری کا درس دیا۔

۵ : ------اسلامی شعائر کا اظہار ممنوع، حتیٰ کہ اذان پر بھی پابندی۔

۶ : ------خواتین کے شرعی پردہ پر پابندی عائد کی گئی، اور عورتوں کا بے پردہ مغربی لباس میں نکلنا لازم قرار دیا گیا۔

۷ : ------ ترکی کے قومی لباس کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور مغربی لباس کا پہننا لازم قرار دیا گیا۔

۸ : ------ لاکھوں علما و صلحا کو تہ تیغ کیا گیا، اور لاکھوں کو جلا وطن کیا گیا۔ مختصر یہ کہ کمیونسٹوں کے ہاتھوں سمرقند و بخارا میں اسلام اور مسلمانوں پر جو گزری وہی مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ترکی میں اسلام اور مسلمانوں کا حشر ہوا۔ اگر ترکی قوم کے دل کی گہرائیوں میں ایمان و عقیدہ پیوست نہ ہوتا تو اندیشہ تھا کہ مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ترکی دوسرا اسپین بن جاتا۔ جو شخص مصطفیٰ کمال کے اس ذہنی ارتداد و الحاد کو "صحیح اجتہاد" قرار دیتا ہے اور اسے روح اسلام کے عین مطابق قرار دیتا ہے، خود اس کا اسلام سے رشتہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علم و فہم، عقل و دانش اور عقیدہ و ایمان کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ اسلام کا مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ رضا بالکفر کفر ہے۔ جو شخص مصطفیٰ کمال کے ان صریح کفریات کو "اجتہاد صحیح" قرار دیتا ہو، اور انہیں "روح اسلام" کے عین مطابق بتاتا ہو اس کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے۔

(بینات شعبان سنہ ۱۴۰۷ھ)

پارلیمنٹ اور اجتہاد :

گورایہ صاحب کے نزدیک تعبیر شریعت کا نام اجتہاد ہے۔ ان کے نزدیک یہ کام نہ مولوی ملا کا ہے، نہ ائمہ مجتہدین کا۔ بلکہ یہ اختیار صرف اور صرف پارلیمنٹ کو حاصل ہے، انہوں نے اپنے اس مضمون میں اس فقرے کو بار بار دہرایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "شریعت بل" کی تحریک سے حد درجہ لرزاں و ترساں ہیں، اور انہیں یہ شدید خطرہ لاحق ہے کہ کہیں چالیس سال کے بعد پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ نہ ہو جائے۔ چنانچہ "تعبیر شریعت، پارلیمنٹ کا اختیار" کے تحت لکھتے ہیں :

> "اسلامی ریاست کی منتخب مقننہ کا بنیادی فریضہ تعبیر شریعت ہے۔ اس وقت یہی سب سے اہم مسئلہ قوم کو درپیش ہے کہ شریعت کی تعبیر کا اختیار کس کو حاصل ہے؟ کیا فقہی مسلکوں کو حاصل ہے؟ یا تعبیر شریعت کا اختیار منتخب قومی اسمبلی کو حاصل ہے؟ تعبیر شریعت ہی کا اسلامی نام اجتہاد ہے"۔

"تعبیر شریعت کا اختیار پارلیمنٹ کو کیوں؟" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں :

> "علامہ اقبال کا جواب نہایت واضح اور دو ٹوک ہے۔ ان کے نزدیک اب وقت آگیا ہے کہ فقہی مسلکوں کے غیر منتخب نمائندوں سے اختیار اجتہاد لے کر اسے قوم کی منتخب اور نمائندہ قانون ساز اسمبلی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فرقے دور ملوکیت اور استعمار کی پیداوار ہیں۔ اب جمہوریت کا دور ہے"۔

آگے لکھتے ہیں :

> "اب وقت آگیا ہے کہ تعبیر شریعت کا اختیار فقہی مسلکوں

کے افراد سے لے کر قوم کو منتقل کردیا جائے' جو اس کی جائز اور اصل حقدار ہے' وہ اپنے نمائندوں کے ذریعہ اس حق کا استعمال کرے"۔

آگے لکھتے ہیں :

" علامہ اقبال کا اجتہاد غیر مبہم ہے' عہد جدید میں تعبیر شریعت کا اختیار صرف اور صرف منتخب قومی اسمبلی کو حاصل ہے' ان کے اس اجتہاد کے دو بڑے سبب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ فقہی مسلکوں کے افراد تعبیر شریعت کے اہل نہیں----

دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام میں اختیار تعبیر شریعت پوری قوم کا حق ہے۔ خدا نے یہ اختیار کسی فرد یا طبقے کو تفویض نہیں کیا' بلکہ اس کا اختیار پوری قوم کو دیا ہے"۔

پارلیمنٹ خدا کی نمائندگی کرتی ہے یا عوام کی؟

گورایہ صاحب فرماتے ہیں کہ تعبیر شریعت کا اختیار پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ پارلیمنٹ کا انتخاب عوام کرتے ہیں' اور وہ عوام ہی کی نمائندگی کرتی ہے' جب کہ "شریعت" عوام کا وضع کردہ قانون نہیں' بلکہ حضرت حق جل شانہ کا نازل کردہ قانون عدل ہے۔ اور "تعبیر شریعت" کے معنی ہیں حق تعالیٰ شانہ کے نازل کردہ قانون کی تشریح میں حق تعالیٰ شانہ کی نمائندگی کرنا۔ گویا "تعبیر شریعت" حق تعالیٰ شانہ کی ترجمانی و نمائندگی کا نام ہے۔ اس کی صلاحیت وہی شخص رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ترجمانی کا اہل ہو۔ عوام نے اپنے ذوق و معیار کے مطابق جن

نمائندوں کو منتخب کیا وہ عوام کی نمائندگی تو کرسکتے ہیں، مگر حق تعالیٰ شانہ کی ترجمانی ونمائندگی کا حق انہیں کیسے حاصل ہوگیا؟ اس کا حق تو اسی کو حاصل ہے جس پر حق تعالیٰ شانہ کی نظر انتخاب واقع ہوئی ہو، اور اسے ان صلاحیتوں سے آراستہ کردیا گیا ہو جن کی اس ترجمانی کے لئے ضرورت ہے۔ حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں :

ولما کان التبلیغ عن اللہ سبحانہ یعتمد العلم بما یبلغ والصدق فیہ لم تصلح مرتبۃ التبلیغ بالروایۃ والفتیا الا لمن اتصف بالعلم والصدق، فیکون عالما بما یبلغ، صادقا فیہ، ویکون مع ذلک حسن الطریقۃ مرضی السیرۃ عدلا فی اقوالہ وافعالہ متشابہ السر والعلانیۃ فی مدخلہ ومخرجہ واحوالہ، واذا کان منصب التوقیع عن الملوک بالمحل الذی لا ینکر فضلہ ولا یجھل قدرہ وھو اعلی المراتب السنیات فکیف بمنصب التوقیع عن رب الارض والسموات؟

(اعلام الموقعین ج۱ ص۱۰)

ترجمہ: چونکہ حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے بات پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ پہنچانے والا اس کا علم بھی رکھتا ہو اور اس میں سچا بھی ہو، اس لئے خواہ یہ تبلیغ بطور روایت ہو، یا بصورت فتویٰ، اس کی صلاحیت وہی شخص رکھتا ہے جو علم وصدق کے ساتھ موصوف ہو تاکہ جس چیز کی وہ ترجمانی کررہا ہے اس کا علم بھی رکھتا ہو اور اس

میں سچائی بھی ہو' اور اسی کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ اس کی روش خوب اور اس کی سیرت پسندیدہ ہو' وہ اپنے اقوال وافعال میں عادل ہو اور تمام جلی و خفی امور واحوال میں اسکا ظاہر وباطن یکساں ہو' اور جب کہ بادشاہوں کی ترجمانی کا منصب ایسا عالی شان ہے کہ اس کے فضل وکمال کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس کی قدر ومنزلت سے کوئی ناواقف نہیں اور وہ بلند مناصب میں سے اعلیٰ ترین منصب شمار کیا جاتا ہے تو زمین و آسمان کے مالک کی ترجمانی کے منصب کی بلندی ونزاکت کا کیا عالم ہوگا؟"

جناب گورایہ صاحب کی غلط فہمی یا مغالطہ اندازی کا منشا یہ ہے کہ نفسیاتی اصول کے مطابق آدمی اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے' اور وہ اپنے ماحول کے اثرات سے خالی الذہن نہیں ہوسکتا' دور جدید میں قانون سازی کا کام پارلیمنٹ کرتی ہے اور پارلیمنٹ سے بالا کسی ادارے کا تصور ہی دور جدید کی جمہوریت میں نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ قانون سازی کا کام عوام کا منتخب ادارہ کرتا ہے جسے عربی میں "التشریع" کہا جاتا ہے' اس سے گورایہ صاحب نے یہ نظریہ اختراع کرلیا کہ "شریعت کی تعبیر" کا حق بھی عوام ہی کے منتخب نمائندوں کو ہے' حالانکہ بہت موٹی سی بات ہے کہ جس کی شریعت ہے' اسی کی طرف سے نمائندگی کی سند درکار ہے' عوام کی نمائندگی کی سند پر خدا کی شریعت کی تعبیر کا اختیار قطعاً لغو وباطل ہے۔ عوام کا نمائندہ' خدا کا نمائندہ نہیں کہ اسے عوام کی نمائندگی کی بنا پر تعبیر شریعت کا حق مل جائے۔

البتہ حق تعالیٰ شانہ نے اپنے بندوں کی سہولت کے لئے مباحات کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے' اس لئے انتظامی امور میں مباحات کے دائرے میں رہتے ہوئے حکومت قانون سازی کرسکتی ہے اور پارلیمنٹ کو بھی یہ اختیار ہے' مگر "تعبیر شریعت"

سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

تعبیر شریعت کا اختیار پارلیمنٹ کو کیوں

اس عنوان کے تحت گورایہ صاحب نے فقہی مسالک کے بجائے پارلیمنٹ کو تعبیر شریعت کا حق دینے کی دو وجہیں ذکر کی ہیں :

"پہلی وجہ یہ کہ فرقے دور ملوکیت اور استعمار کی پیداوار ہیں اور اب جمہوریت کا دور ہے' چوتھے خلیفہ راشد کی وفات کے بعد عہد بنو امیہ میں اور بعد میں عہد بنو عباس میں تعبیر شریعت کا اختیار امت سے فقہی مسلکوں اور فرقوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تعبیر شریعت کا اختیار فقہی مسلکوں کے افراد سے لے کر قوم کو منتقل کر دیا جائے' جو اس کی اصل اور جائز حق دار ہے۔ وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے اس حق کا استعمال کرے"۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ متحارب فرقوں کی موجودگی میں عہد جدید میں یہی واحد شکل ممکن ہے جو اجتہاد اختیار کر سکتا ہے اور صرف اسی طریقے سے قانون سازی میں عوام کی شرکت کو یقینی بنایا جا سکتا ہے' کیونکہ عوام "ریاست" اور معاشرے کے معاملات میں گہری بصیرت کے مالک ہوتے ہیں' اور ان کی شرکت کے بغیر قانون سازی بے جان اور بے نتیجہ رہتی ہے"۔

ان دو وجہوں کے ذکر کرنے کے بعد بھی گورایہ صاحب کا ضمیر اپنی بات پر مطمئن نہیں ہوتا' اس لئے وہ علامہ اقبال کے حوالے سے دوبارہ اس کے دو اسباب بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

"علامہ کا اجتہاد غیر مبہم ہے' عہد جدید میں تعبیر شریعت کا اختیار صرف اور صرف منتخب قومی اسمبلی کو حاصل ہے' ان کے اس "اجتہاد" کے دو بڑے سبب ہیں :

پہلا سبب یہ ہے کہ فقہی مسلکوں کے افراد تعبیر شریعت کے اہل نہیں' کیونکہ پوری قوم کی شریعت ایک ہے جب کہ وہ ایک شریعت کی بجائے مختلف اور متحارب فقہوں کے نمائندے ہیں' وہ اپنے فرقے کے لئے اپنی فقہ کی تعبیر تو کرسکتے ہیں مگر پوری قوم کے لئے شریعت کی تعبیر نہیں کرسکتے۔

"دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام میں اختیار تعبیر شریعت پوری قوم کا حق ہے' خدا نے یہ اختیار کسی فرد یا طبقے کو تفویض نہیں کیا' بلکہ اس کا اختیار پوری قوم کو دیا ہے۔ عہد رسالت میں حضور رسول اکرم ﷺ ریاستی امور' حکومتی معاملات اور معاشرتی و معاشی اداروں کی تشکیل میں عوام کی رائے معلوم فرماتے تھے " وشاورھم فی الامر" (قرآن۔۳/۵۹) (اور حکومت میں آپ ﷺ ان سے مشورہ لیں) کا یہی مفہوم ہے۔ اس قرآنی اصول پر مبنی نظام حکومت "وامرھم شوری بینھم" (قرآن ۴۲۔۳۸) (ان کے امور حکومت باہم مشورے سے طے پاتے ہیں) سے یہی مراد ہے۔ یہی سنت خلفائے راشدینؓ ہے"۔

اس تقریر میں گورایہ صاحب نے ان حیلوں بہانوں کا خلاصہ پیش کردیا ہے' جن کو ہمارا تجدد پسند طبقہ قید شریعت سے آزادی کے لئے استعمال کرنے کا خوگر ہے۔ گورایہ صاحب نے اس طویل اقتباس میں اپنے قارئین کو (بلکہ خود اپنے نفس کو بھی)

جو جو مغالطے دینے کی کوشش کی ہے ذرا ان کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے :

اولاً : کیا فقہی مسلک فرقے ہیں؟

گورایہ صاحب کا پہلا مغالطہ یہ ہے کہ وہ گمراہ فرقوں کو اور اہل حق کے فقہی مسالک کو ایک ہی ترازو سے تولتے ہیں اور سب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتے ہیں حالانکہ فقہی مسالک یا مکاتب فکر فرقے نہیں' بلکہ اہل سنت والجماعت ہی کی شاخیں ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین' جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا واسطہ شاگرد تھے ان کے درمیان کوئی اعتقادی و نظریاتی اختلاف نہیں تھا وہ سب دین حق کے پرستار تھے' لیکن فروعی مسائل میں اجتہادی اختلاف ان اکابر میں بھی پایا جاتا تھا' لیکن ان اجتہادی و فروعی اختلافات کے باوجود وہ سب ایک ہی "جماعت" تھے' بعد میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی کے زمانے میں نئے نئے نظریات نے سر اٹھانا شروع کیا اور بدعتی عقائد اور منحرف نظریات کی بنیاد پر مختلف فرقے منظم ہونے لگے۔ مثلاً خوارج' شیعہ' مرجیہ اور قدریہ وغیرہ---- صحابہ کرامؓ اور اکابر تابعین نے ان سے بیزاری کا اعلان کیا' ان سے مباحثے کئے' بعض اوقات قتل و قتال کی نوبت آئی' چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قدریہ سے اظہار برأت کرنا صحیح مسلم میں موجود ہے :

قال اذا لقیت اولئک فاخبرهم انی بری منهم وانهم براء منی' والذی یحلف به عبد الله بن عمر لو ان لاحدهم مثل احد ذهبا فانفقه ما قبل الله منه حتی یومن بالقدر.

(صحیح مسلم ص۲۷ ج۱)

ترجمہ :" فرمایا' جب تو ان سے ملے تو ان کو بتادینا کہ میں ان سے بری ہوں اور وہ مجھ سے بری ہیں اور عبد اللہ بن عمر جس چیز کی قسم کھاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی شخص اگر احد پہاڑ کے برابر سونا بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے قبول نہیں فرمائیں گے جب تک کہ تقدیر پر ایمان نہیں لاتا"۔

اور خارجیوں سے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قتال کرنا تاریخ کا معروف واقعہ ہے اور ان کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا :

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول سیخرج قوم فی آخر الزمان حداث الاسنان سفها الاحلام' یقولون من قول خیر البریہ۔

لا یجاوز ایمانهم حناجرهم یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة فاینما لقیتموهم فاقتلوهم فان فی قتلهم اجرا لمن قتلهم یوم القیامة۔

(صحیح بخاری ص۱۰۲۴ ج۲)

ترجمہ :"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ آخری زمانے میں کچھ لوگ نکلیں گے جو نو عمر' اور کم عقل ہوں گے اور وہ بہترین باتیں کریں گے۔

لیکن ان کا ایمان حلق سے نیچے نہیں اترے گا وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر نشانے سے نکل جاتا ہے تم ان کو

جہاں بھی پاؤ قتل کرو، کیونکہ ان کے قتل میں اس شخص کو قیامت کے دن اجر ملے گا جو انہیں قتل کرے گا"۔

اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول یخرج فی ھذہ الامۃ ولم یقل منھا قوم تحقرون صلٰوتکم مع صلواتھم، یقرؤن القرآن لا یجاوز حلوقھم او حناجرھم یمرقون من الدین کمروق السھم من الرمیۃ۔

(ایضاً)

ترجمہ :"میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ اس امت میں، اور یہ نہیں فرمایا کہ اس امت سے، ایک قوم نکلے گی کہ تم اپنی نماز کو ان کی نماز کے مقابلہ میں ہیچ سمجھو گے وہ قرآن پڑھیں گے، مگر ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر نشانے سے نکل جاتا ہے"۔

اور شیعہ روافض کے ہراول دستہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آگ میں جلانا بھی مشہور واقعہ ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے :

اتی علی بزنادقۃ فاحرقھم فبلغ ذلک ابن عباس فقال وکنت انا لم احرقھم لنھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تعذبوا بعذاب اللہ ولقتلتھم لقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، من بدل دینہ فاقتلوہ۔

(صحیح بخاری ص۴۲۳ ج۱، ص۱۰۲۳ ج۲)

ترجمہ :"حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چند زندیق لائے گئے' آپ نے ان کو آگ میں جلادیا' حضرت ابن عباسؓ کو یہ بات پہنچی تو فرمایا اگر میں ہوتا تو ان کو جلاتا نہیں' کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کسی کو عذاب نہ دو' میں ان کو قتل کرادیتا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے جس نے اپنا دین تبدیل کرلیا (یعنی اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہوگیا) اسے قتل کردو"۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع پہنچی کہ کچھ لوگ ان کو (حضرت علیؓ کو) حضرات شیخینؓ پر فضیلت دیتے ہیں' آپ یہ سن کر ممبر پر تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا :

بلغنی ان اقواما یفضلونی علی ابی بکر وعمر ولو کنت تقدمت فیه لعاقبت فیه فمن سمعته بعد هذا الیوم یقول هذا فهو مفتر۔ علیه حد المفتری ثم قال ان خیر هذه الامة بعد نبیها ابو بکر ثم عمر' ثم الله اعلم بالخیر بعد۔ قال وفی المجلس الحسن بن علی فقال والله! لو سمی الثالث' سمی عثمان۔

(ازالۃ الخفا فارسی ص۳۱۷ ج۱)

ترجمہ :"مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ کچھ لوگ مجھے ابو بکر وعمر پر فضیلت دیتے ہیں' اگر میں نے پہلے اس سلسلہ میں تنبیہہ کردی ہوتی تو میں انہیں اس پر سزادیتا' پس آج کے بعد اگر میں نے کسی کو یہ بات

کہتے ہوئے سنا تو وہ مفتری ہے اور اس پر مفتری کی سزا (اسی کوڑے) جاری ہوگی پھر فرمایا اس امت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر ابو بکرؓ ہیں، پھر عمرؓ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون بہتر ہے، راوی کہتے ہیں کہ مجلس میں حضرت حسن بن علیؓ بھی موجود تھے انہوں نے فرمایا بخدا! اگر آپ تیسرے کا نام لیتے تو حضرت عثمانؓ کا نام لیتے رضی اللہ عنہم۔"

الغرض ان فِرَقِ باطلہ کے ابتدائی دور ہی میں حضرت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان پر شدید نکیر فرمائی، فہمائش بھی کی، اور سزائیں بھی دیں، مگر چونکہ ان فرقوں کی بنیاد اخلاص وللّٰہیت پر نہیں تھی اسلئے اس فہمائش اور نکیر کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ رفتہ رفتہ یہ فرقے امت مسلمہ میں اپنا اثر و نفوذ پیدا کرنے اور بہت سے کم فہم افراد کو اپنا صید زبوں بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ ان تمام فرقوں کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق امت مسلمہ کی بھاری اکثریت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقہ پر قائم رہی، اور گمراہ فرقوں سے امتیاز کے لئے انہوں نے اپنا لقب "اہل سنت والجماعت" رکھا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :

لا یزال من امتی امة قائمة بامر اللہ لا یضرھم من خذلھم ولا من خالفھم حتی یاتی امر اللہ وھم علی ذلک۔

(متفق علیہ۔ مشکوۃ ص ۵۸۳)

ترجمہ :"میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے صحیح حکم پر قائم رہے گی، جو شخص ان کا ساتھ نہ دے یا ان کی مخالفت

کرے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا' یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے گا اور وہ اس پر قائم ہوں گے"۔

ایک اور حدیث میں ہے :

ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة وتفترق امتی علی ثلث وسبعین ملة کلهم فی النار الا ملة واحدة قالوا من هی یا رسول اللّٰه؟ قال ما انا علیه واصحابی۔

(رواہ الترمذی۔ مشکوٰۃ ص۳۰)

ترجمہ :" بنو اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹے تھے اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹے گی' یہ سب کے سب سوائے ایک کے جہنم میں جائیں گے' عرض کیا گیا یا رسول اللہ! یہ نجات پانے والا فرقہ کون سا ہے؟ فرمایا جو لوگ اس راستہ پر قائم رہیں گے جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں"۔

ایک اور حدیث میں ہے :

اتبعوا السواد الاعظم' فانه من شذ شذ فی النار۔

(رواہ الترمذی۔ مشکوٰۃ ص۳۰)

ترجمہ :"سواد اعظم کا ساتھ دو کیونکہ جو شخص ان سے الگ ہوا وہ دوزخ میں داخل کیا جائے گا"۔

اور نہج البلاغہ جلد دوم ص۱۱ میں ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا :

سیهلک فی صنفان محب مفرط یذهب به

الحب الی غیر الحق ومبغض مفرط یذھب بہ البغض الی غیر الحق وخیر الناس فّی حالا النمط الاوسط فالزموہ والزموا السواد الاعظم فان ید اللہ علی الجماعۃ وایاکم والفرقۃ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب الامن دعا الی ھذا الشعار فاقتلوہ ولوکان تحت عمامتی ھذہ۔

(نہج البلاغہ جلد دوم ص۱۱)

ترجمہ: "عنقریب میرے متعلق دو قسم کے لوگ ہلاک ہوں گے ایک محبت کرنے والا' حد سے بڑھ جانے والا جس کو محبت خلاف حق کی طرف لے جائے' دوسرا بغض رکھنے والا' حد سے کم کرنے والا۔ جس کو بغض خلاف حق کی طرف لے جائے' اور سب سے بہتر حال میرے متعلق درمیانے گروہ کا ہے' (جو نہ زیادہ محبت کرے نہ بغض رکھے) پس اس درمیانی حالت کو اپنے لئے ضروری سمجھو اور سواد اعظم یعنی بڑی جماعت کے ساتھ رہو کیونکہ اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور خبردار جماعت سے علیحدگی نہ اختیار کرنا کیونکہ جو انسان جماعت سے الگ ہوجاتا ہے وہ شیطان کے حصہ میں بن جاتا ہے جیسے کہ گلہ سے الگ ہونے والی بکری بھیڑیئے کا حصہ بنتی ہے' آگاہ ہوجاؤ! جو شخص تم کو جماعت سے الگ ہونے کی تعلیم دے اس کو قتل کردینا اگرچہ وہ میرے اس عمامہ کے نیچے ہو"۔

الغرض گمراہ فرقے اپنی اپنی خواہشات وبدعات کو لے کر سواد اعظم سے الگ

ہوتے رہے' لیکن امت کی غالب اکثریت صحابہؓ و تابعینؒ کے عقائد حقہ سے وابستہ رہی اور "اہل سنت والجماعت" کے لقب سے ملقب ہوئی' انہی اہل سنت میں ائمہ فقہا ہوئے جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے' پس اہل حق اور اہل باطل کو ایک ہی ترازو سے تولنا اور ائمہ مجتہدینؒ اور ان کے متبعین کو بھی باطل فرقوں کی صف میں شامل کر دینا ایک ایسا ظلم ہے جس کی توقع کسی صاحب فہم وانصاف سے نہیں کی جانی چاہئے۔

فرقہ واریت کا مسئلہ

ہمارے پڑھے لکھے طبقہ کا ذہن جن بہت سے مسائل میں الجھا ہوا ہے ان میں سے ایک "فرقہ واریت" کا مسئلہ ہے' ان کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی ہے کہ اسلام میں فرقہ واریت کی کوئی گنجائش نہیں' اور چونکہ یہ فرقے ملوکیت کے دور کی پیداوار ہیں اس لئے ہمیں فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر اسلام سے رشتہ جوڑنا چاہئے' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا یہ طبقہ تمام جماعتوں اور فرقوں کو یکساں نفرت کا مستحق سمجھتا ہے' مگر یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے' میں چاہتا ہوں اس سلسلہ میں چند نکات لکھ دوں' ممکن ہے کسی صاحب فہم ودانش کی غلط فہمی دور ہو سکے۔ وباللہ التوفیق۔

۱ : ــــــ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم میں بہت سی جگہ تفرق وافتراق (فرقہ واریت) کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ مثلاً :

واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا'
واذكروا نعمة الله عليكم اذ كنتم اعداء فالف
بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا ـ الآيه

(آل عمران۔ ۱۰۳)

ترجمہ :"اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی' سب مل کر' اور پھوٹ نہ

ڈالو' اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر' جب کہ تھے تم آپس میں دشمن' پھر الفت دی تمہارے دلوں میں' اب ہو گئے اس کے فضل سے بھائی (بھائی)"

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینات۔

(آل عمران۔۱۰۵)

ترجمہ :"اور مت ہو ان کی طرح جو متفرق ہو گئے اور اختلاف کرنے لگے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کو حکم صاف"۔

ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیء انما امرھم الی اللہ' الخ

(الانعام۔ ۱۵۹)

ترجمہ :"جنہوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں' اور ہو گئے بہت سے فرقے' تجھ کو ان سے کچھ سروکار نہیں ان کا کام اللہ ہی کے حوالے ہے"۔

ولا تکونوا من المشرکین' من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا' کل حزب بما لدیھم فرحون۔

(الروم۔۳۲)

ترجمہ :"اور مت ہو شرک کرنے والوں میں' جنہوں نے پھوٹ ڈالی اپنے دین میں' اور ہو گئے ان میں بہت فرقے' ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے اس پر فریفتہ ہے"۔

۲ : ــــــــ لیکن اسی کے ساتھ یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ لوگ ان ہدایات پر عمل نہیں کریں گے، بلکہ اختلاف اور تفرقہ کی بیماری ان میں سرایت کرجائے گی، اور حق تعالیٰ شانہ کی تکوینی حکمت و مشیت ان میں جاری ہو کر رہے گی۔

حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے :

لو شاء ربک لجعل الناس امة واحدة ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربک ولذلک خلقهم وتمت کلمة ربک لا ملئن جهنم من الجنة والناس اجمعین۔

(ھود۔ ۱۱۸ و ۱۱۹)

ترجمہ :" اور اگر چاہتا تیرا رب (تو) کر ڈالتا لوگوں کو ایک رستہ پر، اور ہمیشہ رہتے ہیں اختلاف میں، مگر جن پر رحم کیا تیرے رب نے اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا ہے اور پوری ہوئی بات تیرے رب کی کہ البتہ بھر دوں گا دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے۔"

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

۳ : ــــــ اور اس اختلاف و تفرق کا منشا، خواہشات کا اختلاف ہے کیونکہ ہر فرقہ اپنی خواہشات کے رنگ میں دین کو ڈھالنے کا متمنی ہے، حالانکہ دین حق لوگوں کی خواہشات کا تابع نہیں، حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے :

لو اتبع الحق اهواء هم لفسدت السموات والارض ومن فیهن۔

(المومنون۔ ۷۱)

ترجمہ :" اور اگر دین حق ان کے خیالات کے تابع ہوجاتا تو تمام

آسمان اور زمین اور جو ان میں آباد ہیں سب تباہ ہوجاتے"۔

(ترجمہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :

فی روایة احمد وابی داود عن معاویة رضی الله عنه : ثنتان وسبعون فی النار وواحدة فی الجنة وهی الجماعة وانه سیخرج فی امتی اقوام تتجاری بهم تلک الاهواء کما یتجاری الکلب بصاحبه لا یبقی منه عرق ولا مفصل الا دخله۔

(مشکوٰۃ۔ ص۳۰)

ترجمہ :"میری امت میں ۷۳ فرقے ہوں گے' ۷۲ دوزخ میں ہوں گے اور ایک جنت میں اور یہ "الجماعت" یعنی برحق جماعت ہے اور میری امت میں کچھ لوگ نکلیں گے جن میں خواہشات اور غلط نظریات اس طرح سرایت کرجائیں گے جس طرح باؤلے کتے کے کاٹے ہوئے شخص کی بیماری ہوتی ہے کہ اس کا کوئی جوڑ اور کوئی رگ وریشہ ایسا نہیں رہتا جس میں یہ بیماری سرایت نہ کرجاتی ہو"۔

۴ :——— چونکہ ایسے فرقوں کا وجود میں آنا مقدر تھا' اس لئے امت کو ہدایات دی گئی ہیں کہ ان نئے نئے خوشنما نظریات سے دھوکہ نہ کھائیں' بلکہ "صحابہؓ کی جماعت" جس راستہ پر قائم رہی ہے' شدت کے ساتھ اسی پر قائم رہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے :

ان الشیطان ذئب الانسان کذئب الغنم

یاخذ الشاذة والقاصية والناحية وایاکم والشعاب، وعلیکم بالجماعة والعامة۔

(رواہ احمد۔ مشکوٰۃ ص۳۱)

ترجمہ: "شیطان، انسان کا بھیڑیا ہے، جس طرح بکریوں کا بھیڑیا ہوتا ہے، جو بکری ریوڑ سے الگ ہوجائے، دور رہ جائے یا ادھر ادھر ہوجائے بھیڑیا اسے اچک لیتا ہے، اس لئے گھاٹیوں سے بچو اور "الجماعت" اور عام امت (کے عقائد) کو لازم پکڑو"۔

ایک اور حدیث میں ہے :

من فارق الجماعة شبرا فقد خلع ربقة الاسلام عن عنقه۔

(رواہ احمد وابو داود۔ مشکوٰۃ ص۳۱)

ترجمہ: "جو شخص "الجماعت" سے جدا ہوگیا اس نے اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا"۔

۵ : ------ یہ فرقے جو نئے نئے نظریات تراش کر "الجماعت" سے الگ ہو رہے ہیں یہ لائق احترام نہیں بلکہ لائق سرزنش ہیں، چنانچہ ارشاد نبویؐ ہے :

من وقر صاحب بدعة فقد اعان على هدم الاسلام۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان مرسلا۔ مشکوٰۃ ص۳۱)

ترجمہ: "جس شخص نے کسی صاحب بدعت کی عزت کی اس نے دین اسلام کو ڈھانے میں مدد دی"۔

ان تمام ارشادات کو مجموعی طور پر سامنے رکھنے کے بعد فرقہ واریت کے مسئلہ

میں حق وصداقت کی شاہراہ ہر صاحب فہم کے سامنے کھل جاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

الف : ------وہ فرقے تو بلاشبہ مذموم اور لائق نفرت ہیں جنہوں نے صحابہ کرامؓ کے جادہ مستقیم کو چھوڑ کر الگ الگ پگڈنڈیاں پکڑلیں، لیکن اہل حق "اہل سنت والجماعت" جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے صحیح راستے پر قائم ہے، وہ نہ تو مذموم فرقہ بندی کے مجرم ہیں اور نہ ان کو یہ الزام دینا صحیح ہے۔

ب : ــــ جب اہل باطل نے اہل حق سے الگ ہوکر فرقے پیدا کرلئے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سچے امتی کا فرض یہ ہے کہ وہ اہل حق کا ساتھ دے اس اختلاف وتفرقہ کی موجودگی میں یہ نظریہ پیش کرنا کہ ہمیں تمام فرقوں سے بالاتر ہوکر اسلام سے وابستہ ہونا چاہئے۔ قطعاً غلط اور باطل نظریہ ہے، کیونکہ حق وباطل کی جنگ میں جو شخص اہل حق اور اہل باطل دونوں سے علیحدگی اور برأت کا اعلان کرے وہ بھی اہل باطل کی صف میں شامل سمجھا جائے گا، اس لئے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا کہ "اس نے اپنی گردن سے اسلام کا جوأ اتار پھینکا"۔ جو شخص باطل فرقوں کے مقابلہ میں اہل حق کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسکو حق اور اہل حق سے کوئی تعلق نہیں، ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا اسلام اور مسلمانی میں کیا حصہ ہوگا؟

ج : ------جب یہ فرقے جنہوں نے شاہراہ اسلام کو چھوڑ کر ادھر ادھر کی گھاٹیوں میں پھیلنا شروع کردیا اور جنہوں نے اختلاف وتفرقہ کی آری سے امت اسلامیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے، گمراہ اور باطل ہیں تو ان کو مسند احترام پر بٹھانا اور قانون سازی تک میں ان کی رو رعایت کرنا اسلام کو ڈھادینے کے ہم معنی ہے،

کیونکہ جو شخص باطل و گمراہ فرقوں کو لائق احترام سمجھتا ہے وہ حق و باطل کے درمیان فرق و امتیاز کی صلاحیت سے محروم ہے' اس کی مثال چوہڑے کے چھرے کی ہے' جو حلال و حرام کے درمیان تمیز نہیں کرتا' ظاہر ہے کہ ایسا شخص حق سے غداری اور خدا و رسول سے بے وفائی کا مرتکب ہے۔

ثانیاً: کیا گمراہ فرقے دور ملوکیت کی پیداوار ہیں؟

جناب گورایہ صاحب کا یہ کہنا بھی مغالطہ انگیز ہے کہ "فرقے دور ملوکیت کی پیداوار ہیں"۔ کیونکہ اس فقرے کا متبادر مفہوم یہ ہے کہ ملوکیت نے گمراہ فرقوں کو جنم دیا' اور ملوکیت ہی ان فرقوں کو پروان چڑھانے کی ذمہ دار تھی' حالانکہ گمراہ فرقوں کا آغاز خلافت راشدہ میں ہو چکا تھا' جیسا کہ پہلے اوپر بتا چکا ہوں اور اب دور جمہوریت میں بھی گمراہ کن فرقوں کی نشو و نما کچھ کم نہیں ہو رہی' البتہ دور ملوکیت میں اور آج کے نام نہاد دور جمہوریت میں یہ فرق ضرور ہے کہ دور ملوکیت میں سلاطین عادل نے گمراہ فرقوں کا قلع قمع کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں چھوڑا' جس سے تاریخ کے صفحات لبریز ہیں' اور آج کے دور جمہوریت میں دین کے نام پر خواہ کوئی کتنی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتا پھرے' اسے کوئی نہیں پوچھتا کہ تیرے منہ میں کتنے دانت ہیں؟ پرستاران جمہوریت کے اقتدار کو ذرا سا خطرہ لاحق ہو جائے تو حکومت کی پوری مشینری حرکت میں آجاتی ہے' لیکن خدا و رسول اور اسلام کے خلاف خواہ کوئی کیسے ہی باغیانہ افکار و خیالات کا اظہار کرے' "جمہوریت" اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی' بلکہ "آزادی خیال ہر فرد کا فطری حق ہے" کا اصول تسلیم کرکے ہر کفر و الحاد کی کھلی چھٹی دیتی ہے' اکبر الہ آبادی کے بقول:

گورنمنٹ کی یارو خیر مناؤ
انا الحق کہو اور سولی نہ پاؤ

کاش گورایہ صاحب نے دور ملوکیت کو فرقہ بندی کا طعنہ دینے سے پہلے ہی جمہوریت کا دامن فرقہ بندی کی لعنت سے پاک کردیا ہوتا۔

ثالثاً : کیا تعبیر شریعت پوری قوم کا حق ہے؟

گورایہ صاحب کے استدلال کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انہی کے بقول :

"اسلام میں اختیار تعبیر شریعت پوری قوم کا حق ہے، خدا نے یہ اختیار کسی فرد یا طبقے کو تفویض نہیں کیا، بلکہ اس کا اختیار پوری قوم کو دیا ہے"۔

یہ تو موصوف کا دعویٰ ہوا، ذرا اس دعویٰ کی دلیل بھی ملاحظہ فرمایئے اور موصوف کی فہم وذکا اور ان کے علم وفضل کی داد دیجئے، فرماتے ہیں :

"عہد رسالت میں رسول اکرم ﷺ ریاستی امور، حکومتی معاملات اور معاشرتی اداروں کی تشکیل میں عوام کی رائے معلوم فرماتے تھے، "وشاورھم فی الامر" (قرآن۔۳۔۱۹۵) (امور حکومت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مشورہ لیں) کا یہی مفہوم ہے۔ "وامرھم شوری بینھم" (۴۲۔۳۸)ان کے امور حکومت باہم مشورہ سے طے پاتے ہیں) سے یہی مراد ہے، یہی سنت خلفائے راشدینؓ ہے"۔

ذرا گورایہ صاحب کی استدلالی منطق ملاحظہ فرمایئے۔ آپ دعویٰ تو یہ فرمارہے ہیں کہ "تعبیر شریعت کا اختیار کسی فرد یا طبقہ کو نہیں بلکہ پوری قوم کو دیا گیا ہے"۔ اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ بحکم خداوندی فلاں فلاں امور میں

مشورہ فرمایا کرتے تھے' کیا گورایہ صاحب اپنے "اَن پڑھ" قارئین کو یہ سمجھانے کی کوشش فرمارہے ہیں کہ عہد رسالت میں بھی تعبیر شریعت کا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں' بلکہ یہ اختیار پوری قوم کو حاصل تھا اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تعبیر شریعت کے لئے "پوری قوم کی رائے" کے محتاج اور اس کے پابند تھے؟ قارئین کرام ہی فرمائیں کہ کیا ایسا "خوبصورت جھوٹ" انہوں نے پہلے بھی کبھی سنا ہے؟ اور لطف یہ کہ اس سخن سازی کے لئے جناب گورایہ صاحب قرآن کریم کا حوالہ رقم فرمارہے ہیں' کیا اسی دروغ بافی اور سخن سازی کا نام "اجتہاد مطلق" ہے جس کی دعوت گورایہ صاحب "قوم کے نمائندوں" کو دے رہے ہیں؟

انا للہ وانا الیہ راجعون

اور پھر اس نکتہ پر بھی غور فرمایئے کہ دعویٰ تو یہ کیا جارہا ہے کہ تعبیر شریعت کا حق اہل علم کو نہیں' بلکہ پوری قوم کو ہے' اور دلیل میں یہ پیش کیا جارہا ہے کہ بعض انتظامی معاملات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے' میں پوچھتا ہوں' کہ بعض ریاستی امور اور حکومتی معاملات میں مشورہ لینا یا دینا آپ کے نزدیک "تعبیر شریعت" ہے؟ کچھ تو غور فرمایئے کہ آپ دعویٰ کیا ہولناک فرمارہے ہیں اور اس کی دلیل کیا دے رہے ہیں؟ یہ خالص مغالطہ اور سفسطہ نہیں تو اور کیا ہے؟

پھر کیا آپ یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ "ریاستی امور' حکومتی معاملات اور معاشرتی اداروں کی تشکیل" کے دائرے میں بھی تمام امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "پوری قوم" سے رائے طلب فرماتے تھے؟ نہیں' بلکہ کیا آپ عہد نبوت کا ایک واقعہ بھی پیش فرماسکتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری قوم کے ایک ایک فرد سے رائے طلب فرمائی ہو؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

طرف ایک غلط بات منسوب کرتے ہوئے آپ کو کچھ تو خدا کا خوف ہونا چاہئے۔ کیا آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نہیں سنا :

من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعده من النار۔

(مشکوٰۃ۔ ص ۳۲)

ترجمہ :"جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ فرمانے کی نوعیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض اہم امور میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشورہ بھی فرماتے تھے لیکن یہ مشورہ "تعبیر شریعت" میں نہیں ہوتا تھا' نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں "تعبیر شریعت" کا اختیار "پوری قوم" کو تھا' جیسا کہ گورایہ صاحب اپنے اجتہاد کے زور سے ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں' یہ مشورہ کبھی تو بعض ایسے انتظامی امور میں ہوتا تھا' جن میں صلاح و مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی' اور کبھی ایسے اجتہادی امور میں ہوتا تھا' جن میں وحی کے ذریعہ کوئی خاص صورت معین نہیں کردی جاتی تھی' یہ مباحات کا دائرہ ہے کہ جس کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ حکومت اس دائرے میں قانون سازی کرسکتی ہے' اور اس کے لئے اہل الرائے سے صلاح و مشورہ بھی کرسکتی ہے' لیکن ایسے امور میں مشورہ کرنے کا "تعبیر شریعت" سے کوئی تعلق نہیں' جس کے اختیارات گورایہ صاحب قومی اسمبلی کو تفویض فرمارہے ہیں۔

پھر اہل فہم جانتے ہیں کہ مشورہ اہل مشورہ سے لیا جاتا ہے' قوم کا ایک ایک فرد ایک ایک معاملے میں مشورہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا "لکل فن رجال" تمام دنیا کا مسلمہ اصول ہے' اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی "پوری قوم" سے مشورہ نہیں فرماتے تھے اور نہ قوم کو شریک مشورہ کرنے کے لئے اسے انتخابات کی بھٹی میں جھونکا جاتا تھا' بلکہ جو حضرات' جن امور میں بصیرت رکھتے تھے ان ہی سے مشورہ فرمایا جاتا تھا' ان میں حضرات شیخین ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گویا مستقل وزیر و مشیر تھے' اور اہل مشورہ میں سرفہرست انہی کے اسمائے گرامی تھے' چنانچہ مستدرک حاکم میں بسند حضرت ابن عباس "ترجمان القرآن" سے مروی ہے کہ آیت کریمہ "وشاورھم فی الامر" (آل عمران۔ ۱۵۹) کی تفسیر میں فرمایا :

قال ابو بکر وعمر رضی اللہ عنھما۔

(ابن کثیر ص ۴۲۰ ج ۱)

ترجمہ :"اس سے مراد ابو بکر و عمر ہیں' رضی اللہ عنہما"۔

اور مسند احمد کی روایت میں ہے :

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لابی بکر وعمر لو اجتمعتما فی مشورۃ ما خالفتکما۔

(ایضا حوالہ بالا)

ترجمہ :" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا اگر تم دونوں کسی مشورہ میں جمع ہو جاؤ تو میں تمہاری رائے کے خلاف نہیں کروں گا"۔

اسی طرح دیگر اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی بعض اہم امور میں مشورہ فرمانا ثابت ہے، بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے مبارک کے خلاف بھی صحابہؓ کے مشورہ کو قبول فرمایا۔ مثلاً جنگ احد میں آنحضرت ﷺ کی رائے مبارک یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نکل کر نہ لڑا جائے اور بعض صحابہؓ کی رائے تھی کہ ہمیں باہر نکلنا چاہئے، آپؐ نے اسی رائے کی موافقت فرمائی اس نوعیت کے بہت سے واقعات ہیں۔

اس میں علما کے دو قول ہیں کہ کیا مشورہ کرنا آپؐ پر لازم تھا یا نہیں؟ بہرحال لازم نہ ہو تب بھی آنحضرت ﷺ مشورے کا اہتمام ہمیشہ فرماتے تھے اور مشورہ کے بعد جو رائے اولیٰ وانسب ہوتی اسے اختیار فرمالیتے اور چونکہ آپؐ پر وحی الٰہی کا پہرہ تھا اس لئے اگر اختیار کردہ رائے لائق اصلاح ہوتی تو وحی الٰہی سے فوراً اس کی اصلاح کردی جاتی۔ آیت کریمہ "وشاورھم فی الامر" کا جناب گورایہ کے ہولناک دعوے سے کوئی تعلق نہیں ہے، قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ایسے لغو دعوے کرنا نہایت افسوس ناک ہے۔

وامرھم شوریٰ بینھم :

اسی طرح آیت کریمہ " : وامرھم شوریٰ بینھم" (الشوریٰ) کے حوالے سے یہ ثابت کرنا کہ خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں بھی "تعبیر شریعت کا اختیار پوری قوم کا حق تھا" بالکل مہمل بات ہے، اس آیت کریمہ کا تعلق بھی اہم انتظامی امور سے ہے، جن میں سرفہرست خلیفہ کا انتخاب ہے کہ اس میں اہل مشورہ اور اہل حل وعقد سے مشورہ ضروری ہے۔

جہاں تک "تعبیر شریعت" کا تعلق ہے، اس میں حضرات خلفائے راشدینؓ کا

یہ دستور العمل تھا کہ سب سے پہلے کسی مسئلہ کا حکم کتاب وسنت سے تلاش کیا جاتا اور جب کوئی ایسا واقعہ پیش آتا جس کا حکم کتاب وسنت میں صراحۃ موجود نہ ہوتا تو فقہائے صحابہؓ کو جمع کر کے انہیں غور و فکر کی دعوت دی جاتی اور ان کے اجتماعی اجتہاد پر عمل کیا جاتا۔

حافظ ابن قیمؒ امام ابو عبید کی کتاب "القضا" کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ :

وقال ابو عبید فی کتاب القضا : ثنا کثیر بن ھشام عن جعفر بن برقان عن میمون بن مھران قال : کان ابوبکر الصدیق اذا ورد علیه حکم نظر فی کتاب اللہ تعالٰی فان وجد فیه ما یقضی به قضی به' وان لم یجد فی کتاب اللہ نظر فی سنة رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فان وجد فیھا ما یقضی به قضی به' فان اعیاہ ذلک سال الناس : ھل علمتم ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قضی فیه بقضاء؟ فربما قام الیه القوم فیقولون : قضی فیه بکذا وکذا ' فان لم یجد سنة سنھا النبی صلی اللہ علیه وسلم جمع روساء الناس فاستشارھم' فاذا اجتمع رایھم علی شیء قضی به' وکان عمر یفعل ذلک' فاذا اعیاہ ان یجد ذلک فی الکتاب والسنة سال : ھل کان ابو بکر قضی فیه بقضاء؟ فان کان لابی بکر قضاء--- قضی

بہٗ والا جمع علماء الناس واستشارھمٗ فاذا اجتمع رایھم علی شیء قضی بہ۔

(اعلام الموقعین ص ۶۲ ج ۱)

ترجمہ :۔ "حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دستور یہ تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی قضیہ آتا اللہ تعالیٰ کی کتاب میں غور فرماتے' اگر کتاب اللہ میں اس کا حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے اور اگر کتاب اللہ میں نہ ملتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں غور فرماتے' پس اگر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کا حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرماتے اور اگر اس بارے میں انہیں کسی سنت کا علم نہ ہوتا تو باہر نکل کر لوگوں سے دریافت فرماتے کہ کیا آپ حضرات کو اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فیصلہ کا علم ہے؟ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کچھ حضرات اٹھ کر بتاتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں یہ فیصلہ فرمایا تھا' پھر اگر کوئی سنت نہ ملتی تو "رؤسا الناس" کو جمع کرکے ان سے مشورہ فرماتے' پس جب ان کی رائے کسی فیصلہ پر متفق ہوجاتی تو اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دستور بھی یہی تھا (کہ پہلے کتاب اللہ میں حکم تلاش کرتے' پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں) پس اگر کتاب و سنت میں اس کا حکم نہ ملتا تو لوگوں سے دریافت فرماتے کہ کیا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں کوئی فیصلہ فرمایا تھا؟ پس اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی فیصلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے'

ورنہ لوگوں کے علما کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جب ان کی رائے کسی فیصلہ پر متفق ہو جاتی تو اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے"۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرات خلفائے راشدینؓ کے دور میں "پوری قوم" کو "تعبیر شریعت" کا اختیار دینے کا دور دور بھی کہیں سراغ نظر نہیں آتا، اور نہ قوم کے منتخب نمائندوں کو قانون سازی کے اختیار کا کوئی سراغ ملتا ہے، اس دور میں امر منصوص میں کسی اجتہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور غیر منصوص مسائل میں غور و فکر کرنے کے لئے رؤسا الناس کو جمع کیا جاتا تھا، جب کہ جناب گورایہ صاحب کی شریعت میں "علما الناس" کو اجتہاد کا اور دینی مسائل میں غور و فکر کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں، نہ وہ اجتہاد کے اہل ہیں :

ع بہ بین تفاوت راہ از کجا است تا بکجا

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت میں بھی "صاحب فتویٰ" معدودے چند حضرات ہی تھے، تمام صحابہؓ دینی مسائل میں انہی سے رجوع فرماتے تھے اور پیش آمدہ دینی مسائل میں انہی کی رائے طلب کی جاتی تھی، حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں :

والذین حفظت عنهم الفتوٰی من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم مائة ونیف وثلاثون نفسا، ما بین رجل وامراة وكان المكثرون منهم سبعة : عمر بن الخطاب، وعلی بن ابی طالب، وعبد الله بن مسعود، وعائشة ام المومنین وزید بن ثابت، وعبد الله بن عباس وعبد الله بن عمر۔

قال ابو محمد بن حزم : ویمکن ان یجمع من فتوٰی کل واحد منہم سفر ضخم۔

قال ابو محمد : والمتوسطون منہم فیما روی عنہم من الفتیا : ابو بکر الصدیق وام سلمۃ، وانس بن مالک، وابو سعید الخدری، ابو ہریرۃ، وعثمان بن عفان، وعبد اللہ بن عمرو بن العاص، وعبد اللہ بن الزبیر، وابو موسی الاشعری، وسعد ابن ابی وقاص، وسلمان الفارسی، وجابر بن عبد اللہ، ومعاذ بن جبل، فھولاء ثلثۃ عشر یمکن ان یجمع من فتیا کل واحد منہم جزء صغیر جدا، ویضاف الیہم : طلحۃ والزبیر، وعبد الرحمن بن عوف، وعمران بن حصین، ابو بکرۃ، وعبادۃ بن الصامت، ومعاویۃ بن ابی سفیان۔

والباقون منہم مقلون فی الفتیا، لا یروی عن الواحد منہم الا المسالۃ والمسالتان والزیادۃ الیسیرۃ علی ذلک، یمکن ان یجمع من فتیا جمیعہم جزء صغیر فقط بعد التقصی والبحث وہم ---الخ (اعلام الموقعین ص ۱۲ ج ۱)

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے جن حضرات کے فتاوٰی محفوظ ہیں ان کی کل تعداد مرد و عورت ملا کر ایک

سو تیس سے زیادہ ہے' ان میں سے مندرجہ ذیل حضرات بہ کثرت فتوے دیتے تھے :

عمر بن خطاب' علی بن ابی طالب' عبد اللہ بن مسعود' ام المومنین عائشہ صدیقہ' زید بن ثابت' عبد اللہ بن عباس' عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم۔ حافظ ابن حزم کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے فتاویٰ سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

اور مندرجہ ذیل حضرات فتویٰ میں متوسط تھے :

ابو بکر صدیق' ام سلمہ' انس بن مالک' ابو سعید خدری' ابو ہریرہ' عثمان بن عفان' عبد اللہ بن عمرو بن العاص' عبد اللہ بن زبیر' ابو موسیٰ اشعری' سعد بن ابی وقاص' سلمان فارسی' جابر بن عبد اللہ' معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم۔ یہ تیرہ حضرات تھے جن سے ہر ایک کے فتاویٰ سے ایک چھوٹا سا رسالہ مرتب ہو سکتا ہے' ان حضرات کی فہرست میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے مبارکہ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے :

طلحہ' زبیر' عبد الرحمن بن عوف' عمران بن حصین' ابو بکرہ' عبادہ بن صامت' معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم۔

اور باقی حضرات بہت کم فتویٰ دیتے تھے' ان حضرات میں سے صرف ایک دو مسئلے یا اس سے کچھ ہی زیادہ منقول ہیں اور تتبع تلاش کے بعد ان تمام حضرات کے فتاویٰ ایک چھوٹی کتاب میں جمع کئے جا سکتے ہیں اور ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں (آگے ان کے ناموں کی فہرست درج کی ہے)"۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ مقدس جماعت جن کے فضائل ومناقب قرآن وحدیث میں مذکور ہیں اور جن کی شان فقیہہ الامت حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی نظر میں یہ تھی :

اولئک اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کانوا فضل ھذہ الامۃ ابرھا قلوبا واعمقھا علما، واقلھا تکلفا اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ ولاقامۃ دینہ فاعرفوا لھم فضلھم واتبعوھم علی اثرھم وتمسکوا بما استطعتم من اخلاقھم وسیرھم، فانھم کانوا علی الھدی المستقیم۔

(رواہ رزین، مشکوۃ ص ۳۲)

ترجمہ :"یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تھے جو اس پوری امت سے افضل تھے، ان کے دل سب سے پاک اور ان کا علم سب سے گہرا تھا، وہ تکلف میں سب سے کم تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لئے اور اپنے دین کی اقامت کے لئے چن لیا تھا پس ان کی فضیلت کو پہچانو، ان کے نقش قدم کی پیروی کرو اور جہاں تک ممکن ہو ان کے اخلاق وسیرت کو مضبوط تھام لو، کیونکہ وہ ہدایت کے سیدھے راستے پر تھے"۔

یہ مقدس جماعت جو سراپا خیر اور مجسم ہدایت تھی ان میں بھی مجتہد معدودے چند حضرات ہی تھے، دینی مسائل میں انہی سے رجوع کیا جاتا تھا اور باقی تمام حضرات انہی کے فتاویٰ پر عمل فرماتے تھے، کسی کو کبھی وسوسہ بھی نہ آیا ہوگا کہ تعبیر شریعت چند افراد کا حق نہیں بلکہ یہ پوری قوم کا حق ہے، لیکن حیف! صد حیف!! کہ آج

پندرہویں صدی کے بگڑے ہوئے ماحول میں جو سراپا شر و ضلالت کا ماحول ہے' جناب گورایہ صاحب یہ "درس اجتہاد" دے رہے ہیں کہ اہل علم کے فتووں کی ضرورت نہیں' بلکہ تعبیر شریعت پوری قوم کا حق ہے' اور ستم بالائے ستم یہ کہ سخن سازی کے زور سے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہی سنت خلفائے راشدینؓ ہے۔ "فیا لغربة الاسلام ولضیعة المسلمین۔

کیا امت پارلیمنٹ کا نام ہے؟

ڈاکٹر گورایہ صاحب لکھتے ہیں :

"قوم کو اللہ تعالیٰ نے تعبیر شریعت کا جو اختیار دیا ہے وہ اسے آزادانہ رائے سے ہی استعمال کرسکتی ہے جس کی عملی صورت یہ ہے کہ وہ آزادانہ' منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخاب میں اپنے نمائندے منتخب کرے جو ان کی نمائندگی میں تعبیر نو کا فریضہ انجام دیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "ان اللہ لا یجمع امتی علی الضلالہ" اللہ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا"۔ (ترمذی' فتن' لزوم الجماعہ) تعبیر شریعت میں ایک فرد یا طبقہ گمراہی اختیار کرسکتا ہے' مگر پوری قوم گمراہ نہیں ہوسکتی"۔

گورایہ صاحب کا یہ ارشاد تو بالکل غلط بلکہ خالص جھوٹ ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے تعبیر شریعت کا اختیار پوری قوم کو دیا ہے" جیسا کہ اوپر تفصیل سے عرض کیا جاچکا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں موصوف نے ایک نیا نکتہ ارشاد فرمایا ہے جو ان کے فہم

رسا کی منہ بولتی تصویر ہے وہ نکتہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کہ "اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا" اس میں امت سے مراد پارلیمنٹ ہے۔

موصوف کا استدلال یہ ہے کہ ابو حنیفہؒ شافعیؒ مالکؒ اور ابن حنبلؒ کے فقہی مسائل تو ان کی ذاتی وانفرادی رائے ہیں اور فرد گمراہ بھی ہو سکتا ہے' پس چونکہ ان انفرادی آرا میں گمراہی کا احتمال ہے تو وہ لائق اعتبار نہ ہوئیں۔

چنانچہ گورایہ صاحب لکھتے ہیں :

" فقہی مذاہب اپنی جامعیت کے باوجود' بہرحال انفرادی تعبیرات ہیں اور حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔"

ادھر علمائے امت جو کچھ فرماتے ہیں وہ ایک طبقہ کی رائے ہے اور طبقہ گمراہ بھی ہو سکتا ہے لہٰذا علما بھی تعبیر شریعت کے اہل نہ ہوئے' کیونکہ اندیشہ گمراہی کی بنا پر وہ قابل اعتبار نہیں۔ چنانچہ گورایہ صاحب لکھتے ہیں :

"فقہی مسلکوں کے افراد تعبیر شریعت کے اہل نہیں"۔

ہاں! پارلیمنٹ چونکہ پوری قوم کا نمائندہ ادارہ ہے لہٰذا وہ اس حدیث نبوی کا مصداق ہے کہ "اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا"۔ یہ پارلیمنٹ کے افراد پر مشتمل امت چونکہ گمراہی سے قطعی محفوظ ہے لہٰذا شریعت کی تعبیر نو اسی کا حق ہے' یہ معصوم عن الخطا ادارہ جو اجتہاد بھی کرلے' جو فیصلہ صادر کرے' جو قانون بھی نافذ کرے' اور شریعت کی جیسی بھی "تعبیر نو" کرے وہ عین حق وصواب ہے' سراپا ہدایت ہے' اس میں نہ گمراہی کا احتمال ہے اور نہ غلطی کا شائبہ۔

گورایہ صاحب کے اس استدلال پر ہمیں داناؤں کا قول یاد آیا وہ فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے تصورات کا حدود اربعہ اس کی ذہنی سطح کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ چیونٹی

کے انڈے میں جو ننھا سا بچہ محبوس ہے وہ مسکین اپنی ذہنی سطح کے مطابق انڈے کے خول ہی کو زمین و آسمان سمجھتا ہے اگر اسے عقل و شعور ہو اور وہاں اسے بتایا جائے کہ یہ خول تو بہت ہی تنگ و تاریک جگہ ہے۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو تو معلوم ہو کہ تمہارے ہزاروں آسمان و زمین تو ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں سما سکتے ہیں تو وہ اس کو کبھی تسلیم نہیں کرے گا کیونکہ اس کے ذہن میں انڈے کے خول سے ماورا کسی زمین و آسمان کا تصور نہیں۔ ٹھیک یہی مثال گورایہ صاحب کے استدلال کی ہے' ان کے خیال میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری امت بس قومی اسمبلی کے ارکان میں متشکل ہو گئی ہے' اس کے ماورا ان کے ذہن میں کسی امت کا تصور نہیں' نہ پاکستان میں ارکان قومی اسمبلی کے علاوہ امت کے کسی فرد کا وجود ہے' نہ پاکستان سے باہر امت کا کوئی حصہ آباد ہے' اور نہ قیام پاکستان سے پہلے کبھی دنیا میں امت مسلمہ کا وجود تھا' پس کل کی کل امت ممبران قومی اسمبلی ہیں' چونکہ پوری کی پوری امت گمراہ نہیں ہو سکتی' لہٰذا معلوم ہوا کہ پاکستان کی قومی اسمبلی معصوم عن الخطا ہے۔ اگر انڈے سے بند چیونٹی کے بچے کا وہ نظریہ صحیح ہے کہ انڈے کے خول کے ماورا زمین و آسمان کا کوئی وجود نہیں تو کوئی شبہ نہیں کہ گورایہ صاحب کا یہ استدلال بھی صحیح ہے کہ پاکستان کی پارلیمنٹ ہی امت ہے اور امت کبھی گمراہ نہیں ہو سکتی' لہٰذا پاکستانی پارلیمنٹ معصوم عن الخطا ہے۔ قارئین کو گورایہ صاحب کے نظریات پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے' کیونکہ دنیا خود ایک عجائب خانہ ہے اور گورایہ صاحب کے یہ افکار و نظریات اس عجائب خانہ دنیا میں گرانقدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی ہے

جناب گورایہ صاحب نے جس حدیث کے حوالے سے پاکستان پارلیمنٹ کو

تقدس و عصمت کا منصب عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حدیث شریف کا پورا متن یہ ہے :

ان اللہ لا یجمع امتی' او قال امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم علی الضلالۃ وید اللہ علی الجماعۃ ومن شذ شذ فی النار۔

(مشکوۃ۔ ص ۳۰)

ترجمہ :"بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کو (یا یہ فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو) گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ "الجماعت" پر ہے اور جو شخص علیحدہ ہو گا اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ میں ٹھونس دے گا"۔

قال المظہر : فی الحدیث دلیل حقیۃ اجماع الامۃ اے لا یجتمعون علی معصیۃ او خطاء غیر الکفر' بدلیل لا تقوم الساعۃ الا علی الکفار' لکن لم یبق الامۃ امۃ والمراد اجماع العلماء منہم ولا عبرۃ باجماع العوام' وفی اضافۃ الامۃ الی اسمہ الشریف اشارۃ الی ان ہذہ الامۃ ہی التی امتازت بہذہ الفضیلۃ۔

(حاشیہ مشکوۃ)

ترجمہ :"مظہر کہتے ہیں کہ اس حدیث میں اجماع امت کے برحق ہونے کی دلیل ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے کسی معصیت یا خطا پر اجماع نہیں کر سکتے' ہاں سبھی کافر ہو جائیں تو دوسری بات ہے' اس

صورت میں امت امت ہی نہ رہے گی' چنانچہ قرب قیامت میں سب کافر ہوجائیں گے اور کافروں ہی پر قیامت قائم ہوگی' اور "اجماع امت" سے مراد امت کے اہل علم کا اجماع ہے' عوام کے اجماع کا کوئی اعتبار نہیں' اور امت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کی طرف منسوب کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہی وہ امت ہے جو اس فضیلت کے ساتھ ممتاز ہے"۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اجماع امت (جس کا اولین مصداق اجماع صحابہؓ ہے) حجت قطعیہ ہے اور یہ کہ وہ اجماعی مسائل جو صحابہ کرامؓ کے دور سے آج تک متفق علیہ چلے آتے ہیں اور جن پر مشرق و مغرب کے علما متفق ہیں ان سے انحراف کسی کے لئے ممکن نہیں' لیکن جناب گورایہ صاحب پارلیمنٹ کی شریعت کی تعبیر نو کا مشورہ دے کر ان کو' حدیث نبوی کے علی الرغم "شذوذ فی النار" (دوزخ میں گھسنے) کی دعوت دے رہے ہیں۔

گورایہ صاحب کے مجتہدین کا انتخاب

گورایہ صاحب یہ تو طے فرماچکے کہ شریعت کی "تعبیر نو" کا اختیار پارلیمنٹ کے ارکان کو حاصل ہے' اب صرف یہ مرحلہ باقی رہا کہ پارلیمنٹ کے لئے کن صفات کے نمائندے چنے جائیں؟ جو اجتہاد' کا کارنامہ انجام دیں اور شریعت کی نئی نئی تعبیریں کرکے دین و شریعت کا حلیہ بگاڑیں؟ اس کی تشریح کرتے ہوئے گورایہ صاحب لکھتے ہیں :

"تعبیر شریعت کی صلاحیت رکھنے والا' اچھی شہرت کا مالک' ہر بالغ مسلمان مرد وزن قانون ساز ادارے کی رکنیت کا اہل ہے' یہ

صلاحیت قرآن وسنت کی تعلیمات، جدید علوم و تجربات اور درپیش قومی اور بین الاقوامی مسائل وحالات کی مہارت پر مشتمل ہے"۔

یہ تو اجتہاد کی مثبت شرائط ہوئیں اور منفی شرائط یہ کہ :

"البتہ مالی ذرائع یا مذہبی حیثیت یا نسبی عصبیت یا علاقائی تعصب کا استحصال کرنے والا اس کی رکنیت کا اہل نہیں، کیونکہ مال یا مذہب یا علاقے کا استحصال قرآنی شرائط اخلاص اور تقویٰ کے منافی ہیں"۔

ان شرائط میں پہلی شرط یہ ذکر کی گئی ہے کہ وہ "تعبیر شریعت" کی صلاحیت رکھنے والا ہو، لیکن یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ "تعبیر شریعت" کی صلاحیت کا معیار کیا ہے؟ وہ کون سی صفات ہیں جن کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جاسکے کہ یہ صاحب تعبیر شریعت کی صلاحیت سے آراستہ ہیں؟ میں پہلے بھی شکایت کرچکا ہوں کہ گورایہ صاحب "اجتہاد" پر مقالہ لکھنے بیٹھے ہیں مگر نہ تو یہ بتاتے ہیں کہ اجتہاد کا مفہوم کیا ہے؟ اس کی غرض وغایت کیا ہے؟ اس کا موقع و محل کونسا ہے؟ اس کے لئے کیا قیود وشرائط ہیں؟ اور نہ یہی بتاتے ہیں کہ مجتہد میں کن اوصاف ولوازم کا پایا جانا ضروری ہے؟ یہاں بھی جب وہ اسمبلی کے لئے مجتہدین کے شرائط انتخاب پر گفتگو کرتے ہیں، یہ نہیں بتاتے کہ تعبیر شریعت کی صلاحیت اور قرآن وسنت کی تعلیمات میں مہارت سے ان کی کیا مراد ہے؟ صدر مملکت جنرل محمد ضیا الحق صاحب نے کئی سال پہلے ایک "اجتہاد کانفرنس" بلائی تھی، جس میں بہت سے حضرات نے اجتہاد کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا تھا۔ جناب مولانا مفتی محمود رحمتہ اللہ علیہ کو بھی دعوت تھی، مفتی صاحب مرحوم اجتہاد پر کوئی مقالہ لکھ کر نہیں لائے تھے، برجستہ تقریر فرمائی تھی، مفتی صاحب نے فرمایا، اصول فقہ میں اجتہاد کی بہت سی شرطیں لکھیں ہیں، میں ان شرائط

کی تفصیل یہاں ذکر نہیں کرنا چاہتا مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ کم سے کم "ان حضرات" کو ناظرہ قرآن تو پڑھائیے' مفتی صاحب کے سامنے پہلی صف جج صاحبان کی تھی' مفتی صاحب نے ہاتھ سے پوری صف کی طرف اشارہ کرکے فرمایا تھا کہ "ان حضرات" کو ناظرہ قرآن تو پڑھائیے۔ مفتی صاحب کا یہ ایک فقرہ پورے مقالہ پر بھاری تھا' اس کو سن کر جج صاحبان پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ گفتنی نہیں' دیدنی تھی۔

مفتی صاحب مرحوم کے اس ارشاد کی روشنی میں' میں گورایہ صاحب سے عرض کروں گا کہ وہ جن حضرات کو مسند اجتہاد پر بٹھارہے ہیں ان میں کتنے ہیں جو ناظرہ قرآن کریم صحیح پڑھ سکتے ہیں؟ کتنے ایسے ہیں جو قرآن کریم کے ایک رکوع کا ترجمہ' تراجم کی مدد کے بغیر کرسکتے ہیں؟ پھر کتنے ایسے ہیں جو قرآن کریم کی ایک آیت کا بھی صحیح مفہوم ادا کرسکتے ہیں؟ خود گورایہ صاحب سے بڑا مجتہد اس زمانے میں کون ہوگا؟ لیکن ان کی قرآن فہمی اور حدیث میں مہارت کے نمونے اس زیر بحث مقالہ میں قارئین کے سامنے آچکے ہیں۔ اس پر بھی اگر انہیں اپنی سطح کے لوگوں کے بارے میں حسن ظن ہے تو "فاصنع ما شئت" کے سوا کیا عرض کیا جاسکتا ہے۔

دراصل جس اجتہاد اور "شریعت کی تعبیر نو" کی گورایہ صاحب دعوت دے رہے ہیں اس کی صلاحیت کے لئے علم و فہم کی شاید کوئی شرط نہیں' ایل ایل بی کی ڈگری لے کر آدمی عدالتوں میں اجتہاد کے جوہر دکھاسکتا ہے' کسی مغربی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرکے کسی یونیورسٹی میں "معلم ملکوت" بن سکتا ہے اور گورایہ صاحب کی طرح قوم کو اجتہادی تحائف پیش کرسکتا ہے۔ ایم اے اسلامیات بلکہ مولوی فاضل کا کورس کرکے "مجتہد مطلق" بن سکتا ہے' قرآن وحدیث کا صحیح تلفظ و ترجمہ آتا ہو یا نہ آتا ہو' بہرحال مجتہد ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے دوسری شرط اجتہاد یہ ذکر فرمائی ہے کہ مجتہد صاحب' اچھی

شہرت کے مالک ہوں' لیکن اچھی شہرت سے کیا مراد ہے؟ اسکی بھی وضاحت نہیں فرمائی آج کل بہت سے ایسے لوگ بھی نیک نام اور اچھی شہرت کے مالک سمجھے جاتے ہیں جو نہ تو نماز روزے کے قائل ہیں' نہ ان کی صورت و سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مطابقت رکھتی ہے' نہ ایمان واسلام کا ان کے دل ودماغ پر کوئی اثر نمایاں ہے بلکہ وہ درج ذیل حدیث نبویؐ کے مصداق ہیں:

ویقال للرجل ما اعقلہ وما اظرفہ وما اجلدہ وما فی قلبہ مثقال حبۃ خردل من ایمان۔

(متفق علیہ۔ مشکوٰۃ ص۴۶۱)

ترجمہ: "آدمی کی عقل کی' ظرافت کی' بہادری کی تعریف نہایت تعجب سے کی جائے گی حالانکہ رائی کے دانے کے برابر بھی اس کے دل میں ایمان نہیں ہوگا"۔

گویا گورایہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کے لئے نماز روزے کی بھی شرط نہیں' دینی شعائر کے التزام کی بھی کوئی قید نہیں' بلکہ ایمان صحیح کی بھی ضرورت نہیں' بس اتنا کافی ہے کہ معاشرے میں اس کی اچھی شہرت ہو۔

گورایہ صاحب نے جو دوسری شرائط ذکر کی ہیں ان کو بھی اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے' البتہ دو سوال مزید رہ جاتے ہیں ایک یہ کہ گورایہ صاحب کے نزدیک مذہبی راہنما اور علمائے کرام' "مجتہد اسمبلی" کی رکنیت کے اہل نہیں' گویا عالم دین ہونا گورایہ صاحب کے نزدیک ایک ایسا عیب یا جرم ہے' جس کی وجہ سے آدمی اسمبلی کی رکنیت اور مسند اجتہاد آراستہ کرنے کے قابل نہیں رہتا' آخر یہ کیوں؟

گورایہ صاحب اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ حضرات مذہبی استحصال کرتے ہیں اور یہ چیز اخلاص و تقویٰ کے منافی ہے' اس لئے ایسے غیر مخلص اور غیر متقی افراد

ان کی ''مجتہد اسمبلی'' میں جانے کے لائق کب ہو سکتے ہیں؟

لیکن یہاں بھی گورایہ صاحب یہ وضاحت کرنا بھول گئے کہ ''مذہبی استحصال'' سے ان کی کیا مراد ہے؟ یہ استحصال کا لفظ کمیونسٹ لغت میں بڑی کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور وہ اسی لفظ کے ذریعہ عوام کو اہل علم سے متنفر کیا کرتے ہیں، جناب گورایہ صاحب نے علما کو بدنام کرنے کے لئے اسی اصطلاح کا سہارا لینا ضروری سمجھا ہے۔

''مذہبی استحصال'' جس سے گورایہ صاحب ڈرا رہے ہیں یہ ہے کہ علمائے امت، مسلمانوں کو دین ومذہب کی تلقین کرتے رہتے ہیں اور ہمارے نئے مجتہدین جن تحریفات کو قرآن وحدیث اور اسلامی قانون میں ٹھونسنا چاہتے ہیں علمائے کرام کسی قیمت پر ان کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے اور وہ اسلامی برادری کو بھی ان تحریفات سے آگاہ کرکے مجتہدین زمانہ کا ناطقہ بند کردیتے ہیں اور ہمارے ان نئے مجتہدین کو من مانیوں کا موقع نہیں دیتے۔ یہ گورایہ صاحب کے نزدیک ''مذہبی استحصال'' ہے جس کے علما مجرم ہیں اور اس لئے وہ اسمبلی کی رکنیت کے اہل نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ گورایہ صاحب فرماتے ہیں مجتہد اسمبلی کے لئے انتخابات آزادانہ ومنصفانہ ہوں، ان میں مالی ذرائع نسبی تعصب اور علاقائی عصبیت کا شائبہ نہ ہو، لیکن پاکستان کی تاریخ میں ایسا انتخاب تو کبھی ہوا نہیں اور نہ معروضی حالات میں اس کی کوئی توقع نظر آتی ہے، لہٰذا ایسی اسمبلی جو مالی ذرائع، نسبی تعصب اور علاقائی عصبیت کے زور سے منتخب ہونے والے افراد پر مشتمل ہو (جیسا کہ عموماً یہی ہوتا ہے) وہ تو گورایہ صاحب کے معیار پر بھی ''پوری قوم'' کی نمائندہ نہیں ہو سکتی، پس جو اسمبلی نہ تو قوم کی صحیح نمائندگی کرتی ہو اور نہ وہ شریعت کے ماہرین پر مشتمل ہو اسکو گورایہ صاحب شریعت کی تعبیر نو کی اجازت کس منطق سے دیتے ہیں؟

اجتہاد جاری ہے:

گورایہ صاحب نے اس نکتہ پر بڑی طویل، مگر قطعاً غیر ضروری اور غیر متعلق بحث کی ہے کہ علما نے اجتہاد کا دروازہ بند کر رکھا ہے، مجھے گورایہ صاحب سے اس غیر ضروری بحث میں الجھ کر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں، میں ان سے عرض کروں گا کہ اجتہاد بند نہیں، جاری ہے، مگر ازراہ کرم اجتہاد کا پیمانہ متعین کر لیجئے اور پھر اس پیمانے سے خود اپنے اور اپنے خود ساختہ مجتہدین کے قد و قامت کی پیمائش کر دیکھئے، خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ کون اس پیمانے پر پورا اترتا ہے اور کون نہیں؟ اور اگر اجتہاد کے معنی شریعت کو بگاڑنے کے ہیں تو میں بھی گواہی دینے کے لئے حاضر ہوں کہ آپ حضرات اس کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

کیا اسمبلی صحابہؓ کے فیصلوں کو بدل سکتی ہے؟

پہلے گزر چکا ہے کہ مجتہد کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ وہ صحابہ کرام کے فیصلوں سے واقف ہو، تاکہ اجماع امت سے خروج نہ کرے، اور جس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کے دو قول ہوں وہاں تیسرا قول ایجاد نہ کرے، تمام ائمہ مجتہدین اس اصول کے شدت سے پابند تھے، لیکن گورایہ صاحب اسمبلی کو مجتہد مطلق کی حیثیت نہیں، بلکہ مطلق العنان یا شتر بے مہار قسم کے مجتہد کی حیثیت دینا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا اسمبلی صحابہ کے فیصلے کی پابند ہے؟ اور اس کا جواب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اسمبلی صحابہؓ کے کسی قانونی فیصلے کی پابند نہیں، وہ مطلق العنان ہے جو چاہے فیصلے کرے۔

میں قبل ازیں عرض کر چکا ہوں کہ صحابہ کرام کے اجماعی فیصلوں سے انحراف کرنے والا "سبیل المومنین" اہل ایمان کے راستہ سے برگشتہ ہے، جس کو قرآن کریم نے "ونصلہ جہنم" (اور ہم اس کو جہنم میں جھونک دیں گے) کی وعید سنائی

ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو ضلالت و گمراہی قرار دے کر ایسے شخص کو "شذ فی النار" (واصل بہ جہنم) فرمایا ہے ہم تو اس نظریے سے ہر مومن کے حق میں اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، گورایہ صاحب اگر نشہ اجتہاد میں یہی راستہ پسند فرماتے ہیں تو ان کو اختیار ہے جو حضرات ان کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔

ائمہ مجتہدین اور ان کا فقہی سرمایہ

جناب گورایہ صاحب نے ائمہ مجتہدین اور ان کے فقہی سرمائے سے بطور خاص بغض و نفرت کا اظہار اور ان کے خلاف استخفاف کا مظاہرہ کیا ہے وہ کبھی ان کو "دور ملوکیت کی پیداوار" کہتے ہیں کبھی "فرسودہ" اور "بے جان" فرماتے ہیں۔

کبھی فرماتے ہیں :

> "کسی قوم کے فرسودہ افکار اس کے احیا و تجدید کا ذریعہ نہیں بن سکتے"۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے :

> " گزشتہ اجتہادات اب مفید نہیں رہے، جدید افکار اور تجربات کی روشنی میں آزادی اجتہاد کو بروئے کار لاکر قانون شریعت کی از سر نو تشکیل کرنی چاہیے"۔

کبھی فرماتے ہیں :

> "اب کوئی چارہ کار ہے تو یہ کہ ہم اس چھلکے کو اتار پھینکیں جو سختی کے ساتھ اسلام پر جم گیا ہے اور جس نے متحرک نظریات کو بالکل جامد بنا کر رکھ دیا ہے"۔

بھی فرماتے ہیں :

"جو چیز فرسودہ ہو کر بے جان ہو چکی ہو' موجودہ اسمبلیاں اس کی پابند نہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ جھوٹی عقیدت کا اظہار اور مصنوعی ذرائع سے اس کا احیا زوال پذیر قوم کا علاج ہے"۔

جناب گورایہ صاحب "اجماع صحابہؓ" اور ان کے متفقہ فیصلوں کو بھی اپنے زور اجتہاد سے ٹھکرا دینے کا اعلان کریں تو ظاہر ہے کہ ائمہ اربعہ ان کی نظر میں کیا چیز ہیں؟ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کل قرآن و حدیث کو بھی فرسودہ قرار دے کر ان سے دستکش ہونے کا اعلان نہ فرمادیں' کیونکہ فقہا کے ارشادات تو قرآن و سنت پر ہی مبنی ہیں اور قرآن و حدیث ائمہ فقہا کے ارشادات سے پہلے کی چیز ہے' اب اگر ائمہ اربعہ کا فقہی سرمایہ فرسودہ اور بے جان ہو چکا ہے تو (معاذ اللہ) کتاب و سنت کے فیصلے گورایہ صاحب کے فتویٰ فرسودہ کے بدرجہ اولیٰ مستحق ہیں' اور مجھے معلوم ہے کہ آج اونچے سیاسی حلقوں میں یہی نظریہ گشت کر رہا ہے اور گورایہ صاحب بھی اگرچہ صاف صاف خروج از اسلام کا مشورہ لوگوں کو نہیں دیتے مگر جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہی ہے۔

امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں :

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اتبعوا السواد الاعظم' ولما اندرست المذهب الحقة الا هذه الاربعة' كان اتباعها اتباعا للسواد الاعظم والخروج عنها خروجا عن السواد الاعظم۔

(عقد الجید مع الانصاف ص ۳۷ مطبوعہ ترکیہ)

ترجمہ :"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "سواد اعظم کی پیروی کرو' چونکہ ائمہ اربعہ کے فقہی مذاہب کے سوا باقی تمام مذاہب حقہ مٹ چکے ہیں اس لئے ان کی پیروی سواد اعظم کی پیروی ہوگی اور ان سے خروج سواد اعظم سے خروج ہوگا"۔

گورایہ صاحب کو سوچنا چاہئے کہ وہ ائمہ اربعہؒ سے برات کا اعلان کرکے کون سا راستہ اپنا رہے ہیں اور یہ کہ ان کے غیر مقلدانہ غرور وپندار کا آخری انجام کیا ہوگا؟

حرف آخر : پس چہ باید کرد؟

گورایہ صاحب لکھتے ہیں کہ :

"متحارب فرقوں کی موجودگی میں' عہد جدید میں یہی واحد شکل ممکن ہے۔(کہ اجتہاد قومی اسمبلی کے سپرد کردیا جائے)"۔

یہ تو تفصیل سے عرض کرچکا ہوں کہ گورایہ صاحب جس راستہ کی رہنمائی فرمارہے ہیں وہ ضلالت وگمراہی کا راستہ ہے جو سیدھا "وادی جہنم" کی طرف نکلتا ہے' اسکے بجائے صحیح راستہ یہ ہے کہ پاکستان میں اکثریت فقہ حنفی کے عقیدت مندوں کی ہے اسلئے ملک میں فقہ حنفی کو عدالتی قانون کی حیثیت سے نافذ کردیا جائے' دوسرے فرقوں کے شخصی معاملات ان کی فقہ کے مطابق طے کئے جائیں' جن مسائل وقضایا میں فقہ حنفی کی کوئی صراحت نہ ہو' یا اس میں واقعۃً ناقابل تحمل مشکل پیش آتی ہو ان میں اہل علم کے مشورے سے دوسرے ائمہ فقہا کے مسائل کو اپنالیا جائے اور جو مسائل بالکل جدید ہوں ان پر علما اور صلحا وعابدین غور وفکر کریں' جیسا کہ اس سے پہلے ارشاد نبویؐ نقل کرچکا ہوں' اس کے سوا جو راستہ بھی اپنایا جائے گا وہ دنیا وآخرت میں تباہی وبربادی کا راستہ ہوگا' اگر گورایہ صاحب کو اسلام سے کوئی دل چسپی اور

پاکستان سے کچھ ہمدردی ہے تو انہیں اکابر پاکستان کو اس کا مشورہ دینا چاہیے ورنہ :

ع "مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں"

اللہ تعالیٰ پاکستان کو ہر فتنہ وسازش سے محفوظ فرمائیں اور یہاں کے عوام وخواص کو دین قیم سے صحیح وابستگی نصیب فرمائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ صفوۃ البریۃ
محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

(بینات رمضان رشوال ۱۴۰۷ھ)

عصر حاضر کا اہم تقاضا
قدیم فقہ اسلامی اور جدید مسائل کا حل

(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد :

یوں تو آئے دن اتنے علمی و عملی فتنے ظاہر ہو رہے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس کس کا جواب دیا جائے اور کس کس کی طرف توجہ کی جائے :

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم!

فتنوں کا ایک سیلاب ہے کہ امنڈا چلا آرہا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاکر رکے گا؟ رسائل ہیں، اخبارات ہیں، ریسرچ کے انسٹی ٹیوٹ ہیں، ثقافت کے ادارے ہیں، کہیں تعمیر نو کے نام پر تخریب دین ہے، کہیں عقائد اسلامیہ پر حملے ہیں، کہیں احکام شرعیہ سے انکار ہے، کہیں انکار سنت کا زور ہے، کہیں تحریف قرآن کا فتنہ ہے کہیں جواز سود و تحلیل خمر کے فتوے ہیں، کہیں رقص و سرود کو جائز کرنے کے لئے تحقیقات ہو رہی ہیں، کہیں تعزیرات و حدود پر ہاتھ صاف کیا جارہا ہے، کہیں سلف صالحین سے بدظن کرنے کی مذموم کوشش ہو رہی ہے، کہیں اسلامی نظام کی ناکامی کے دلائل پیش کئے جارہے ہیں۔ الغرض کہیں مستشرقین مصروف عمل ہیں تو کہیں ملاحدہ

وزنادقہ اسلام سے برسرپیکار ہیں۔ اندر باہر، عوام وخواص، راعی ورعیت سب ہی کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی اس آخری نعمت کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے، مقصد حیات صرف مادی آسائش ہے، نہ آخرت کا تصور، نہ حساب وکتاب کی فکر، سارے نظام کا محور صرف پیٹ ہے اور بس۔ اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ جن حضرات میں ان فتنوں کے دفاع کی صلاحیت واہلیت ہے وہ یا تو بالکل غافل وخاموش ہیں یا ان کے وسائل اتنے محدود ہیں کہ اگر کچھ کرنا چاہیں بھی تو نہیں کرسکتے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

مصائب شتّٰی جمعت فی مصیبة
ولم یکفها حتّٰی قفتها مصائب

ترجمہ: "کتنے ہی منتشر مصائب ایک مصیبت میں جمع ہوگئے،
اور اس پر بھی بس نہیں بلکہ روز نئی نئی مصیبتیں آرہی ہیں"۔

علما امت کے ذمہ جہاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں، وہاں عصر حاضر کے اس اہم فریضہ کی ادائیگی بھی ان ہی کے ذمہ ہے کہ موجودہ دور کے تمدن وتہذیب نے جو نت نئے مسائل پیدا کردئے ہیں ان پر غور کرکے انکا حل تلاش کیا جائے آج کل کا نیا طبقہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر اس خیال خام میں مبتلا ہوگیا ہے کہ اسلام کا قدیم نظام یا قدیم اسلامی فقہ موجودہ معاشرے کی مشکلات کے حل کے لئے کافی نہیں لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہمارے نظام کے دو حصے ہیں، ایک حصہ وہ ہے جو قرآن وسنت کے صریح نصوص سے ثابت ہے، یہ تمام تر اس علیم وقدیر اور حکیم وخبیر رب العالمین کا ابدی اور دائمی قانون ہے جس کا علم بھی ہر شے کو محیط ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ قیامت تک جو آنے والی نسلیں ہیں ان میں کیا کیا خرابیاں

پیدا ہوں گی' اور اس کی قدرت بھی کامل ہے چنانچہ اس نے اپنے علم محیط اور قدرت کاملہ سے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام امراض روحانی کیلئے ایسا نسخہ شفا اتارا ہے کہ جس میں نہ کسی ترمیم واصلاح کی گنجائش ہے نہ کسی ادنیٰ سی تبدیلی کی۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو علما امت اور مجتہدین عظام نے قرآن کریم وسنت نبویہ سے استخراج واستنباط کرکے مرتب فرمایا ہے اس کے مختلف مراتب اور مختلف ادوار ہیں' معاملات اور معاشرت میں بہت سے احکام ایسے بھی ہیں کہ جن کا تعلق اس عہد سے تھا۔ مجتہدین امت کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے پہلے ہی ایسے اصول وقواعد مرتب فرما گئے کہ قیامت تک آنے والے اہل علم کو ان سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے گا اور انہی اصول وقواعد کی روشنی میں آئندہ ہر قسم کی مشکلات حل ہوسکیں گی۔ ظاہر ہے کہ جتنا تمدن ترقی کرے گا اتنے ہی جدید مسائل پیدا ہوں گے اور غیر اسلامی ملکوں سے تعلقات وروابط جتنے زیادہ پیدا ہوں گے نئے نئے مسائل سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ مسلمانوں میں اب بھی ایک بہت بڑا طبقہ ایسا موجود ہے کہ اگر تجارت ومعاملات میں اسلامی اصول کی روشنی میں ان کی مشکلات کو حل کردیا جائے اور فقہی قوانین سے ان کو ایسی تدابیر بتلادی جائیں کہ جن کی بنا پر وہ شرعی حدود کے دائرہ سے باہر قدم نہ نکال سکیں تو نہایت خوشی سے اس پر لبیک کہیں گے اور بدل وجان ان تدابیر پر عمل کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت علما امت کے ذمہ یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے اسلاف نے اپنے اپنے زمانے میں "اجناس" "واقعات" اور "نوازل" کے عنوان سے روز مرہ کے نت نئے پیش آنے والے مسائل کو یکجا کیا اور پھر قدیم فقہ اسلامی کی روشنی میں ان کو حل کیا۔ ٹھیک اسی طرح موجودہ فقہا بھی جدید نوازل وواقعات کا حل قدیم فقہ اسلامی کی روشنی میں تلاش کریں۔ جدید تمدن سے بھی فقہ

کے ہر باب میں نماز روزہ سے لے کر معاملات ومعاشرت تک جدید سوالات پیدا ہوگئے ہیں اس لئے علما امت کے ذمہ اب یہ فرض ہے کہ جلد سے جلد ان نئے پیدا ہونے والے مسائل کے مفصل جوابات امت کے سامنے پیش کرکے مسلمانوں کے دیندار طبقہ کو مطمئن فرمائیں اورجدید نسل کو باور کرائیں کہ دین اسلام میں ہروقت کے صحیح تقاضے کو پورا کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے اور ہماری شریعت زمان ومکان کے قیود سے بالاتر ہے "بینات" کے آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ ایک اجمالی فہرست پیش کرکے اس سلسلہ میں اہل علم کی خدمت میں چند رہنما اصول بھی پیش کروں گا تاکہ ان کی روشنی میں غور وخوض کرسکیں' بلاشبہ یہ فرض ایک اسلامی حکومت کا تھاکہ وہ وقت کے جامع ترین علما اور قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کے ایسے ماہرین کو جن کا تقویٰ واخلاص مسلم ہو' جن کے تدین پر امت کو اعتماد ہو' جن کی زندگیاں قال اللہ وقال الرسول میں گزری ہوں' جن کے ذہنوں میں توقد وذکا ہو' جن کی طبیعتوں میں استقامت واستقلال ہو' جو خواہشات وتاثرات سے بالاتر ہوں' جن کے دلوں میں مخلوق خدا کا درد ہو' جو دنیا کی مشکلات سمجھنے کا سلیقہ رکھتے ہوں اور جن میں موثر تعبیرات اور عام فہم تحریر کا ملکہ ہو' ان کو کسی ایک مرکز میں جمع کرتی' ان کی رفاقت میں عصر حاضر کے دیندار قانون دان طبقہ کو شامل کرتی اور فقہ اسلامی کے شعبہ میں تمام ممالک اسلامیہ میں اب تک جتنا کام ہوا ہے وہ سب ان کے پیش نظر ہوتا خواہ وہ مصر وشام میں ہوا ہو یا مغرب اقصیٰ کے ممالک میں اور پھر اس طرح قدیم وجدید سے فقہ اسلامی کی مہارت ومعلومات رکھنے والے حضرات اس کام کو اپنے ہاتھوں انجام دیتے۔ لیکن : اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

افسوس کہ حکومت پاکستان ادارہ اسلامیات کراچی وغیرہ پر سالانہ لاکھوں روپیہ خرچ کررہی ہے گمراہ امراپر اس کی توجہ نہیں۔ ان اداروں میں ایک بھی نہ متدین عالم

ہے نہ اسلامی علوم کا ماہر خصوصی۔ بجائے اس کے کہ وہ کچھ کام کرتے ان کا وجود ان کی کوششیں خود دین اسلام کے لئے عظیم الشان فتنے کی صورت اختیار کر چکی ہیں:

"فیا لغربۃ الاسلام ویا خیبۃ المسلمین!!"

موجودہ صورت حال میں جب حکومت اس طرف متوجہ نہیں تو پھر دیندار مالدار طبقہ کو چاہئے تھا کہ اس خدمت کو بجا لانے کے لئے کوئی اقدام کرتا اور علما کے مشورہ سے اس مقصد کے پیش نظر اہل افراد کا انتخاب کر کے فکر معاش سے ان کو ہر طرح مطمئن کرا کر اسی کام کے لئے فارغ کرتا اور اس طرح ایک "مجلس الفقہا والعلما" کی تشکیل ہوتی کہ جس میں محققین اہل علم باہمی مشاورت اور بحث و تمحیص سے ان مسائل کو حل کرتے۔ شخصی رائے کتنے ہی غور و خوض کے بعد قائم ہو پھر بھی وہ شخصی رائے ہی رہے گی۔

ان مشکلات کے حل کے لئے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے' اکابر صحابہؓ کے بعد حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی پہلی شخصیت ہے جس نے اجتہادی مشکلات کے حل کرنے کیلئے اپنے وقت میں ممتاز ترین چالیس افراد پر مشتمل ایک جماعت کی تشکیل کی اور ایک طویل مدت تک فقہی مسائل کے استنباط اور اجتہادی احکام کی تدوین کی خدمت انجام دیتے رہے' اسی لئے جو پختگی اور قبول عام اس مذہب کو ہوا اور کسی مذہب کو نصیب نہیں ہوا چنانچہ خلافت عباسیہ سے لے کر خلافت عثمانیہ کے اختتام تک جو بارہ سو برس کا طویل زمانہ گزرا ہے اس میں یہی مذہب حنفی تھا جس کی روشنی میں خدا کی مخلوق کے مشکلات حل ہوتے رہے اور ان خلافتوں میں بھی فقہ حنفی ملک کا قانون بنا رہا۔

لیکن جب کہ ہماری حکومت اور ہمارے ملک کے مسلمانوں کا مالدار طبقہ بھی اس فرض سے غافل ہے تو اب خالصۃً یہ فریضہ علما امت کے ذمہ آجاتا ہے خصوصاً

ان مدارس کے ارباب اہتمام کے ذمے جو کہ اپنے مدرسوں میں ہزارہا روپے سالانہ خرچ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور مناسب مشاہرات پر اچھے اچھے فضلا رکھ سکتے ہیں اگر ان عربی مدارس میں سے ہر مدرسہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ایک جماعت کی تشکیل کرے اور پھر اپنا ایک نمائندہ منتخب کرے تو کیا اچھا ہو جو کام ارباب حکومت لاکھوں روپے کے صرفے سے بھی انجام نہیں دے رہی' وہ علما کا یہ غریب و مفلس اور نادار طبقہ تھوڑے سے خرچ پر بآسانی کرسکتا ہے۔ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی' دارالعلوم کراچی' دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار' خیر المدارس ملتان' جامعہ اشرفیہ لاہور' جامعہ مدنیہ لاہور' دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ' جامعہ امدادیہ کشور گنج ڈھاکہ' مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چاٹگام' مدرسہ اسلامیہ جیری چاٹگام' جامعہ اسلامیہ قرآنیہ لال باغ ڈھاکہ وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ مدارس اس مقصد پر متفق ہو جائیں تو یہ عظیم الشان کام ان شاء اللہ بہت جلد انجام پذیر ہو سکے گا اور بآسانی یہ مشکل حل ہو جائے گی۔

آخر میں اپنی یہ مختصر گزارش حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پر ختم کرتا ہوں جس سے ان مشکلات کے حل کرنے میں پوری رہنمائی ملتی ہے :

عن علی قال قلت یا رسول اللہ ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر ولا نھی فما تامرنی قال شاوروا فیہ الفقھاء والعابدین ولا تمضوا فیہ رای خاصۃ رواہ الطبرانی فی الاوسط ورجالہ موثقون من اھل الصحیح۔

(مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۷۸)

ترجمہ:- حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول

اللہ اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جس میں آپ کا کوئی بیان کرنے یا نہ کرنے کا نہ ملتا ہو تو آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا کیا جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فقہاء وعابدین سے مشورہ کرکے فیصلہ کیا کریں شخصی رائے کو دخل نہ دیں۔"

اس حدیث کریم سے جہاں اجتماعی شورائی فیصلوں کی نہ صرف اہمیت بلکہ فرضیت ثابت ہوئی ساتھ ساتھ اس جماعت کی اہلیت کے شرائط بھی معلوم ہوگئے :

۱ : --------ایسے اہل علم ہوں کہ تفقہ فی الدّین ان کو حاصل ہو۔

۲ : --------صالح ومتقی اور عبادت گزار ہوں۔ واللہ سبحانہ ھو الموفق۔

(۲)

چند راہ نما اصول

گزشتہ سطور میں علما امت کی خدمت میں عصر حاضر کا اہم تقاضا کے تحت چند ضروری گزارشات کی گئی تھیں اس سلسلہ میں چند راہ نما اصول تحریر کئے جاتے ہیں :

۱: -------- ایہ تو ظاہر ہے کہ "اسلام" وہ آخری پیغام حیات وپیغام نجات ہے جو قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے قانون ہدایت ہے' اور ہر دور' ہر ملک' ہر قوم کے لئے اس میں ہدایت کے سرچشمے موجود ہیں۔ مادی وروحانی شخصی واجتماعی' اقتصادی ومعاشی' ملکی وسیاسی غرض ہر ضرورت کی حاجت روائی کا سامان اس میں موجود ہے اور اس کا دامن ایسے بیش قیمت جواہرات سے پر ہے کہ سارے عالم کے افلاس کا علاج اس کے خزانہ عامرہ سے ہوسکتا ہے۔ یہی ایک ایسا صالح ترین واعلیٰ

ترین نظام ہے جو نسل آدم میں عدل وانصاف سے ہر مشکل کو آسان کر سکتا ہے۔

۲: ــــــــــ قرآن وحدیث" یا "کتاب وسنت" اس کا بنیادی سرمایہ ہیں' خلافت راشدہ بالخصوص عہد صدیقی' عہد فاروقی اور اس کے بعد عہد اموی اور عہد عباسی میں صحابہؓ وتابعینؒ اور پھر ائمہ اجتہاد' ائمہ اربعہ ابو حنیفہؒ' مالکؒ' شافعیؒ' احمد رضی اللہ عنہم اور ان کے اقران میں سفیان ثوریؒ' اوزاعیؒ وغیرہ مجتہدین امت وفقہا اسلام کی مساعی جمیلہ ومبارکہ سے دین اسلام کی تعمیر وتعبیر کا عجیب وغریب نقشہ کامل ترین خوشنما صورت میں محفوظ ہوگیا۔ ان اکابر امت اور فقہا ملت میں اللہ تعالیٰ نے عظیم ترین اخلاص' اعلیٰ درجہ کا تقویٰ وخشیت الٰہی' علوم دینی میں تبحر' دقت نظر' توقد وذکاء کے جو کمالات جمع کیے تھے اس وقت کی نسل اس کا ادراک بھی نہیں کر سکتی' قرآن وحدیث کا علم صحیح اور دین اسلام کی مزاج شناسی کا ذوق جو ان کو نصیب تھا آج اس کا احساس بھی مشکل ہے اور انہی کمالات کا نتیجہ ہے کہ ایک ہزار برس سے زیادہ عرصہ گزرا لیکن ان کا فیض برابر جاری ہے اور قلوب میں ان کی عظمت اور قدر وقیمت ہنوز موجود ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قیامت تک آنے والے ان کی منت پذیری سے بے نیاز نہیں ہوسکتے' اور نہ اس عظیم سرمایہ سے امت کسی وقت مستغنی ہوسکتی ہے۔

۳: ــــــــــ فقہ اسلامی کا یہ ذخیرہ ہمارا قیمتی سرمایہ ہے' اور جہاں اس کی حفاظت کی ضرورت ہے ساتھ ہی ساتھ اس پر عمل کرنا اور اس سے منتفع ہونا بھی ہمارا فرض ہے۔ منتفع ہونے سے میرا مقصد یہ ہے کہ جدید تمدن نے جو بہت سے جدید مسائل پیدا کر دیئے ہیں اب اسی فقہ اسلامی کی روشنی میں اس کا حل تلاش کرنا چاہئے۔ اس سرمایہ کے ہوتے ہوئے امت کو نہ جدید مستقل اجتہاد کی ضرورت

ہے اور نہ اس کا امکان۔ اس عظیم الشان ذخیرہ میں بحث وتلاش اور غور وخوض کے بعد جدید مسائل کے حل کرنے کا بہت سامان مل جائے گا۔ ورنہ زیادہ سے زیادہ بعض جزوی مسائل میں علما امت کو ان ہی کے بتائے ہوئے اصولوں پر جدید اجتہاد کی ضرورت ہوگی۔

۴: -------- گزشتہ شمارے میں جو معجم طبرانی کی حدیث پیش کی تھی اس سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں :

الف : ----- جدید مسائل ایسے ضرور پیدا ہوں گے جن میں قرآن وحدیث کا صاف وصریح فیصلہ نہ ہوگا۔

ب : --------علما امت کے ذمہ یہ فرض عائد ہے کہ اس کا حل کریں۔

ج : -------علما انفرادی رائے اور شخصی رائے سے اجتناب کریں اور باہمی مشورہ سے اس کا فیصلہ کریں۔

د : ----- ان علما میں دو شرطیں ضروری ہیں' ان کے دلوں میں خوف خدا ہو' اور تفقہ فی الدین ان کو حاصل ہو۔

اس حدیث نبوی نے ان علما امت کو جدید مسائل کے فیصلہ کرنے کا مکلف بنایا ہے جن میں اخلاص وتقویٰ اور عبادت گزاری کی روح موجود ہو' اور غور وخوض وباہمی مشورہ کرنے کی اہلیت ہو۔

۵ : ----- اس میں شک نہیں کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جو بقول امام شمس الدین ذہبیؒ فقیہ ملت ہیں اور بقول صفی الدین خزرجیؒ "فقیہ امت" ہیں

(ملاحظہ ہو کتاب العبر للذہبی والخلاصہ للخزرجی) ان کی فقہ جامع ترین فقہ بلکہ فقہ اسلامی کی روح ہے کہ جس کی روشنی میں بقیہ ائمہ نے اپنی اپنی فقہ کی ترتیب وتدوین کی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جو مسائل اپنے اصحاب وتلامذہ کو املا کروائے ہیں' ان کی تعداد صاحب عنایہ شارح ہدایہ نے چوتھی صدی کے ایک محقق کے قول کے مطابق بارہ لاکھ ستر ہزار سے زائد بتلائی ہے۔ اگر امت کو یہ سارے مسائل پہنچ جاتے تو شاید بہت سے جدید مسائل حل ہو جاتے' فقہ حنفی کی اسی ہمہ گیری کو دیکھ کر مشہور محقق مورخ ابن خلدون باوجود مالکی المذہب ہونے کے اس کا اعتراف کرتا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی فقہ کی سرزمین' اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھی اس لئے جو پختگی حنفی فقہ کو نصیب ہوئی وہ فقہ المالکی کو نصیب نہ ہو سکی اور شاید یہی وجہ ہے کہ امام شعرانیؒ شافعی اپنی کتاب "المیزان" میں اپنے اس کشف کا ذکر کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب سب مذاہب سے آخر تک رہے گا' جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس مذہب میں اس کی زیادہ اہلیت ہے کہ جدید نظام کے مسائل پوری طرح حل کر سکے۔ تاہم بہت سے مسائل ایسے ملیں گے اور ہیں جن کا ذکر موجودہ فقہ حنفی کے اس عظیم الشان ذخیرہ میں نہیں ملتا ہے اور فقہ شافعی اور فقہ حنبلی میں مل جاتا ہے اس لئے اس سلسلہ میں جو بات فکر ناقص میں آئی ہے وہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں اور علما امت کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ اگر وہ صحیح نہ ہو تو ضرور اپنی مخلصانہ تنقید سے سرفراز فرمائیں۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

۶ : ــــــــ مبسوط' بدائع' قاضی خاں سے لے کر طحاوی' رد المختار اور التحریر المختار تک کتب فقہ حنفی کی ورق گردانی کرنے کے بعد بھی اگر مسئلہ ہاتھ نہ آئے تو امہات کتب مذاہب ثلاثہ کی ورق گردانی کرنی ہوگی۔ فقہ مالکی میں مدونہ کبری سے لے کر حطاب تک اور فقہ شافعی میں کتاب الام سے لے کر تحفۃ المحتاج تک کی مراجعت

کرنی ہوگی۔ حکومت سعودی کی عنایت توجہ سے فقہ حنبلی کا عظیم الشان ذخیرہ طبع ہوکر امت کے سامنے آگیا ہے اس کے لئے مغنی ابن قدامہ' المحرر اور الانصاف کی ورق گردانی کافی ہوگی' الغرض اگر مسئولہ ومطلوبہ مسئلہ ان کتب میں مل جائے تو اس پر فتوی دیدیا جائے جدید اجتہاد کی ہرگز ضرورت نہیں اور اگر مسئلہ صراحۃ نہ ملے تو ان مسائل مصرحہ پر قیاس کرنے میں مضائقہ نہ ہوگا۔ بشرطیکہ قیاس مع الفارق نہ ہو جس کا فیصلہ خود علما کرام فرمالیں گے کہ قیاس کس درجہ میں ہے۔

۷ :۔۔۔۔۔۔ اگر مسئلہ مطلوبہ سب فقہا کے ہاں ملتا ہے لیکن حنفی مذہب میں دشواری ہے اور بقیہ مذاہب میں نسبتاً سہولت ہے اور عوام کا ابتلا عام ہے تو اخلاص کے ساتھ جماعت اہل علم غور کرے اگر ان کو یقین ہوجائے کہ عموم بلوئ کے پیش نظر عصر حاضر میں دینی تقاضا سہولت و آسانی کا مقتضی ہے تو پھر مذہب مالک' مذہب شافعی' مذہب احمد بن حنبل کو علی الترتیب اختیار کرکے اور اس پر فتویٰ دے کر فیصلہ کیا جائے۔

ہمارے عصر حاضر کے اکابر نے فسخ نکاح کی مشکلات کو اسی طرح حل کیا ہے اور متاخرین نے مسئلہ مفقود الخبر میں بھی ایسا ہی کیا ہے۔ البتہ تلفیق سے احتراز کرنا ضروری ہوگا اور تتبع رخص کو مقصد نہ بنایا جائے گا۔ مثلاً مسائل معاملات میں بیع قبل القبض ہے کہ آج کل تمام تاجر طبقہ اس میں مبتلا ہے' اب اس کی صورت حال پر غور کرکے پوری طرح جائزہ لیا جائے کہ اگر یہ ابتلا واقعی ہے اور موجودہ معاشرہ مضطر ہے اور بغیر اس کے چارہ کار نہیں تو مذہب مالکی پر فتوی دیدیا جائے کہ عدم جواز بیع قبل القبض مطعومات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس مسئلہ میں مذہب حنبلی بھی' مالکی جیسا ہے اور حدیث میں صراحۃ طعام ہی کا ذکر ہے" : نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الطعام قبل ان يستوفيه (سنن) امام ابو حنیفہؒ امام

شافعیؒ نے طعام پر بقیہ چیزوں کو قیاس کرکے منع کردیا ہے۔

۸ : ـــــــــ خلافیات ائمہ میں اس پر غور کرنا ہوگا کہ اختلاف کا منشا نصوص کا تعارض ہے یا قواعد فقہیہ کا اختلاف یا یہ محض اجتہادی وجوہ کی وجہ سے ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی جو الہامی رائے فیوض الحرمین میں منقول ہے کہ ائمہ احناف کے اختلافات میں ترجیح کا معیار کیسے قائم کیا جائے اس کو پیش نظر رکھنے سے موجودہ خلافیات میں رہنمائی مل سکے گی نیز اختیارات علما کا سلسلہ جو مختلف ادوار میں جاری رہا' اس کو نظیر بنایا جاسکے گا۔ عرف وحالات کے اختلاف سے جو اثرات ہوں گے ان کو بھی ضرور پیش نظر رکھنا ہوگا مثلاً تعلیم القرآن' پھر اذان واقامت پھر تدریس حدیث وعلوم دینیہ پر معاوضہ یا مشاہرہ لینے میں قدما ومتاخرین کے زمانوں کے اختلاف کی وجہ سے جو اختلاف رہا' یہ سب باتیں پیش نظر رکھنی ہوں گی۔

۹ : ـــــــــ جن مطلوبہ احکام کا فیصلہ کرنا ہوگا ان میں طبقات ومراتب قائم کرنے ہوں گے اور یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ مسائل موجودہ معاشرے کے لئے کس درجہ میں مطلوب ہیں کیا ان کے بغیر نظام چل نہیں سکتا؟ یا چل تو سکتا ہے لیکن کسی قدر دقت پیدا ہوگی پھر اس دقت پر غور کرنا ہوگا کہ وہ دقت کس درجہ کی ہے؟

۱۰ : ـــــــــ معاملات میں فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے موجودہ ملک کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوگا کہ فقہی اصطلاح کے اعتبار سے یہ ملک دارالاسلام ہے یا دارالامان' یا دارالحرب ہے؟ دارالاسلام کا اصلی مدار "فصل خصومات" پر ہے کہ پورا قانون تعزیرات وحدود' محاکم شرعیہ عدلیہ قائم ہوں اور معاملات وعقوبات کا قانون مکمل اسلامی ہو' تعزیرات وحدود' قانون اسلامی کے مطابق جاری ہوں' اسی طرح

موجودہ نظام حکومت کا جائزہ لینا اور اس پر غور کرنا ہوگا کہ یہ کس قسم کی حکومت ہے، اسلامی قانون کے نفاذ پر صرف قدرت ہی کافی ہے، یا عملی طور پر اس کی تنفیذ بھی ضروری ہے، عرصہ دراز تک باوجود قدرت قانون اسلام جاری نہیں کیا گیا تو اس کے عوامل واسباب کیا ہیں اور سابقہ دارالحرب یعنی عہد برطانوی کا دارالحرب تقسیم ہو کر دو حصے بنے ایک حصہ یقیناً اب بھی دارالحرب ہے دوسرا حصہ صرف حکمرانوں کی تبدیلی سے کیا دارالاسلام بن جائے گا؟ یعنی قانون تو نہیں بدلا مگر قانون کے چلانے والے بدل گئے تو کیا اس لئے حکم بدل جائے گا؟ پھر جب کہ عہد حاضر میں "عائلی قانون" کے نام سے صراحۃً کتاب وسنت کے خلاف قانون بنایا گیا تو کیا صریح خلاف قرآن قانون بننے کے بعد بھی فقہا اسلام کے مسائل کے مطابق یہ دار الاسلام ہی رہے گا؟ الغرض اس امر کے فیصلہ کرنے کے بعد معاملات کا شرعی فیصلہ ممکن ہو سکے گا۔ عقود فاسدہ، ربوا، بیمہ ان سب مسائل کے صحیح حل کرنے کے لئے اس ملک وحکومت کے متعلق شرعی وفقہی فیصلہ کرنا ہوگا اور یہ غور کرنا ہوگا کہ موجودہ حزب اقتدار آخر اسلامی قانون کے نافذ کرنے سے گریز کیوں کرتا ہے؟ کیا صرف اس لئے کہ ان کی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں یہ قانون حائل ہے؟ یا وہ عقیدتاً اسلامی قانون کو موجودہ زمانے کے لئے غیر صالح اور ناکافی سمجھتا ہے ان سب گوشوں پر غور کرنا اور ان سب حالات کا جائزہ لینا ہوگا جب جاکر صحیح فیصلہ ہو سکے گا اور جب اس حکومت یا اس ملک کی فقہی وشرعی حیثیت متعین ہو جائے گی تو پھر ان معاملات کے احکام کا صحیح فتویٰ دیا جا سکے گا جن کا حکم اختلاف دار سے مختلف ہو سکتا ہے۔

یہ چند مختصر اشارے ہیں جن کی حیثیت ایک مختصر "متن" کی ہے اور اس کی تشریح ایک مفصل مضمون کی محتاج ہے لیکن چونکہ اصلی مخاطب علما کرام ہیں ان کی خدمت میں یہ اشارات بھی کافی ہوں گے۔

میری خواہش ہے کہ علما کی خدمت میں ان موضوعات کو آئندہ بھی پیش کیا جائے جن پر ان کو غور کرنا ہوگا اور جب تک اجتماعی فیصلہ کا موقع نہ آئے اس سے پہلے انفرادی طور پر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش انہی اصول کے پیش نظر کریں مقصود تین باتیں ہیں :

الف : ---------اللہ کا یہ دین کامل اور ہر معاشرے کے لئے صالح و موزون ہے۔

ب :----- اسلام کو مشکل سمجھ کر اور ناممکن العمل خیال کر کے اسلام کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

ج :----- جو فریضہ علما امت کے ذمہ ایسے حالات میں عائد ہوتا ہے ان سے سبکدوش ہوجائیں' نہ جدید اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہے نہ تتبع رخص پر قوم کو آمادہ کرنا ہے نہ ترک تقلید کی بنیاد رکھنا ہے بلکہ یہ سمجھنا ہے کہ قرآن و سنت اور اس کے بعد فقہ اسلامی اور تفقہ فی الدین کے ذریعہ سارے مشکلات حل ہوسکتے ہیں اور فقہا اسلام اور فقہ اسلامی سے بے نیاز ہوکر دین اسلام کی حفاظت کی تدبیر طفلانہ خیال ہے۔ فقہا کرام نے دین کی بڑی خدمت کی ہے ایک ہزار برس کے بعد بھی دنیا ان کی جلیل القدر حیرت انگیز خدمات سے مستغنی نہیں ہوسکتی بلکہ قیامت تک ان کی منت پذیر رہے گی۔

الدین النصیحة للہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتھم۔

(مسلم عن تمیم الداری)

(بینات ربیعین ۱۳۸۳ھ)

اسلامی قوانین میں اجتہاد و عقل کا مقام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہ کا عربی مقالہ "موقف التشریع الاسلامی من الاجتہاد ومنصب العقل فی الدین" کے عنوان سے ادارۂ تحقیقات اسلامی راولپنڈی کی بین الاقوامی کانفرنس ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی القعدہ ۱۳۸۷ھ کے لئے لکھا گیا تھا، مقالہ چونکہ تاخیر سے تیار ہوا تھا اس لئے وہاں نہیں پڑھا گیا، البتہ اس کا خلاصہ زبانی بیان کردیا گیا تھا، اس لئے اس کا ترجمہ ہدیہ قارئین ہے:

یہ "اجتہاد" کے موضوع پر مختصر سا مقالہ ہے، میں (اس وقت) موضوع سے متعلقہ تمام مباحث پر مفصل بحث کا ارادہ نہیں رکھتا مثلاً "اجتہاد" کی لغوی تحقیق، اجتہاد کے معانی، حکم، ارکان، شرائط، اقسام، حجیت اجتہاد پر دلائل اور اس قسم کی اور طویل بحثیں جن سے تمام ائمہ مذاہب کے اصول فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، چنانچہ ان اکابر نے کسی

چھوٹی بڑی بحث کو نہیں چھوڑا جس کی کما حقہ تحقیق و تنقیح نہ کر ڈالی ہو' یہ سلسلہ اسلام کے قدیم دور سے لے کر علمی دور کے آخری سرے تک جاری رہا ہے' بلاشبہ یہ امت اسلامیہ کی مایہ فخر دولت ہے' جس سے نہ بحث و تفقہ کا طالب علم مستغنی ہے' نہ عصری مسائل کے حل کا مدعی اس سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔

چنانچہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلمیذ رشید قاضی القضاۃ ابو یوسفؒ کے دور سے پھر امام شافعیؒ' امام طحاویؒ' جصاصؒ' رازی' ابو زیدؒ دبوسی' فخر بزدوی' امام غزالیؒ کے دور سے امام رازیؒ اور امام آمدیؒ کے دور تک' اور ان کے دور سے امیر کاتب اتقانیؒ اور ابن ہمامؒ حنفی کے دور تک اسلامی کتب خانے میں (اصول فقہ پر) اتنا بڑا ذخیرہ وجود پذیر ہوا جس سے عقل حیران رہ جاتی ہے۔

آج کی فرصت میں میرے پیش نظر صرف یہ ہے کہ محققین اہل علم کی توجہ "مسائل حاضرہ اور جدید مشکلات میں اجتہاد کے اہم اصولوں" کی طرف مبذول کراؤں' کیونکہ نئے تمدن نے نئے مسائل کو جنم دیا ہے' اور ان میں بہت سی چیزیں ایسی نظر آتی ہیں جنہیں قواعد شرعیہ اور فقہ اسلامی کے مطابق ڈھالنا ہماری پہلی ضرورت ہے' ہمارا ایمان ہے کہ دین اسلام' تمام ادیان کے لئے خاتم' اور قیامت تک کی ضرورتوں کا کفیل ہے' چنانچہ کتاب وسنت اوران سے متعلقہ علوم وہ فیاض چشمے ہیں جن سے حل مسائل کے سوتے ابلتے ہیں پھر صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ کا طریق کار ہمارے لئے روشنی کا مینار ہے ان حضرات نے اجتہاد کیا' اور جن "اصول" کے احکام نص سے ثابت تھے ان پر (غیر منصوص) کو قیاس کیا' اور نصوص

کے حکم کو فروع و حوادث کی طرف متعدی کرنے کے لئے اجتہاد سے کام لیا' اس طرح اجتہاد و قیاس اصول شرعیہ میں سے ایک اصول قرار پایا' جس سے تفقہ فی الدین کا دائرہ وسیع ہوا' ہم اس حق میں نہیں کہ اس دائرے کو تنگ کردیا جائے' یا دین خداوندی کے ان فیاض چشموں کو بند کردیا جائے' کیونکہ کتاب و سنت اور عقل کے دلائل سے ثابت ہے کہ یہ دائرہ ہر دور میں وسیع رہے گا۔

چنانچہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے :"پس تم عبرت لو! اے عقلمندو!"۔

نیز ارشاد ہے :"بے شک اس میں عبرت ہے بصیرت والوں کے لیے"۔

اور ظاہر ہے کہ کسی شے کے حکم کو اس کی نظیر کی طرف لوٹانے کا نام "اعتبار" ہے' اسی لئے جس اصل کی طرف نظائر کو لوٹایا جائے اسے "عبرۃ" کہا جاتا ہے۔

نیز ارشاد ہے :" اور اگر یہ لوگ اس کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے حوالے کردیتے تو ان میں جو لوگ اس کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس کو خود ہی جان لیتے"۔

اور استنباط کے معنی ہیں جیسا کہ سرخسیؒ (اصول السرخسی ج ۲ ص ۱۲۸ طبع جدید حیدر آباد دکن) نے لکھا ہے "اجتہاد کے ذریعہ حکم منصوص کی علت دریافت کرنا۔"

نیز ارشاد ہے "پس اگر تم کسی امر میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ"۔

امام سرخسیؒ لکھتے ہیں :

" یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اللہ و رسول کی طرف

لوٹانے سے مراد کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا ہے' کیونکہ یہاں رد کو منازعت پر معلق کیا گیا ہے' اور ظاہر ہے کہ کتاب وسنت پر عمل کرنا اس شرط پر معلق نہیں' نیز جن احکام شرعیہ پر کتاب وسنت کے نصوص موجود ہوں ان میں اہل ایمان کے نزاع کی صورت مشکل ہی سے پیش آسکتی ہے' اس سے واضح ہوا کہ یہاں مراد وہ منازعت ہے جو ایسے واقعہ میں پیش آئے جس کے لئے کتاب وسنت کا صریح حکم موجود نہ ہو۔ اور "رد" سے مراد یہ ہے کہ جس حادثہ میں نزاع واقع ہو غور وفکر سے کتاب وسنت کے منصوص احکام میں اس کی نظیر تلاش کی جائے' اور یہ مماثلت' اجتہاد کے ذریعہ علت حکم کی دریافت ہی سے معلوم ہوسکتی ہے"۔

(اصول السرخسی ج۲ ص۱۲۹)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی احادیث' اجتہاد' قیاس اور اعتبار کے سلسلہ میں کافی تعداد میں موجود ہیں ان کی ایک اچھی مقدار' امام سرخسیؒ نے "اصول" میں' امام ابن عبدالبرؒ نے "جامع بیان العلم" میں اور حافظ ابن قیمؒ نے "اعلام الموقعین" میں اور دوسرے اکابر نے جمع کردی ہے' ہم یہاں "حدیث معاذ" کے ذکر پر کفایت کرتے ہیں' جو "سنن" میں موجود ہے' ائمہ حدیث نے اسے روایت کیا ہے اور تمام امت نے اسے قبول کیا ہے۔

امام غزالیؒ "المستصفی" میں لکھتے ہیں :

"اس حدیث کو امت نے قبول کیا ہے، اور کسی نے اس میں طعن یا انکار کا اظہار نہیں کیا، اس لئے اس کا مرسل ہونا قادح نہیں، بلکہ اس کی سند کی تفتیش بھی ضروری نہیں، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث جن پر پوری امت عمل پیرا ہے مثلاً "وارث کے لئے وصیت نہیں" "کسی عورت سے اس کی پھوپھی پر نکاح نہ کیا جائے" "دو ملتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے" وغیرہ (کہ اس عملی تواتر کے بعد ان کی اسناد کی بحث غیر ضروری ہو جاتی ہے) البتہ یہ حدیث معاذؓ اصل اجتہاد میں نص ہے، اور شاید یہ "تحقیق مناط" اور تعیین مصلحت کے بارے میں ہے، جہاں کہ اصل کا حکم مصلحت پر معلق ہو، اس لئے یہ قیاس کو صرف اپنے عموم کی بنا پر شامل ہوگی"۔

مگر چونکہ بعض لوگوں نے اسے طویل بحث کا نشانہ بنایا، اور اس کی اسناد کا سوال اٹھایا ہے اس لئے ہم یہاں امام کوثری (مقالات کوثری ص ۶۰ تا ۶۴) کی تحقیق کا خلاصہ اور لب لباب پیش کرتے ہیں، جو اصول حدیث کے قواعد کے مطابق انہوں نے اس کی قوت سند کے بارے میں فرمائی ہے۔

اس حدیث کو امام ابو داؤد، ترمذی اور دارمی نے مختلف الفاظ میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ :

"جب حضرت معاذؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو فرمایا : فیصلہ کیسے کرو گے؟ عرض کیا : کتاب اللہ کے مطابق! فرمایا اگر اس کا صریح حکم کتاب اللہ میں نہ ہو؟ عرض کیا تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق! فرمایا : اگر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی نہ ہو؟ عرض کیا پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا' اور غور و فکر میں کوتاہی نہیں کروں گا! یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ اس نے فرستادۂ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو "رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پسندیدہ طریق کی توفیق دی"۔

اس حدیث کو اصحاب معاذؓ سے حارثؒ بن عمرو ثقفی نے روایت کیا ہے' اور حارث نہ تو مجہول العین ہے' چنانچہ امام شعبہؒ فرماتے ہیں کہ وہ مغیرہ بن شعبہؓ کے بھتیجے ہیں' اور نہ وہ مجہول الوصف ہیں' کیونکہ وہ کبار تابعین میں' ابو عون ثقفی (م ۱۱۶ھ) کے طبقہ شیوخ میں ہیں' اور ان کے بارے میں کوئی "جرح مفسر" ثابت نہیں' اس لئے ان کی ثقاہت اور قبول روایت کے لئے اتنا ہی کافی ہے' اس کے بعد ان کے اہل طبقہ سے نقل توثیق کی حاجت نہیں رہ جاتی' اور تمام تابعین کے حق میں خیر کی شہادت دی گئی ہے وہ سب ثقہ اور عادل ہیں' جب تک کہ ان میں جرح مؤثر اور جرح مفسر ثابت نہ ہو' اور صحابہؓ سب عادل ہیں' ان میں کسی قسم کی جرح بھی مؤثر نہیں' علاوہ بریں حارث کو ابن حبان نے "ثقاۃ" میں ذکر کیا ہے۔ اور یہ حدیث اس وجہ سے بھی ضعیف نہیں قرار دی جاسکتی کہ ابن عون

حارث سے اس کی روایت میں متفرد ہیں، اس لئے کہ ثقہ راوی کے تفرد کی وجہ سے حدیث کو رد کردینا اہل حق کا اصول نہیں، اور ابن عونؒ، امام اعمشؒ، ابو اسحاقؒ، مسعرؒ، شعبہؒ، ثوریؒ اور ابو حنیفہؒ جیسے اکابر کے استاذ، صحیحین کے راوی، اور باتفاق اہل نقد ثقہ ہیں۔

ابن عونؒ سے اس حدیث کو ابو اسحاق شیبانیؒ اور شعبہ بن حجاجؒ نے روایت کیا ہے، اور ابو اسحاقؒ سے ابو معاویہؒ ضریر نے، اور شعبہؒ سے یحییٰ بن سعید قطانؒ، عثمان بن عمر عبدیؒ، علی بن جعدؒ، محمد بن جعفرؒ، عبدالرحمان بن مہدیؒ اور ابو داؤد طیالسیؒ وغیرہم نے روایت کیا ہے اور ان حضرات سے بے شمار لوگوں نے روایت کیا، یہاں تک کہ فقہا تابعین نے اس حدیث کو بالاتفاق قبول کیا۔

اور اس حدیث کو اس وجہ سے رد کردینا کہ، یہ اصحاب معاذ سے مروی ہے اور وہ مجہول ہیں، چند وجوہ سے غلط ہے۔

اولاً : اس لئے کہ اصحاب معاذؓ دین وثقاہت میں معروف ہیں، اور ناممکن ہے کہ کوئی شخص اصحاب معاذؓ میں سے کسی ایک کے حق میں بھی جرح ثابت کرسکے، (اور ثقہ کا مبہم ہونا مضر نہیں)۔

ثانیاً : اس لئے کہ اصحاب معاذ کا بلا تعیین ذکر، اس امر کی دلیل ہے کہ روایت کے اعتبار سے یہ حدیث حد شہرت کو پہنچی ہوئی تھی، جیسا کہ قاضی ابو بکر ابن عربیؒ نے کہا ہے، چنانچہ امام بخاریؒ نے عروہؓ بارقی کی حدیث کی سند اسطرح نقل کی ہے! "میں نے قبیلہ کے لوگوں کو عروہؓ سے روایت کرتے سنا ہے"۔ اس کے باوجود یہ روایت درجہ صحت سے نہیں گری، اور امام مالکؒ نے "قسامہ" میں سند یوں بیان کی ہے "اسے اس کی قوم

کے بڑے لوگوں میں چند مردوں نے خبر دی"۔ نیز صحیح مسلم (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۰۷ طبع رشیدیہ دہلی) میں زہری سے یوں روایت ہے کہ "مجھ سے چند مردوں نے بروایت ابو ہریرہؓ یہ حدیث بیان کی ہے کہ جس نے جنازہ کی نماز پڑھی اس کے لئے ایک قیراط ہے۔"

ثالثاً : اس لئے کہ تاریخ ابن ابی خیثمہ (بحوالہ مقالات کوثری ص ۶۴) میں بروایت شعبہؒ یہ لفظ ہیں "میں نے مغیرہ بن شعبہؓ کے بھتیجے حارث بن عمروؒ سے سنا وہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاذ کی یہ حدیث بیان کرتے تھے"۔ حافظ ابن عبد البر (جامع بیان العلم وفضله وماينبغي في روايته وحمله' لابن عبد البر ج ۲ ص ۵۵' طبع منيريه' مصر) نے بھی "جامع بیان العلم" میں اسی طرح روایت کی ہے' اندریں صورت اصحاب معاذ رضی اللہ عنہم سے مراد اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہ سب عادل ہیں۔

رابعاً : اس لیے کہ خطیب بغدادی "الفقیہ والمتفقہ" میں لکھتے ہیں :

> "حارثؒ بن عمرو کا "عن اناس من اصحاب معاذ" کہنا شہرت حدیث اور کثرت رواۃ کی دلیل ہے' اور حضرت معاذؓ کا فضل وزہد معروف ہے (ان کے اصحاب بھی معمولی درجہ کے لوگ نہیں ہوں گے) اور کہا گیا ہے کہ عبادہ بن نسی نے اسے بروایت عبد الرحمٰن بن غنم حضرت معاذؓ سے روایت کیا ہے' اور یہ سند متصل ہے اور اس کے راوی سب ثقہ ہیں' علاوہ بریں اہل علم نے اسے بالاتفاق قبول کیا ہے' اور اس سے

استدلال کیا ہے، جس سے واضح ہے کہ یہ حدیث ان کے نزدیک درجہ صحت رکھتی ہے"۔

حاصل یہ کہ فقہا و محدثین کے نزدیک یہ حدیث صحیح اور ثابت ہے، اگر اس کے ساتھ خارجی قرائن اور تائیدی روایات کو بھی ملالیا جائے تو یہ قریباً تواتر معنوی کا درجہ رکھتی ہے امام کوثریؒ کی تحقیق کا خلاصہ ختم ہوا۔

اور جدید مسائل میں حجیت اجتہاد کی عمدہ ترین دلیل وہ حدیث ہے جسے امام نسائیؒ نے سنن میں "باب الحکم باتفاق اہل العلم" کے ذیل میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے طویل اثر میں روایت کیا ہے کہ:

"پس اگر ایسا معاملہ پیش آئے جس کا صریح حکم نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرمایا ہو تو وہ فیصلہ کرے جو سلف صالحین نے کیا ہو، اور اگر ایسا معاملہ درپیش ہو جو نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ کیا ہو، نہ سلف نے، تو اپنی بصیرت سے اجتہاد کرے، اور یہ نہ کہے کہ میں ڈرتا ہوں، میں ڈرتا ہوں، کیونکہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی۔ اور حلال و حرام کے مابین بعض چیزیں مشتبہ ہیں، اس لئے اس پہلو کو چھوڑ دو جو کھٹک پیدا کرے اور وہ پہلو اختیار کرو جس میں کھٹک نہ ہو۔"

امام نسائی فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث بہت عمدہ ہے" اور اسی کی مثل حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

(سنن نسائی ج ۲ ص ۲۶۴، سنن داری ص ۳۴)

اور عقلی حیثیت سے اجتہاد کی ضرورت بالکل واضح ہے، امام سرخسیؒ فرماتے ہیں :

> "کوئی حادثہ ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے، حلت یا حرمت، وجوب یا عدم وجوب کا حکم نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ ہر حادثہ میں نص صریح نہیں ہوگی کیونکہ نصوص محدود ومتناہی ہیں، جب کہ قیامت تک کے حوادث غیر متناہی اور حادثہ کا نام "حادثہ" رکھنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس میں نص نہیں ہوگی، ورنہ جس پر نص صریح موجود ہو وہ "اصل معہود ہوا"۔

(اصول السرخسی ج ۲ ص ۱۳۹)

حاصل یہ کہ زندگی رواں دواں ہے، اور وہ اپنے جلو میں بہت سے نئے مسائل کو لاتی ہے، اس لئے ہمارا فرض یہ ہونا چاہئے کہ ہم کتاب وسنت، اجماع امت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ان جدید مسائل کا حل، اس طرح تلاش کریں کہ نہ تو کج روی اور گمراہی کی وادیوں میں بھٹکیں نہ بزدلی سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں۔

تشریع اسلامی کی تاریخ، فقہی دور کی تکمیل اور ہر زمانے میں جدید مسائل پر کتابوں کی تصنیف اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ جن مسائل میں کتاب وسنت کے نصوص موجود نہیں، ان میں اجتہاد کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے، چنانچہ امت اسی اصول پر کاربند رہی ہے، اس لئے جواز اجتہاد پر مزید بحث کی ضرورت نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے عقل پیدا کی ہے، انسان میں امانت

الٰہیہ کی برداشت کا مدار اسی پر رکھا ہے اور "بصائر و عبر" میں غور و تدبر کی بار بار دعوت دی ہے۔

امام فخر الاسلام بزدویؒ فرماتے ہیں :

> "عقل بدن انسان میں ایک نور ہے جیسا کہ زمینی عالم میں آفتاب' اس سے وہ راہیں کھلتی ہیں جہاں حواس ظاہری کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے' پھر یہ بذات خود رہنما نہیں' بلکہ اس کا کام صرف راستے کا اجاگر کر دینا ہے' راستہ واضح ہو جانے کے بعد اس کا ادراک' قلب اپنے نور فہم سے کرے گا' جس طرح طلوع آفتاب سے راستہ کھل جاتا ہے' مگر راستہ نظر آنے کے لئے تنہا سورج کی روشنی کافی نہیں بلکہ چشم بینا کی بھی ضرورت ہے۔"

بہر حال عقل' ایک نور ہے' ایسا نور! جس سے اوہام کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں' ایسا نور! جس سے علل احکام کی راہیں اجاگر ہو جاتی ہیں' حق تعالیٰ نے قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں عقل کی مدح و توصیف فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے :

> "ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان کو جو غور کرتے ہیں۔"

> "ان کے لئے دل ہوتے ہیں جن سے سمجھتے ہیں"۔

(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

> "یوں کھول کر بیان کرتے ہیں ہم نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں"۔

"بہرے، گونگے اور اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے"۔

"اور وہ ڈالتا ہے گندگی ان پر جو نہیں سوچتے"۔

"اور ان کو سمجھتے وہی ہیں جن کو سمجھ ہے"۔

"کیا دھیان نہیں کرتے قرآن میں یا دلوں پر لگ رہے ہیں ان کے قفل"۔

"سمجھتے وہی ہیں جن کو عقل ہے"۔

"شاید وہ سوچے یا ڈرے"۔

"اور سوچ وہی کرے جو رجوع رہتا ہو"۔

"اور تاکہ سمجھیں عقل والے"۔

"اور بیان کرتا ہے اللہ، مثالیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ فکر کریں"۔

یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ بلاشبہ عقل، نور فروزاں ہے مگر اس کے لئے ایک خاص دائرہ ہے جس سے آگے قدم بڑھانا اس کے لئے ممکن نہیں، اور جہاں عقل کی پرواز ختم ہوتی ہے وہاں سے عقل سے بالاتر ایک دائرہ شروع ہوتا ہے، اور وہ وحی الٰہی اور نبوت الٰہیہ کا دائرہ ہے، لاریب کہ عقل ان امور کا ادراک نہیں کر سکتی جو وحی کی آنکھ سے نظر آتے ہیں، عقل کے لئے یہی فخر کیا کم ہے کہ وہ، وحی کے بیان کردہ حقائق کا ٹھیک ٹھیک ادراک کر لے، اور اپنے نور خداداد سے ان حقائق کی بلند حکمتوں، گہری مصلحتوں اور باریک اسرار وعلل کا سراغ لگانے میں وہ کامیاب ہو جائے۔ اس سے واضح ہوا کہ کتاب وسنت، شرائع الٰہیہ اور

احکام منصوصہ کے سامنے سر جھکانے اور ادب و وقار اور تسلیم و انقیاد کے ساتھ ان کے سامنے کھڑا ہونے کے سوا عقل کو کوئی چارہ نہیں' اور اگر حقائق وحی تک اس کی رسائی نہ ہوسکے تو اسے اپنی تنگ دامانی کا اعتراف کرنا ہوگا۔ مختصر یہ کہ نصوص وحی کے ہوتے ہوئے بھی عقل کو ہر چیز میں مقدم رکھنا بڑی گھناؤنی جسارت ہے' اور نصوص وحی کے نہ ہونے کی صورت میں بھی اس سے کام نہ لینا نری حماقت اور کوتاہی ہے' صحیح راستہ ان دونوں کے بیچ سے ہوکر گزرتا ہے' اور وہی صراط مستقیم ہے۔

البتہ یہاں چند اہم نکات کی طرف اشارہ ہمارے لئے بے حد ضروری ہے جن سے موضوع کھل کر روشن ہوجائے۔

اول : اجتہاد کے لئے قرآن وحدیث اور اجماع امت کا علم' فقہ اسلامی کی کتابوں سے واقفیت' اور فہم کتاب وسنت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے' ان میں مہارت از بس ضروری ہے خصوصا "علم اصول فقہ" میں کامل بصیرت ہونی چاہیے کہ اس کے بغیر ہم ایک قدم آگے نہیں چل سکتے۔

دوم : بالغ نظری اور دقیقہ رسی کے ساتھ تقویٰ' خشیت الٰہیہ اور دین خداوندی کے ساتھ کامل اخلاص۔

سوم : شورائی اجتہاد کا اہتمام چونکہ ایسے یکتا اشخاص کا وجود' جو ان مجتہدانہ صفات میں کامل ہوں' بعید مشکل ہے' اس لئے "شخصی رائے" کی کمی کو ایسی جماعت کی آراء سے پورا کیا جانا چاہیئے' جن میں' فرداً فرداً نہ سہی' مگر مجموعی حیثیت سے یہ تمام صفات کامل طور سے جمع ہوں' یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ

جدید مسائل میں انفرادی رائے کے بجائے "فقہاو عابدین" سے مشورہ کیا جائے۔ امام طبرانی نے یہ حدیث' حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے' اور یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے' فقیہ الامت ہونے کے باوجود' انفرادی اجتہاد نہیں کیا' بلکہ اس مقصد کے لئے ایسے چالیس افراد کی جماعت تشکیل کی جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ یکتائے زمانہ تھا جیساکہ الموفق نے "مناقب ابی حنیفہؒ" میں ذکر کیا ہے۔

چہارم : جب کسی پیش آمدہ مسئلہ کا حل' مذاہب اربعہ میں سے کسی میں موجود ہو' بشرطیکہ وہ رائے شاذ اور اجماع امت کے خلاف نہ ہو' تو ہمیں اسی کو اختیار کرنا ہوگا تاکہ اجتہاد جدید اور مذاہب مجتہدین سے خروج کی ضرورت نہ رہے۔

پنجم : چونکہ ہمارے ملک میں حنفی مسلک رائج ہے' اس لئے بدون شدید اضطرار کے بلاوجہ اس سے نکلنا اور "رائے عامہ" کو خوامخواہ پریشان کرنا' غیر معقول ہوگا۔

ششم : جن مسائل میں نصوص قطعیہ موجود ہوں وہ ہر دور میں دائرہ اجتہاد سے خارج ہیں' اجتہاد صرف ان مسائل تک محدود ہے جو نہ منصوص ہوں نہ اجماعی' اس لئے اس کی گنجائش نہیں کہ کسی حکم کی علت' مصلحت یا حکمت تراش کر اسے ایسے طور پر مدار حکم قرار دے لیا جائے کہ اس سے نص کا غیر معمول بہ ہونا یا اجماع امت کا باطل ہونا لازم آئے یہ طرز عمل تقریباً الحاد و تحریف سے جاملتا ہے اور بہت سے لوگ جہل یا عناد کی بنا پر اس کے مرتکب ہیں۔

(حجۃ اللہ البالغہ باب الفرق بین المصالح والشرائع)

ہفتم : مسائل جدیدہ میں اجتہاد کے لئے' خلافت راشدہ خصوصا خلافت شیخین حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما' کو نظیر بنانا' ناممکن ہے 'کیونکہ خلافت راشدہ کا مقام' منصب اجتہاد سے بالاتر ہے' اور خلافت راشدہ کے فیصلوں کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم' شارع علیہ السلام کی طرف سے امت کو دیا گیا ہے۔

ہشتم : مذاہب مختلفہ کو ملانے (تلفیق) اور اضطراری حالت کے بغیر' مذاہب فقہا سے چھانٹ چھانٹ کر رخصتوں کو تلاش کرنے سے پرہیز کیا جائے' کیونکہ یہ دین ہی سے نکل جانے کے مرادف ہے۔

نہم : جدید تمدن کی بدولت غیر اسلامی ممالک میں بیشتر ایسے قوانین رائج ہیں' جو روح اسلام کے منافی' اور قطعیات اسلامیہ سے ٹکراتے ہیں' انہیں "اضطرار" کے بہانے سے اسلامی معاشرے میں جوں کا توں فٹ نہ کیا جائے' بلکہ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اسلام میں اس کا جو "بدل" موجود ہے اسے اختیار کیا جائے' مثلاً "بینک کا سود" "بیمہ" اور "کمیشن ایجنسی" کا مسئلہ ہے' کہ اسلام میں اس کا بدل "شرکت" "قراض" اور "کفالت" وغیرہ کی صورت میں موجود ہے' جس کے ہوتے ہوئے ان حرام امور کے ارتکاب کی ضرورت نہیں رہتی۔

اشکال کی جڑ "بنیاد" یہ ہے کہ ہم غیر اسلامی قوانین کو' ان میں رتی بھر تبدیلی کئے بغیر' اسلامی اصول پر منطبق کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور جب وہ فٹ نہیں ہوتے تو گمان کرلیا جاتا ہے کہ اسلام۔ معاذ اللہ۔ جدید دور کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

یہ یاد رہے! کہ اصول اسلامیہ کا سرچشمہ ذات خداوندی ہے جس کا علم صحیح قیامت تک کے حوادث کو محیط ہے اور جس کی قدرت ازلیہ کاملہ کسی چیز سے عاجز نہیں' کیونکہ یہ شریعت اس ذات کی طرف سے آئی ہے جو علیم و خبیر بھی ہے اور ہر چیز پر قادر بھی۔

دہم : الجاء و اضطرار کے درمیان اور عیش پرستی' زراندوزی اور امیر سے امیر تر بننے کی حرص کے درمیان جو نمایاں فرق ہے' اسے ملحوظ رکھنا چاہئے ایک بھوکا ننگا فاقہ کش ہے' جسے قوت لایموت بھی میسر نہیں' اور ایک وہ امیر کبیر ہے' جس کا گھر طرح طرح کے اسباب تنعم سے بھرا پڑا ہے' مگر اس کی حرص کی' جنم کو صبر نہیں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہو گا کہ دونوں کا حکم یکساں قرار دیا جائے' پہلی صورت اضطرار کی ہے (جس میں سد رمق تک مردار کھانے کی اجازت ہے) اور دوسری اسراف و تبذیر کی۔ (جس کے لئے مجبوری کا بہانہ مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے)۔ اور بدفہمی (اسی طرح کے) مضحکہ خیز لطیفوں بلکہ ماتم انگیز حادثوں کو جنم دیا کرتی ہے' حق تعالیٰ رحم فرمائے اس پر جو انصاف سے کام لے۔

"اسلامی قوانین میں اجتہاد کا مقام" پر یہ چند مختصر اشارے عرض کئے گئے ہیں' جن میں تنگی وقت کے پیش نظر تفصیلات کے بجائے اجمال سے کام لیا ہے' اس میں شک نہیں کہ موضوع کی اہمیت شرح و بسط کی متقاضی تھی' تاہم جس چیز کا پورا ادراک ممکن نہ ہو' اسے بالکلیہ چھوڑ دینا بھی زیبا نہیں' کانی آنکھ کا رونا بھی صد غنیمت ہے' اور نادار کی کل کائنات اس کے چند آنسو ہوتے ہیں' میرا حال وہی ہے جو کسی شاعر نے کہا ہے :

عاشق کی پونجی وہ سوزدروں ہے جس کی غمازی
رخسار پر بہتے ہوئے چند آنسو کیا کرتے ہیں

الاجتہاد فی الاسلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی،

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ، وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ، اما بعد:

اسلام کی تعمیر نو کے عنوان سے جدت پسندوں کی طرف سے جن مختلف نظریات کا اظہار کیا جاتا ہے، ان کا قدر مشترک یہ ہوتا ہے کہ موجودہ اسلام اپنے اصول و فروع، کلیات و جزئیات، عقائد و اعمال، عبادات و اخلاق، معاملات و سیاسیات الغرض اپنے انفرادی و اجتماعی نظام کی ہر جہت سے عہد جدید میں ناقابل عمل ہے، اس سلسلہ میں بعض حضرات تو اسلام سے بد ظن کرنے کے لئے "غلط منطق" کا استعمال کرتے ہیں، بعض شرعی اصطلاحات کے "بگاڑنے" میں مصروف ہیں، بعض اسلام کو ملّا ازم اور قدامت پرستی کا خطاب دے کر اپنی خوش طبعی کا مظاہرہ فرماتے ہیں، لیکن بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو اسلام کی بعض بنیادی اصطلاحات سے ناواقف، یا پوری طرح واقف نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہیں، انہی اصطلاحات میں سے ایک "مسئلہ اجتہاد" ہے، بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہے کہ "اسلام میں اپنی ضروریات کے موافق کتر بیونت یا ترمیم و اضافہ کرتے رہنے کا نام "اجتہاد" ہے۔ انہیں علمائے کرام سے یہ

شکایت رہتی ہے کہ وہ ایسے اجتہاد کی اجازت کیوں نہیں دیتے، ایک صاحب بڑے درد سے لکھتے ہیں:

"خود اسلامی دنیا کے اندر کی موجودہ صورت حال بڑی افسوس ناک ہے، روایت پسند علما کے نزدیک کئی صدیاں پہلے "اسلامی تخلیقی فکر" ایک مقام پر آکر رک گیا ہے، علماً زمانے کے ساتھ چلنے سے انکار کرتے ہیں، ان کے نزدیک اس تمام مدت میں نہ تو کوئی انقلابات ہوئے ہیں اور نہ اسلام کی نئی تعمیر کی کبھی ضرورت پیدا ہوئی ہے، دوسری طرف جدید صاحب علم میں صبر وضبط نہیں، وہ یہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں کہ آخر روایت پسند علما کا کیا موقف ہے؟ چنانچہ ان دو فریقوں میں جو کہ "کٹرپن" اور "آزادی فکر" کے دو نقطہ ہائے نظر کے حامل ہیں، کسی قسم کے باہمی تعاون کا بہت ہی کم امکان نظر آتا ہے"۔ (ماہنامہ "فکر و نظر" ص ۶۶۲، اپریل ۱۹۶۷ء)

اس تحریر میں علما کرام کی طرف جو چار دعوے منفی نوعیت کے منسوب ہوئے ہیں، اسے تو صرف "صبر وضبط" کی کمی کی بنا پر "غلط فہمی" کہا جا سکتا ہے مگر یہ غلط فہمی بعض ایسے حضرات کے یہاں بھی پائی جاتی ہے جن کے علم و فضل کے پیش نظر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ معاملہ کی نوعیت کو بہتر سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، چنانچہ ایک اونچے درجے کے قابل احترام بزرگ فرماتے ہیں:

"ایک طرف توروایت پرست علما کا طبقہ ہے جو اپنے ائمہ کے اقوال میں شوشہ بھر تبدیلی روا نہیں رکھتے اور ان کی آرا کو پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں، ان کی دانست میں دین اپنی تمام جزئیات کے ساتھ مدت مدید سے اپنی آخری صورت اختیار کر چکا ہے، اور اس میں مزید تفکر و تفقہ کی گنجائش نہیں، یہ طبقہ عموماً علوم جدیدہ کی مبادیات سے بھی نا آشنا ہے، اور عصر جدید کے تقاضوں سے بے خبر، اسلاف کے صحیفوں سے سرِ مو اختلاف ان کی نظر میں کفر کے مترادف ہے، دوسری طرف وہ جدت پسند طبقہ ہے جو مغرب کی خیرہ کن مادی ترقی سے مرعوب ہے، اور دبستان جمود کے خلاف رد عمل میں دین سے بیزاری کی حد تک پہنچ چکا ہے، یہ طبقہ اشتراکی کوچہ گردوں کا ہمنوا بن کر مذہب کو فطری ارتقا کے راستے کا روڑا سمجھتا ہے، اس کے نزدیک لادینی مملکت ہی ہمارے تمام دکھوں کا مداوا ہے"۔

(پیش لفظ مجموعہ قوانین اسلام از عالی جناب جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب)

حالانکہ علما کرام سرے سے اجتہاد کے منکر نہیں، نہ کسی صاحب بصیرت کو اس سے انکار ہو سکتا ہے نہ کسی قابل اعتماد عالم نے کبھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ جدید پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کرنا گناہ ہے، البتہ علمائے کرام ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے موجب اجتہاد کے لئے موقع و محل اور اہلیت کا لحاظ

رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، وہ اپنے جدت پسند بھائیوں سے صرف اتنی درخواست کرتے ہیں کہ بسم اللہ! اجتہاد کیجئے، لیکن خدارا پہلے اجتہاد کی اہلیت پیدا کر لیجئے، اور اتنی تحقیق فرما لیجئے کہ جہاں ہم اجتہاد کا شوق فرماتے ہیں وہ اجتہاد کا محل بھی ہے یا نہیں؟ اس صورت حال کے پیش نظر مناسب معلوم ہوا، کہ محل اجتہاد اور اہلیت اجتہاد پر چند حروف لکھے جائیں کیا بعید ہے کہ کسی انصاف پسند بزرگ کو صحیح فہم کی توفیق نصیب ہو جائے - وماذالک علی اللہ بعزیز -

الف : محل اجتہاد : .... "ہمارے سامنے جب کوئی ایسا واقعہ پیش آئے جس کے بارے میں خدا اور رسول کا صریح حکم موجود نہ ہو، وہاں اپنے علم و فہم اور وسعت و طاقت کی امکانی حد تک یہ معلوم کرنا کہ شرعی نصوص کی روشنی میں اس کا حکم کیا ہے"؟ اسے شرعی اصطلاح میں اجتہاد کہا جاتا ہے -

(ملاحظہ ہوں کتب اصول فقہ بحث اجتہاد)

چنانچہ :

> "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر اور قاضی بنا کر بھیجا تو دریافت فرمایا کہ معاذ! جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو گا تو فیصلہ کیسے کرو گے؟ عرض کیا: اللہ تعالیٰ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا، فرمایا: اگر اس کا حکم کتاب اللہ میں تمہیں نہ ملے؟ عرض کیا: اس صورت میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ کروں گا، فرمایا: اگر اس کا حکم تمہیں سنت

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) میں بھی نہ ملے؟ عرض کیا اس صورت میں اجتہاد کی پوری قوت استعمال کروں گا، اور حکم الٰہی کی دریافت میں ذرا کوتاہی نہیں کروں گا" - یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الحمد الله الذی وفق رسول رسول الله صلی الله علیه وسلم لمایرضی به رسول الله--" (اس اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے رسول اللہ کے فرستادہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ طریقہ کی توفیق عطا فرمائی" -

(مشکوۃ المصابیح ص ۳۲۴)

آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد امت کی رشد و ہدایت اور کامل راہنمائی کے لئے کتاب اللہ اور سنت رسول دو چیزیں موجود تھیں، لیکن ایک ایسی امت جسے قیامت تک رہنا اور مختلف اقوام و ملل پر حاوی ہونا تھا جس کی ترکیب مختلف قسم کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے افراد سے ہونی تھی، اس کے بارے میں یہ خطرہ بہر حال موجود تھا کہ ان کے درمیان کسی وقت کتاب و سنت کی تعبیر و تشریح میں ایسا اختلاف پیدا نہ ہو جائے جس سے ایک طرف امت کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے اور دوسری طرف کتاب و سنت کے نام پر ایسے نظریات پیش کئے جانے لگیں جو "پیغمبرانہ دعوت" اور "اسلامی مزاج" ہی سے متصادم ہوں اور حق و باطل کا امتیاز ہی اٹھ جائے، اس لئے ضرورت تھی کہ آنے والی امت کے لئے کتاب و سنت کی تشریح و تعبیر میں حق و باطل اور صحیح و سقیم کے جانچنے کا ایک

معیار مشخص کر دیا جائے، تاکہ جس طرح کتاب و سنت صراط مستقیم کے لئے مینارۂ نور ہیں، جن کی روشنی میں امت قیامت تک صراط مستقیم پر چلتی رہے گی، اسی طرح کتاب و سنت کی تشریح و تعبیر کے لئے بھی ایک شاہراہ مقرر کر دی جائے، جس سے امت تحریف اور فکری انتشار کی مختلف وادیوں میں بھٹکنے سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے، اس شاہراہ کا سنگ میل "اجماع امت" قرار دیا گیا، جسے قرآن حکیم نے "سبیل المومنین" کے موجز لفظ میں بیان فرمایا ہے:

"ومن يشاقق الرسول من بعد ماتبين له الهدٰى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولٰى و نصله جهنم و ساء ت مصيرا"۔

ترجمہ: اور جو شخص رسول ﷺ کی مخالفت کرے گا، بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور "مسلمانوں کا رستہ" چھوڑ کر دوسرے راستے ہو لیا ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے، اور وہ بہت بری جگہ ہے۔"

یہ "المؤمنین" جن کے "اجماعی" راستے کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کرنے والوں کو قرآن حکیم نے دنیا میں توفیق الٰہی سے محروم ہونے اور آخرت میں واصل بجہنم ہونے کی خبر دی ہے، جانتے ہو کون ہیں؟ اول شیخین، پھر خلفاء راشدین، پھر جماعت صحابہ، پھر خیر القرون پھر ہر صدی کے وہ "سلف صالحین" جو پوری احتیاط سے پھونک پھونک کر صحابہؓ کے نقش قدم پر چلے، علیٰ

حسب المراتب ان ہی حضرات کا "اجماعی راستہ" سبیل المومنین کا مصداق ہے، جسے قرآن حکیم حق وباطل کی میزان قرار دیتا ہے، اور صحابہؓ، تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کے اجماعی مسائل کو چھوڑ کر نئی راہ نکالنے والوں کو بے توفیق، باطل پرست اور دنیا و آخرت میں زیاں کار بتلاتا ہے، قرآن کے بیان فرمودہ "سبیل المومنین" کی تشریح خود صاحب قرآن ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے سنئے:

۱:....."انی لا ادری مابقائی فیکم فاقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر" — (مشکوۃ المصابیح ص ۵۶۰)

۲:....."فانه من یعش منکم بعدی فسیری اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ، وایاکم و محدثات الامور، فان کل محدثة بدعة و کل بدعة ضلالة" —(مشکوۃ المصابیح ص ۳۰)

ترجمہ: مجھے معلوم نہیں میں تمہارے درمیان کتنی مدت موجود رہوں گا، اس لئے ان دو بزرگواروں کی اقتداء کرنا جو میرے بعد یکے بعد دیگرے خلیفہ ہوں گے یعنی ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما)۔

ترجمہ: "تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہا وہ بہت سا (نظری اور عملی) اختلاف دیکھے گا پس (اندریں حالت) تم میری سنت کو اور خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑلینا،

اسی کو تھامے رکھنا اور دانتوں سے مضبوط پکڑے رکھنا،
اور (خلاف سنت) نئی نئی من گھڑت باتوں سے بچے رہنا،
اس لئے کہ ہر نئی من گھڑت چیز بدعت ہے اور ہر بدعت
گمراہی ہے (اور گمراہی کا انجام جہنم ہے کمافی روایة)"

آپ دیکھ رہے ہیں کہ جو بات قرآن حکیم نے "سبیل المومنین" سے ہٹ کر چلنے والوں کے بارے میں ارشاد فرمائی اسی کی وضاحت اس حدیث پاک میں ارشاد فرمائی گئی ہے، اس لئے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اگرچہ خود صاحب وحی نہ تھے لیکن فکری و عملی اعتبار سے صاحب شریعت ﷺ کا کامل نمونہ، منشائے نبوت کے مزاج شناس اور وحی الٰہی کے اولیں مخاطب تھے، ان کی نظر آنحضرت ﷺ کے ایک ایک اشارے پر جمی ہوئی تھی، وہ شریعت کے اصول و فروع، کلیات و جزئیات اور دقائق و اسرار کی آخری بلندیوں تک رسائی رکھتے تھے، امام الہند حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کے لفظوں میں:

"ایام خلافت بقیہ ایام نبوت بودہ است گویا در ایام نبوت
حضرت پیغامبر ﷺ تصریحا بزبان مے فرمود و در ایام
خلافت ساکت نشستہ بدست و سر اشارہ میفرماید۔"

(ازالة الخفاص ۲۵ ج۱)

ترجمہ: "خلافت راشدہ کا دور، دور نبوت کا تتمہ تھا، گویا
دور نبوت میں آنحضرت ﷺ صراحۃً زبان سے حکم فرماتے
تھے، اور دور خلافت میں خاموش بیٹھے سر اور ہاتھ کے اشاروں

سے سمجھاتے تھے"۔

پس جس طرح "نبی" وحی الٰہی کا راز دار اور منشائے خداوندی کا مزاج شناس ہوتا ہے، اس کی جانب سے وحی الٰہی کی جو تفسیر کی جائے گی وہ امت کے لئے قطعی ہوگی، اسی طرح خلفائے راشدین کے دور میں کتاب وسنت کے اشارات کی جو تفسیر و تشریح کی گئی بعد کی امت کے لئے وہ واجب القبول ہوگی، اور تغیر و تبدل سے بالاتر۔

دوسری صدی کے مجدد خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے:

"سن رسول ﷺ وولا ة الامر من بعد ہ سننا، الاخذبها تصديق لكتاب الله واستكمال لطاعته وقوة على دين الله، ليس لاحد تغييرها ولا تبديلها ولاالنظر فيما خالفها، من اقتدىٰ بها فهو مهتد ومن استنصربها، فهومنصور ومن يخالفها اتبع غير سبيل المؤمنين وولاه الله تولىٰ واصلاه جهنم وسا ٕت مصيرا—" (ازالة الخفأ ص۱۷۳ ج۱)

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ نے اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے جو سنتیں جاری فرمائیں انہیں اختیار کرنا، کتاب اللہ کی تصدیق، حق تعالیٰ کی کمال اطاعت، اور دین خداوندی کی تقویت کا موجب ہے، کسی کو نہ ان کے تغیر و تبدل کا حق ہے، نہ ان کی مخالف رائے کسی درجہ میں قابل

التفات ہے، جس نے ان کی اقتدا کی وہ ہدایت پر ہے، جس نے ان کے ذریعہ نصرت طلب کی وہ منصور ہے، اور جو شخص ان کی مخالفت کرے گا اس نے مؤمنین کے راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا، اور اسے اللہ تعالیٰ نے اسی طرف دھکیل دیا جس طرف اس کا منہ ہے، اور اسے اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کرے گا، اور وہ بہت بری جگہ ہے-"

خلفائے راشدین کے یہی فیصلے جنہیں جماعت صحابہ نے بالاتفاق قبول کیا آئندہ "اجماعِ امت" کی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے "سبیل المومنین" اور صراط مستقیم کا نشان بن گئے، بعد میں آنے والی امت ان کے نشان قدم کی پیروی میں کسی مختلف فیہ مسئلہ کے ایک پہلو پر متفق ہو جائے تو یہ خیر کی علامت ہو گی، لیکن ان کی شاہراہ سے ہٹ کر نہ کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے، نہ خدا ورسول کے نزدیک اس کی کوئی قیمت ہے، بلکہ ایسا فیصلہ "اتباع غیر سبیل المومنین" کا مصداق، "کل بدعة ضلالة" کا نشان "نصله جهنم" اور "کل ضلالة فی النار" کا سزاوار ہو گا-

تیسری صدی کے مجدد امام شافعیؒ کتنی حکیمانہ بات فرمایا کرتے تھے کہ شریعت اوپر سے نازل ہوئی ہے اس لئے شرعی مسائل میں الاعلیٰ ثم الاعلیٰ کی فطری ترتیب ملحوظ رکھی جائے گی-

چنانچہ امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

"العلم طبقات، الاولیٰ: الکتاب و السنة اذا ثبتت

السنة، ثم الثانية: الاجماع فيما ليس فيه كتاب ولاسنة، والثالثة: ان يقول بعض اصحاب النبی ﷺ ولانعلم له مخالفا منهم، والرابعة: اختلاف اصحاب النبی ﷺ— والخامسة: القياس على بعض هذه الطبقات—ولايصارالیٰ شئی غير الكتاب و السنة و هما موجودان، وانما يؤخذ العلم من اعلیٰ— (ازالۃ الخفا ص۱۵ ج۱)

ترجمہ: علم(احکام شرعیہ) کے چند طبقات ہیں اول، کتاب وسنۃ ثابتہ، دوم: اجماع امت، جہاں کتاب وسنت کی تصریح نہ ہو، سوم: آنحضرت ﷺ کے بعض صحابہ کا قول، جب کہ اس کا خلاف کسی صحابی سے منقول نہ ہو (یہ اجماع سکوتی کہلاتا ہے) چہارم: صحابہ کرام کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو(وہاں اجتہاد سے اقرب الی الکتاب والسنۃ کو اختیار کیا جائے گا، مگر ان کے تمام اقوال کو چھوڑ کر نئی رائے کا اختراع جائز نہ ہوگا یہ اجماع مرکب کہلاتا ہے) پنجم: مذکورہ بالا طبقات میں سے کسی پر قیاس کرنا، اور صریح کتاب وسنت کے موجود ہوتے ہوئے کسی دوسری چیز کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا(اور یہ خود شرعاً ناممکن ہے کہ صریح کتاب و سنت کے خلاف اجماع صحابہ قائم

ہو جائے)، علم تو بس اوپر سے لیا جائے گا (اور مذکورہ بالا طبقات میں 'اوپر سے نیچے" کی ترتیب ملحوظ رکھی جائے گی)

اس سے ظاہر ہے کہ اجتہاد کی ضرورت صرف اسی موقع پر پیش آتی ہے جس کا صریح حکم نہ تو کتاب اللہ میں موجود ہو، نہ آنحضرت ﷺ کی سنت ثابتہ میں، اور نہ صحابہ کرامؓ اور خیر القرون کے دور میں اس پر کوئی اتفاقی فیصلہ -اجماع- ہوا ہو- ورنہ اگر کسی مسئلہ کا حل خود کتاب اللہ میں موجود ہو، یا آنحضرت ﷺ اس کا صاف صاف حکم امت کو بتلا چکے ہوں، یا صحابہ کرامؓ جو قرآن حکیم کے اولین مخاطب اور آنحضرت ﷺ سے براہ راست قرآن و سنت اور دین و شریعت کا فہم حاصل کرنے والے تھے، اس کے بارے میں کوئی متفقہ فیصلہ کر چکے ہوں تو ایسے موقع پر اجتہاد صرف ایک لایعنی فعل ہی نہیں بلکہ ایک ناروا جرأت بھی ہے، کتاب و سنت اور اجماع امت کے مقابلے میں اجتہاد کرنے کے معنی تو یہ ہوں گے کہ اس مجتہد کو نہ خدا کی کتاب پر اعتماد ہے، نہ اس کے نبیؐ پر، اور نہ اس کے خیال میں صحابہ کرامؓ کا مجموعی علم ہی کوئی وزن رکھتا ہے-

حجتہ الاسلام امام غزالیؒ لکھتے ہیں :

"جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ امور عادیہ میں اتباع سنت کی ترغیب کے لئے بیان کیا ہے- ورنہ جن امور کو عبادت سے تعلق ہے اور ان کا اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے، ان میں بلا عذر اتباع چھوڑ دینے کی سوائے "کفر خفی یا حماقت جلی" کے اور کوئی وجہ ہی سمجھ میں نہیں آتی-"

سوچنا چاہئے کہ اسلام میں اجتہاد کا مقصد کسی غیر منصوص واقعہ سے متعلق حکم الٰہی کا دریافت کرنا ہے، یا حق تعالیٰ کے منصوص احکام سے جان چرانا اور انہیں کسی نہ کسی حیلے بہانے سے ٹالنے کی کوشش کرنا؟ اگر مقصدِ اجتہاد واقعتاً حکم الٰہی کا دریافت کرنا ہے، تو جس صورت میں پہلے ہی سے اللہ و رسول کا صریح اور صاف حکم صریح موجود ہو وہاں اجتہاد کرنا کتنی غیر معقول اور احمقانہ حرکت کہلائے گی؟ اور اگر اجتہاد سے مقصد حکم خداوندی کو درمیان سے ہٹا کر اس کی جگہ "فرمان قیصری" کا نفاذ ہے، تو ایسا اجتہاد ہماری بحث ہی سے خارج ہے، اسلام میں ایسے اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں، اسلام ایسے نام نہاد اجتہاد کو "تحاکم الی الطاغوت" اور پرلے درجے کی گمراہی قرار دیتا ہے، جو خالص منافقین کا طرز عمل تو ہو سکتا ہے لیکن کسی مومن سے اس کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"الم تر الی الذین یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیك وما انزل من قبلك یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا به ویرید الشیطان ان یضلھم ضلالا بعیدا، واذا قیل لھم تعالوا الیٰ مآ انزل الله والی الرسول رأیت المنافقین یصدون عنك صدودا" — (النساء:۶۰)

ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ کی طرف

نازل کی گئی اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئی (پھر اس پر یہ حالت ہے کہ) اپنے مقدمے شیطانوں کے پاس لیجانا چاہتے ہیں (کیونکہ غیر شرع کی طرف مقدمے لے جانے کے لئے شیطان سکھاتا ہے، پس اس پر عمل کرنا ایسا ہے جیسے شیطان ہی کے پاس مقدمے لے گئے)، حالانکہ ان کو یہ حکم ہوا ہے کہ اس کو نہ مانیں اور شیطان ان کو بھٹکا کر دور لے جانا چاہتا ہے، اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور رسول کی طرف، تو آپؐ منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ وہ آپ سے پہلو تہی کرتے ہیں۔" (ترجمہ حکیم الامت تھانویؒ)

الغرض اس میں شبہ نہیں کہ اجتہاد بھی اسلام کا ایک شرعی حکم اور بنیادی اصول ہے، مگر اسلام میں اس کے حدود بھی متعین ہے، جیسے دوسرے اساسی احکام کے، اس لئے ایسا بے موقع اجتہاد جس سے کتاب و سنت کے نصوص باطل ٹھہریں، صحابہؓ و تابعینؒ کے اجماعی فیصلے غلط قرار پائیں، اور مجموعی طور پر احکام شرعیہ سے اعتماد اٹھ جائے، یہ اجتہاد نہیں بلکہ تلاعب بالدین (دین کے ساتھ دل لگی) ہے جس کی اجازت نہ قرآن و سنت سے حاصل ہے نہ عقل اس کی تائید کرتی ہے نہ کسی دانشمند نے اسے کبھی اجتہاد کہا ہے، قرآن و حدیث میں تحریف، الحاد، اور تلبیس کے الفاظ اسی قسم کے نام نہاد اجتہاد کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔

اجتہاد کے سلسلہ میں خلفاء راشدینؓ اور ائمہ مجتہدینؒ کا طرز عمل کیا تھا؟ ذیل کی تصریحات سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

حافظ ابن قیم "اعلام الموقعین" میں لکھتے ہیں :

"ابو عبیدؒ نے "کتاب القضا" میں میمون بن مہران سے روایت کیا ہے، کہ حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں جب کوئی مقدمہ لایا جاتا تو کتاب اللہ میں نظر کرتے، اگر اس میں حکم مل جاتا تو فیصلہ کر دیتے، ورنہ سنت رسول اللہ ﷺ میں غور کرتے، اگر اس میں اس مسئلہ کا حل مل جاتا تو فیصلہ کر دیتے، اور اگر انہیں اس بارے میں فیصلۂ نبوی کا علم نہ ہوتا تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ فرمایا؟ بسا اوقات لوگ بتلاتے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا تھا، پھر اگر آنحضرت ﷺ کی کوئی سنت بھی نہ ملتی تو علمی اور فقہی اعتبار سے سر بر آوردہ لوگوں کو جمع فرما کر ان سے مشورہ کرتے، پھر جب کسی فیصلے پر ان کی رائے متفق ہو جاتی تو اسے نافذ کر دیتے، ورنہ لوگوں کو جمع کرتے اور جب ان کے مشورہ سے کسی فیصلے پر اتفاق ہو جاتا تو اسے نافذ کر دیتے۔" (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۶۳ و جامع بیان العلم)

اس سے ہمیں خلفائے راشدین کے طرز عمل کے سمجھنے میں مدد ملتی

ہے، گویا یہ طے شدہ اسلامی اصول تھا، کہ پہلے کتاب و سنت کے فیصلوں کو نافذ کیا جائے، اگر کسی معاملہ میں کتاب و سنت کا صریح حکم موجود نہ ہو تو سربر آوردہ اہل علم و دیانت سے مشورہ لیا جائے، اور قرآن و سنت کی روشنی میں جو اتفاقی فیصلہ سامنے آئے اسے نافذ کیا جائے، اور اگر اہل علم کسی فیصلے پر اتفاق نہ کر سکیں تو مجتہد جس فیصلے کو کتاب و سنت سے قریب تر دیکھے اسے اختیار کرلے اور یہی مسئلہ محل اجتہاد قرار پائے گا، اس لئے فقیہ الامت حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ لوگوں کو نصیحت فرمایا کرتے تھے :

"تم میں سے جو شخص قضاء (فصل خصومات) میں مبتلا ہو جائے، اسے چاہئے کہ کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کرے، اگر کتاب اللہ میں اس کا حکم نہ ہو تو آنحضرت ﷺ کے فیصلے کے موافق فیصلہ کرے، اور اگر فیصلۂ نبویؐ بھی نہ ہو تو صالحین کے فیصلے کے موافق فیصلہ کرے، اور اگر ان کا فیصلہ بھی نہ ہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔"

(مفتاح الجنۃ للسیوطی ص ۳۲ و اعلام الموقعین)

یہ "ما قضیٰ به الصالحون" (صالحین کا فیصلہ) ہی "اجماع امت" کہلاتا ہے جب کہ سلف صالحین اور ائمہ عدل میں سے کسی نے اس فیصلہ سے اختلاف نہ کیا ہو، چنانچہ امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو لکھا تھا :

"جب تمہیں کوئی حکم کتاب اللہ میں مل جائے تو

اس پر فیصلہ کردو، پھر کسی اور چیز کی طرف التفات نہ کرو، اور اگر کوئی ایسا قضیہ پیش آئے جس کا (صریح) حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو سنت رسول اللہ ﷺ پر فیصلہ کرو، اور اگر ایسا مقدمہ آئے جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ سنت رسول اللہؐ میں، تو صالحین اور ائمۂ عدل کے فیصلے کے موافق فیصلہ کرو۔ (اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اجماع الناس (اجماع امت) کے موافق فیصلہ کرو) اور اگر ایسا واقعہ پیش آئے، جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ سنت رسول اللہؐ میں، اور نہ تم سے پہلے اس میں کسی نے کلام کیا ہو، اس صورت میں دل چاہے تو اجتہاد کی ہمت کرو یا اس سے باز رہو، اور میرا خیال ہے کہ تمہارے لئے باز رہنا ہی خیر کا باعث ہے۔"

(اعلام الموقعین ج ا ص ۶۲)

خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیزؒ نے عدی بن ارطاۃ کو لکھا:

"امابعد! اعلیٰ درجہ کا فیصلہ ان احکام کی اتباع ہے جو کتاب اللہ میں پائے جاتے ہیں، پھر سنت رسول اللہ کے موافق فیصلہ کرنا پھر ائمہ ہدیٰ کے فیصلے، پھر اہل علم واہل رائے سے مشورہ لینا۔" (اخبار القضاۃ ص ۷۷ ج ا)

خلفائے راشدین کے بعد ائمہ مجتہدین بھی اسی اصول پر قائم تھے، ائمہ اربعہ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ وہ سب سے پہلے کتاب اللہ کو لیتے تھے،

پھر سنت نبوی کو اختیار کرتے تھے، پھر صحابہؓ و تابعین کے فیصلوں پر عمل کرتے تھے اور بالکل ناگزیر اور آخری صورت میں کتاب و سنت کو سامنے رکھ کر مسائل کا استخراج کرتے تھے، چنانچہ امام ابو حنیفہؒ اپنے "فقہی منہاج" کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے :

"میں پہلے کتاب اللہ کو لیتا ہوں، اگر مجھے کوئی حکم کتاب اللہ میں نہیں ملتا تو سنت رسول اللہؐ کو لیتا ہوں، اور اگر کوئی مسئلہ نہ کتاب اللہ میں ہو نہ سنت رسول اللہؐ میں تو میں قول صحابہ پر عمل کرتا ہوں (اور در صورت اختلاف اپنے اجتہاد سے) اقرب الی الکتاب والسنۃ کو ترجیح دیتا ہوں چنانچہ جس قول کو چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، مگر صحابہ کے اقوال سے باہر نہیں جاتا اور جب معاملہ اقوال تابعین تک پہنچے تو خود اجتہاد کرتا ہوں۔"

(الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الاربعۃ لابن عبد البر ص ۱۴۲ نیز ملاحظہ ہو اعلام الموقعین وجامع بیان العلم، میزان کبریٰ للشعری، مفتاح الجنۃ)

امام مالکؒ خاص طور پر تلقین فرمایا کرتے تھے :

"لوگوں کی ادھر ادھر کی رائے سے اجتناب کیا کرو، الا یہ کہ ان کا کسی مسئلہ پر اجماع ہو، اور اسی کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور جو تمہارے نبی ﷺ کی جانب سے آیا ہے اور اگر تمہیں کتاب

وسنت کے معنی سمجھ میں نہ آئیں تو اپنے علماء کے سپرد کردو، اوران سے جھگڑا نہ کرو، کیونکہ دین میں جدال کرنا نفاق کا بقیہ ہے، (امام امالک کے شاگرد) ابن قاسمؒ فرماتے تھے کہ بلکہ پورا نفاق ہے - اس لئے کہ حق کے معاملہ میں علماء کے ساتھ بے معنی کٹ حجتی سے پیش آنا خود آنحضرت ﷺ کے ساتھ مجادلہ کرنے کے مشابہ ہے، کیونکہ حق تو آنحضرت ﷺ ہی کا مشروع فرمودہ ہے، اگرچہ علماء سے جھگڑنا نبیؐ سے جھگڑنے کی بہ نسبت کم درجہ کا نفاق کہلائے گا"

امام شافعیؒ تو کتاب وسنت کے مقابلہ میں اجتہاد (قیاس) کو بالکل ہی باطل قرار دینے میں اتنی شہرت رکھتے ہیں کہ مستشرقین اوران کے تلامذہ متجددین بھی اس کی کوئی توجیہ نہیں کرسکے، فرمایا کرتے تھے :

"حدیث رسول اللہ کو لازم پکڑو، اور رائے کو خیرباد کہو" نیز فرماتے تھے، جو چیز بھی امر نبوی کے خلاف ہو وہ بالکل ساقط ہے، وہ کسی بھی رائے اور قیاس سے سیدھی نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قول نبویؐ سے تمام عذر قطع کردیئے، آپؐ کے امرونہی کے بعد کسی کے امرونہی کی گنجائش نہیں -" (میزان کبریٰ ص ۵۰ ج ۱)

امام احمدؒ تو اجتہاد کے معاملہ میں اس سے زیادہ نازک "احساسات" رکھتے تھے، عصر حاضر کے مصنف شیخ ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں :

"رہا امام احمد کے فقہ کی نزاہت انسانی رائے سے پاکیزگی کا معاملہ - پس وہ تو اس کے بے حد حریص تھے کہ سنت سے نکلنے نہ پائیں، وہ اپنے تمام فقہ میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کے متبع تھے، جن واضح آراء کی وہ تخریج کرتے ان کی اساس بھی آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ وتابعینؒ سے روایت شدہ احادیث و آثار پر ہوتی تھی، ان کو اس امر کا شدید اہتمام رہتا تھا، کہ آنحضرت ﷺ کی کسی حدیث کو رد نہ کریں، الا یہ کہ اس سے قوی تر اس کی معارض ہو، اور فرمایا کرتے تھے "جس نے آنحضرت ﷺ کی حدیث کو رد کردیا وہ تباہی کے کنارے پر کھڑا ہو گیا ہے" نیز فرماتے تھے: "میں نے آنحضرت ﷺ کی جتنی احادیث لکھی ہیں ان سب پر عمل کیا ہے" اور جب انہیں کسی مسئلہ میں نہ حدیث ملتی نہ صحابہ کرامؓ کی سنت تو ائمہ سابقین کے منہاج پر مسئلہ کی تخریج میں اجتہاد فرماتے، اور اجتہاد میں بھی ائمہ سابقین کی راہ کو چھوڑ کر کوئی نئی راہ نہ نکالتے، جس مسئلہ میں یا اس کے منہاج میں کسی نے اب تک کلام نہ کیا ہو، اس میں اجتہاد سے منع فرماتے (اور توقف کرتے) اسی لئے اپنے خاص شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے، ایسے مسئلہ میں لب کشائی سے بچو! جس میں کوئی امام نہ ہو (یعنی اس سے پہلے کسی نے

اس میں بحث نہ کی ہو!" (احمد بن حنبل حیاتہ وفقہہ وآرائہ ص ۷۹)

خلفائے راشدین اور ائمہ ہدیٰ کی ان تصریحات سے واضح ہوا کہ کتاب وسنت اور اجماع امت کے مقابلے میں اجتہاد کی گنجائش نہیں، اجتہاد کی ضرورت صرف اسی صورت میں پیش آتی ہے جبکہ کسی حادثہ کا حکم کتاب وسنت کے نصوص اور صحابہؓ وتابعینؒ کے متفقہ فیصلے سے ثابت نہ ہو۔ ورنہ اجتہاد بمقابلہ نص، قطعاً حرام، باطل اور مردود ہے، اور اس اصول میں بجز اہل ضلالت کے کسی کا اختلاف ہمیں معلوم نہیں۔

شیخ ابن ھمامؒ فرماتے ہیں کہ اجتہاد کی چار قسمیں ہیں۔ واجب علی العین۔ واجب کفایہ، مباح اور حرام۔ اور آخری قسم کے بارے میں ان کی تصریح یہ ہے:

"والی حرام وھوالاجتھاد فی مقابلةدلیل قاطع من نص کتاب و سنة او اجماع"۔

ترجمہ: اور اجتہاد حرام وہ ہے جو کسی دلیل قطعی یعنی کتاب وسنت کی نص صریح یا اجماع کے مقابلہ میں ہو"

(تیسیر شرح تحریر لابن امیر حاج ص ۱۸۰ ج ۴)

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"محل اجتہاد صرف وہی حکم شرعی ہے جس میں دلیل قطعی موجود نہ ہو۔ اور نماز پنجگانہ، زکوٰۃ کی فرضیت اور شریعت کے وہ روشن اور واضح مسائل جن پر امت کا اتفاق

ہے، ان پر دلائل قطعیہ موجود ہیں، ان میں مخالفت کرنے والا مجرم ہے اس لئے کہ یہ امور محل اجتہاد نہیں"۔

(المستصفی من علم الاصول ص ۱۰۳ ج ۲)

شارح مجلّہ شیخ محمد خالد اتاسی لکھتے ہیں، :

"دفعہ ۱۴- مورد نص میں اجتہاد کی گنجائش نہیں-احکام شرعیہ بعض تو ایسے ہیں، جو کتاب سنت میں منصوص ہیں، سنت خواہ متواتر ہو، یا مشہور، یا خبر واحد، اور بعض وہ ہیں جو منصوص نہیں، بلکہ ادلۂ شرعیہ سے قیاس کے ذریعہ معلوم کئے گئے ہیں، پس ہر وہ اجتہاد جو منصوص کے معارض ہو وہ باطل ہے"۔ (شرح مجلّہ ص ۴۰ ج ۱)

اجتہاد کا محل قرآن وسنت اور صحابہ کرامؓ وائمہ عظام کے ارشادات کی روشنی میں متعین ہو گیا، اب ذرا متجددین کے اجتہادی دعوؤں کو اس "میزان عدل" میں تولئیے، کیا آپ انہیں دعوائے اجتہاد میں حق بجانب پائیں گے؟ کیا اجتہادی نشہ میں قرآن کریم کے قطعی مسائل، سنت نبوی کی تصریحات اور اجماع امت کے مصدقہ امور کو تحریفی اجتہاد کا نشانہ نہیں بنایا جاتا؟ اسلام کے اصول وکلیات سے لیکر فروع وجزئیات تک ایک ایک میں کیڑے نہیں نکالے جاتے-؟

کاش! ہمارے تجدد پسند احباب صحیح اسلامی تخلیقی فکر کی صلاحیت رکھتے تو انکی ذہانت ملک وملت کے مفید کاموں پر صرف ہوتی اور وہ ملت اسلامیہ کی ان

مشکلات کے حل کی طرف توجہ فرماتے، جو اغیار کی ذہنی غلامی، اندھی تقلید، اور مکمل سپردگی کی وجہ سے رونما ہوئی ہیں، وہ بلند نظری سے کام لیتے تو اپنی صلاحیتیں قوم کے ذہن و فکر کو غلط نظام ہائے زندگی سے موڑ کر اسلام کی طرف لانے اور مغرب سے کاٹ کر محمد ﷺ سے ان کا رشتہ جوڑنے میں صرف کرتے، وہ دور جدید کی جاہلیت پر ایسی کاری ضرب لگاتے جو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن ثابت ہوتی، وہ مادیت میں سراپا غرق "انسانیت" کو اس بھنور سے نکال کر روحانیت کے آب طہور میں غوطہ دیتے، وہ بندوں کے دروازے پر جھکی ہوئی انسانیت کو پھر سے رب العالمین کے در پر سربسجود ہونے کی دعوت دیتے، وہ دنیوی زندگی کے فانی لمحات پر قناعت کرنے والی بھٹکی ہوئی انسانیت کو "وان الدار الاخرة لھی الحیوان لو کانوا یعلمون" (اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے کاش وہ جانتے) کی حقیقت سے رمز آشنا کراتے، انہیں چشم بصیرت نصیب ہوتی تو موجودہ دور کی حرمان نصیبی کا اصل راز ان پر کھلتا، وہ یہ جان لیتے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کن بنیادوں پر اٹھائی جاتی ہے- انہیں معلوم ہو جاتا کہ اسلام دنیا میں کس انقلاب کا داعی ہے، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا، بقول علامہ اقبالؒ :

خرمانتواں یافت ازاں خار کشتیم
دیبا نتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم

جس "اسلامی تخلیقی فکر" اور اجتہاد کا بڑے خوش کن عنوان سے اعلان ہوتا رہا- اب تک بجز ملت اسلامیہ کو ذہنی انارکی یا آوارگی میں مبتلا کرنے، اسلام

سے بد ظن کرنے، اسلامی احکام کا مذاق اڑانے، کتاب و سنت کی تصریحات کو جھٹلانے، اور اسلاف امت کی تحمیق کے سوا اس کا کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوا۔

ب : اہلیت اجتہاد :..... محل اجتہاد کے بعد اہلیت اجتہاد کا مسئلہ بھی معمولی اہمیت کا حامل نہیں، جب ہم دنیا کے کسی معمولی کام کو بھی نااہل کے ہاتھوں میں دینے کے لئے تیار نہیں، تو "اجتہاد فی الدین" کا منصب جلیل نااہلوں کو تفویض کر دینا قرین عقل ہو سکتا ہے؟ جب میں ان تجدد پسند احباب کی جانب سے اجتہاد کے بلند بانگ دعوے سنتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے، کہ گویا الیکشن کے موقعہ پر صدارتی انتخاب لڑنے کے لئے ایک پرلے درجہ کا نادان، تہی دامان، اور سیاست کی ابجد سے کورا شخص میدان میں اتر آیا ہے، اور وہ اپنی خوش فہمی یا کم ظرفی کی وجہ سے یہ گمان کئے بیٹھا ہے، کہ چونکہ ملکی دستور ہر شہری کو اس انتخاب میں حصہ لینے کا حق دیتا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ پوری قوم میرا ساتھ نہ دے، اور بڑے بڑے اہل علم و صلاحیت کے مقابلہ میں مجھے کامیابی حاصل نہ ہو، میں جب ابنائے زمانہ کی اجتہادی خوش فہمی کو ان کی تہی دامنی کی ترازو میں تولتا ہوں تو مجھے بیساختہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی یاد آجاتا ہے:

"اذا وسد الامر الیٰ غیر اھلہ فانتظر الساعۃ۔"

ترجمہ: "جب معاملہ نااہلوں کے سپرد ہو جائے تو قیامت کا انتظار کرو"

اہلیت اجتہاد کی تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں، وہ اصول کی کتابوں میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، میں یہاں صرف اجمالی اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ گزشتہ

سطور میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، عمر بن عبد العزیزؒ اور امام مالکؒ کے بیانات آپ پڑھ چکے ہیں، جن میں بسلسلئہ اجتہاد رؤس الناس صالحین، ائمہ عدل، ائمہ ہدیٰ، اہل العلم اور اہل الرائے کے الفاظ آتے ہیں، ان تمام الفاظ سے اہلیت اجتہاد کا حدود داربعہ متعین ہو جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے، کہ اہل اجتہاد صرف وہ حضرات ہیں جو علم و عمل صلاح و تقویٰ، اور فہم و بصیرت میں ممتاز ہوں، ایک طرف ان کی علمی صلاحیت لائق اعتماد ہو، اور دوسری طرف ایمان و تقویٰ اور خشیت وللّٰہیت میں اس قدر راسخ ہوں کہ ان کے ضمیر ووجدان اور دین وایمان کو خریدا نہ جا سکے، "وہ آجلہ پر" عاجلہ کو ترجیح نہ دیتے ہوں، اور وہ وقتی مفاد کی خاطر ھویٰ کو ہدیٰ پر غالب نہ کردیں، ایک صحیح حدیث میں یہ مضمون صراحتاً آیا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر ہمیں کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جس میں کوئی واضح حکم امر و نہی موجود نہ ہو، اس صورت میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ فرمایا:

"شاوروا فيه الفقهاء والعابدين ولا تمضوا فيه رأى خاصة—" (طبرانی فی الاوسط)

ترجمہ: ایسے مسائل میں فقہاء و عابدین سے مشورہ کیا کرو اور ان میں شخصی رائے نافذ نہ کرو"۔

"فقہاء و عابدین"! نبوت کے انہی دو الفاظ میں اصول فقہ کی بیان کردہ طویل الذیل اجتہادی صفات سمٹ کر جمع ہو گئی ہیں، یعنی جو حضرات اعلیٰ درجہ کے فقیہ اور اونچے درجے کے عبادت گزار ہوں اہل اجتہاد اہل مشورہ اور اہل

رائے تصور کئے جائیں گے اور اس کے بر عکس جو لوگ فقہ و عبادت، علم و عمل اور تقویٰ و صلاح کے جامع نہ ہوں، وہ اور سب کچھ ہو سکتے ہوں گے، باشارۂ نبوت اجتہاد کی اہلیت سے محروم ہیں-

آج امام ابو حنیفہؒ و شافعیؒ کے اجتہاد کو چیلنج کرنا بڑا آسان کام سمجھا جاتا ہے، لیکن مدعیان اجتہاد یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ کن ظاہری اور معنوی خصوصیات کی بناپر قدرت فیاض نے ان حضرات کو شریعت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف سلام) کی ترجمانی کے لئے منتخب فرمایا تھا، اور کن حکمتوں کی بناپر اساطین امت کو ان کی اتباع پر جمع کردیا گیا؟ جو لوگ اپنی ذات پر قیاس کرتے ہوئے ائمہ مجتہدین کے بارے میں یہ بدگمانی رکھتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح محض ذاتی آراء اور قومی رسم ورواج ہی کو اجتہاد کے نام پر اسلام کی طرف منسوب کردیا کرتے تھے- انہیں امام ربانی مجدد الف ثانی (قدس سرہٗ) کا یہ ارشاد بار بار پڑھنا چاہیے :

> "جماعۂ کہ ایں اکابر دین را اصحاب رائے میدانند اگر اعتقاد دارند کہ ایشاناں برائی خود حکم میکردند ومتابعت کتاب و سنت نمی نمودند پس سواد اعظم از اہل اسلام بزعم فاسد ایشاں ضال و مبتدع باشند بلکہ از جرگہ اہل اسلام بیروں بودند، ایں اعتقاد بکند مگر جاہلے کہ از جہل خود بے خبر است یا زندیقے کہ مقصودش ابطال شطر دیں است-"

(مکتوبات مجددیہ دفتر دوم مکتوب ۵۵)

ترجمہ: "جو لوگ ان اکابر دین (ائمہ مجتہدین) کو صاحب

رائے جانتے ہیں اگر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ حضرات اپنی رائے سے حکم کیا کرتے تھے اور کتاب و سنت کی پیروی نہیں کرتے تھے تو ان کے خیال فاسد کے مطابق اہل اسلام کا سواد اعظم، گمراہ بدعتی بلکہ گروہ اہل اسلام سے خارج قرار پائے گا اس قسم کا اعتقاد وہی بے وقوف جاہل کر سکتا ہے جو اپنی جہالت سے بے خبر ہے، یا پھر ایسا زندیق جسکا مقصود یہ ہے کہ دین کا ایک بڑا حصہ باطل ہو جائے۔"

ائمہ دین کے اجتہاد پر محض ذاتی رائے، آزادانہ غور و فکر، سوچی سمجھی رائے اور شخصی رائے کی تہمت دھرنے والوں کے خلاف "جہل مرکب یا زندیقیت" کا یہ فتویٰ کسی آج کے عالم دین کا نہیں، جسے "سیاسی ملّا ازم" کی خوش گپی سے اڑا دیا جائے، بلکہ اس شیخ مجدد کا فتویٰ ہے جس کی لحد پر علامہ اقبالؒ احترام و عقیدت کے ساتھ حاضری دیتے ہیں اور پھر پورے اعتماد، وثوق اور یقین کے ساتھ دنیا والوں کو بتلاتے ہیں :

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار

"وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبر دار"

(بال جبریل)

"سرمایۂ ملت کا نگہبان جسے اللہ نے بر وقت خبر دار کیا تھا" اسی کے قلم خارا شگاف سے ذرا مقام اجتہاد کی بلندی کا احوال سنیے:

"وائے ہزار وائے از تعصبہائے بارد ایشاں
واز نظر ہائے فاسد ایشاں، بانیٔ فقہ ابو حنیفہؒ است
وسہ حصہ از فقہ اورا مسلم داشتہ اند ودر ربع باقی
ہمہ شرکت دارند باوے، در فقہ صاحب خانہ اواست
ودیگراں ہمہ عیال وے اند"۔

ترجمہ: "حیف! صد حیف! ان لوگوں کے بے ہودہ تعصب اور غلط بینی پر! بانیٔ فقہ ابو حنیفہؒ ہیں، فقہ کے تین حصے انکو مسلم ہیں اور باقی چوتھائی میں سب حضرات ان کے شریک ہیں، فقہ میں صاحب خانہ وہ ہیں، اور دوسرے سب ان کے عیال ہیں۔"

امام شافعی کا ارشاد ہے:

"من اراد الفقه فهو عيال على ابى حنيفة۔

(الانتقاً ص ۱۳۶)

"باوجود التزام ایں مذہب مرا باامام شافعی گویا محبت

ذاتی است وبزرگ میدانم، لہذا در بعضے اعمال نافلہ تقلید مذہب او مے نمایم، اما چہ کنم کہ دیگراں را باوجود وفور علم و کمال تقویٰ در جنب امام ابی حنیفہؒ در رنگ طفلاں مے یابم۔"

(مکتوبات مجددیہ دفتر دوم مکتوب ۵۵)

ترجمہ: "اس مذہب کے التزام کے باوجود مجھے امام شافعیؒ سے گویا ذاتی محبت ہے، میں انھیں بزرگ جانتا ہوں اس لئے بعض نفلی اعمال میں ان کے مذہب کی تقلید کرتا ہوں، لیکن کیا کروں ابو حنیفہؒ کے سامنے بچوں جیسا پاتا ہوں۔"

نیز:-

"ذوالنون وبسطامی وجنید و شبلی بازید و عمرو وبکر و خالد کہ از عوام مومنانند در تقلید مجتہداں در احکام اجتہادیہ مساوی اند، آرے مزیت ایں بزرگواراں در امور دیگر است۔"

(مکتوبات مجددیہ مکتوب ۵۵ دفتر دوم)

ترجمہ: "ذوالنونؒ مصری، بایزید بسطامیؒ، جنیدؒ بغدادی اور شبلیؒ اجتہادی احکام میں ائمہ مجتہدین کی اتباع میں زید و عمرو اور بکر وخالد عامۂ مومنین کی صف میں ہیں، ہاں ان مقبولان الہٰی کی فضیلت دوسری چیزوں میں ہے۔"

یہ ہے مقام اجتہاد! جس کے سامنے جبال علم و تقویٰ "در رنگ طفلاں" نظر آتے ہیں اور جس کی پیروی میں شیخ جیلاںؒ، ذوالنونؒ مصری، جنید بغدادیؒ، جیسے اتقیائے امت، اور فخر الدینؒ رازی، حجۃ الاسلام غزالیؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ

ولی اللہ دہلویؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ (قدس اللہ اسرارھم) جیسے اساطین امت عامۂ مومنین کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

دور حاضر کے غلط پندار متجددین کو اگر ائمہ ہدیٰ کی اتباع سے عار آتی ہے، تو آتی رہے، لیکن اقبال کی اصطلاح میں "سرمایۂ ملت کا نگہبان" شیخ مجددؒ ان کی تقلید پر فخر کرتا ہے "باوجود التزام ایں مذہب، در بعضے اعمال نافلہ تقلید مذہب اوے نمایم"۔ منصب اجتہاد اتنا ارزاں نہیں کہ صرف مغربی یونیورسٹی کی سند فضیلت کے عوض اسے فروخت کر دیا جائے، اور کسی اسلامی موضوع پر الٹا سیدھا انگریزی مقالہ لکھنے والوں کو یہ منصب تفویض کر دیا جائے، اور پھر انہیں کھلی چھٹی دیدی جائے کہ وہ اسلام کے جس مسئلہ پر چاہیں حرف زنی کرتے رہیں، بقول شیخ:

کس نیاید بزیر سایۂ بوم
ور شود ہما از جہاں معدوم

ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی جامعہ قاسمیہ دارالعلوم دیوبند میں اپنے وقت کے سب سے بڑے شیخ مولانا محمد انور شاہ کشمیری (نور اللہ مرقدہ) کی جلالت شان سے جو لوگ ناواقف ہوں وہ علامہ اقبال سے دریافت کریں کہ انور شاہ کون تھے؟ بقول حکیم الامت تھانویؒ اسلام کا زندہ معجزہ، اسلامی علوم کا دائرۃ المعارف، اپنے وقت کا متحرک کتب خانہ، علوم نبوت کا حافظ جن کے حفظ و ذکاوت، اور تبحر علمی کا ذکر چھیڑیئے تو آج کے بے یقینوں کو مشکل ہی سے اس کا یقین آئے۔ جن کے علم و عمل، زہد و تقویٰ، اور اخلاص

وخداپرستی کی نظیر اسلامی تاریخ کی کئی صدیوں میں بھی خال خال ہی نظر آئے گی، یہی علامہ انور شاہؒ فرمایا کرتے تھے :-

"واعلم انه ما من فنّ الاولى فيه رأى غير الفقه، فانی فيه مقلد صرف، ولا أرى فيه حقا الا لمن حصل له الاجتهاد" — (فیض الباری ج۳ ص۱۷)

ترجمہ : "میں ہر علم میں اپنی مجتہدانہ رائے رکھتا ہوں، مگر علم فقہ میں میں مقلد محض ہوں - اور میرے نزدیک اس میں دخل دینے کا حق صرف ان حضرات کو ہے جنہیں اجتہاد نصیب ہو (جو فقیر کو نصیب نہیں)"۔

واحسرتا واندامتاه! آج جہل مطلق کا نام علم اور تحریف کا نام اجتہاد رکھا جاتا ہے، اور یہ بے علم مجتہد نہ صرف ائمہ سے دست وگریباں ہوتے ہیں، بلکہ ارشادات نبوت سے بھی الجھتے ہیں - فرمودات نبویہ کو بڑی نادانی سے انمل اور بے جوڑ بتلاتے ہیں - علوم نبوت کو اپنے ذہنی پیمانوں سے ناپتے ہیں، اور اگر فیصلۂ نبوت، انکی خواہشات سے ٹکرائے تو "اسلام کی تعمیر نو، کے نام پر اسے بے باکی سے ٹھکرا دیتے ہیں، کس ذات ﷺ کے فیصلوں کو؟

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ مے آید جنید وبایزید ایں جا

اور کیا صرف ایک جنیدؒ وبایزیدؒ ؟ ادب گاہ محمدی ﷺ پر حضرت موسیٰ وعیسیٰ (علیہم السلام) جیسے اولوالعزم مرسلین اور جبرئیل جیسے کروبیں، سبھی کو

"نفس گم کردہ مے آید" دیکھا گیا، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوئے، "ہم یہود سے کچھ باتیں سنتے ہیں جو بڑی اچھی لگتی ہیں، آپ ﷺ فرمائیں تو ہم انھیں لکھ لیا کریں؟" یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا:-

"امتهوكون انتم كما تهوكت اليهود والنصارىٰ لقد جئتكم بها بيضاء نقية ولو كان موسىٰ حيا لما وسعه الا اتباعى-" (مشكوة المصابيح ص ٣٠)

ترجمہ: "کیا تم بھی (اپنے دین کے بارے میں) متحیر ہو جاؤ گے جس طرح یہود و نصاریٰ متحیر ہوئے؟ (فراست نبوت کا معجزہ دیکھئے کہ آج مسلمانوں کو دین سے برگشتہ اور متحیر کرنے کے لئے یورپ کے تحیر ہی کو بطور سند لیا جاتا ہے- ناقل) بخدا میں تمہارے پاس صاف اور روشن شریعت لے کر آیا ہوں- اور اگر آج موسیٰ زندہ ہوتے تو انھیں بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا-" (اس کے برعکس آج دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوتے تو ہمارے ذہن سے سوچتے- معاذاللہ، ناقل)

میں دور جدید کی تخلیقی فکر اور اجتہادی مہم کے پرستاروں سے مؤدبانہ گزارش کروں گا کہ وہ اپنے خوش کن نعروں سے کتاب و سنت کے نصوص، امت کے اجماعی قطعات اور ائمہ ہدیٰ کے علوم کو معاف رکھیں، کتاب اللہ کی تحریف،

سنت نبوی کی تکذیب، اور امت مرحومہ کی تغلیط کی غلطی نہ کریں، اس ثقیل غذا کے استعمال کا تجربہ جن لوگوں نے کیا وہ اسے ہضم نہیں کر سکے، بالآخر ذہنی بد ہضمی اور دماغی تخمہ کا شکار ہو کر رہ گئے اور ملت اسلامیہ کے حساس معدہ نے انھیں مردہ مکھی کی طرح باہر نکال پھینکا، خوارج سے لیکر اکبری دور کے ابو الفضل اور فیضی تک کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں:

"بل نقذف بالحق على الباطل فيدمغه فاذا هو زاهق"

(بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں پس وہ حق اس باطل کا بھیجہ نکال دیتا ہے، وہ باطل دفعۃً مٹ جاتا ہے۔(الانبیاء :۱۸) کا "خدائی قانون" ہمیشہ جاری رہا ہے اور رہے گا۔

انھیں یہ خوش فہمی دور کر دینی چاہیے کہ کتاب اللہ کے نصوص کی جگہ ان کی ہزلیات کو مل جائے گی، یا امت مسلمہ ان کی جدت طرازیوں کو "حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم"، کی جگہ قبول کرے گی، یا وہ اپنے اجتہادی نعروں سے ابو حنیفہؒ و شافعیؒ کا مقام حاصل کر لیں گے، ایں خیال است و محال است و جنون، اگر ان میں اجتہاد کی واقعی صلاحیت ہے تو غیر منصوص مسائل کا شرعی حکم دریافت کریں، ورنہ اپنی ذہانت تخریب اسلام کے بجائے ملک و ملت کے کسی اور مفید کام میں کھپائیں۔ یہ ملک پر بھی ان کا احسان ہو گا اور خود اپنی ذات پر بھی۔

سبحانك اللهم وبحمدك

اشهد أن لااله إلاانت استغفرك واتوب إليك ـ

(بینات کراچی ربیع الاول ر ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ)

ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی بے جا حمایت

محترم مدیر ماہنامہ "بینات" نیو ٹاؤن کراچی .... السلام علیکم،

ماہنامہ "میثاق" لاہور اکتوبر ۱۹۶۸ء میں مدیر میثاق کی طرف سے ایک اداریہ شائع ہوا ہے، یہ اداریہ جتنے مسلمانوں کی نظر سے گزرا ہوگا، جن کا دین کے ساتھ پورا لگاؤ ہے، ان کے دلوں کو بہت مجروح کیا ہوگا، ہم چاہتے ہیں کہ "بینات" کی طرف سے ایسے گمراہ کن اداریے پر تنقید کی جائے، جس سے اس کے گمراہ کن پہلو پر روشنی پڑے۔

والسلام

محمد حنیف لطیف آباد : ۶ (حیدر آباد)

ج: ...... مدیر "میثاق" نے اکتوبر کے شمارے میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب بالقابہ کی مظلومیت کا جو مرثیہ لکھا ہے، اس سلسلہ میں اپنے مؤقف کی تنقیح نومبر ۱۹۶۸ء کے شمارے میں انہوں نے فرمائی ہے:

"ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے نظریات سے ہمیں بھی شدید اختلاف ہے.... چنانچہ ان کے نظریہ وحی کو ہم شدید قسم کی غلطی اور "ایمان بالملائکہ" سے اعراض پر مبنی سمجھتے ہیں، اور اس پر انشاء اللہ مفصل

تنقید بھی اپنے علم کی حد تک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں...... لیکن اس کا مطلب یہ بہر حال نہیں ہے کہ ہم کسی معاملے میں عدل وانصاف کے تمام تقاضوں سے صرفِ نظر کر لیں اور جس سے بھی ہمیں اختلاف ہو اسے لازماً نہ صرف جاہل بلکہ کافر' زندیق' دشمن اسلام اور اعداء دین کا ایجنٹ ہی قرار دیں......"

گویا ڈاکٹر صاحب کی نظریہ وحی میں شدید قسم کی غلطی اور "ایمان بالملائکہ" سے اعراض کے باوجود مدیر "میثاق" کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کو دین سے ناواقف' ضروریات دین کا منکر' طریق سلف سے منحرف اور اعداء دین کا ہمنوا کہنا صحیح نہیں بلکہ ان کو اگر ایک عالم ربانی' ایک مومن مخلص' ایک محبّ اسلام اور ترجمانِ سلف صالحین کی حیثیت سے تسلیم نہ کیا جائے تو اس سے عدل وانصاف کے تمام تقاضے پامال ہو جاتے ہیں...... ٹھیک یہی مؤقف "مسیلمہ پنجاب" کی نصرت و حمایت میں ایک "ہندی بزرگ" کا ہے' کہ ان کا دعویٰ نبوت غلط آیات و احادیث کی تحریف مسلم! امت اسلامیہ کی تکفیر و تفسیق بے جا! وغیرہ وغیرہ' لیکن بایں ہمہ وہ پکے سچے مسلمان بھی ہیں' محبّ اسلام و مسلمین بھی۔ اور ان کے لئے کفر و زندقہ' نفاق وارتداد اور "نبوت محمدیہ کے خلاف ایک سازش" کے الفاظ زبان پر لاتے ہی عدل وانصاف کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ "پیر ہندی" تمام اکابر علماً بلکہ خود اپنے پیر و مرشد کی تصریحات و توضیحات کے علی الرغم اپنے اس مؤقف پر خوب ڈٹے ہوئے ہیں:

"ہر کسے را بہر کارے ساختند"

کیا ہم "میثاق" کے مدیر محترم سے دریافت کر سکتے ہیں کہ: جو شخص یہ تصریح کرے کہ "قرآن پورے کا پورا کلام اللہ ہے' اور عام معنوں میں یہ اسی طرح پورے کا پورا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بھی ہے۔" جس کے نزدیک "قرآنی قصص اور واقعات

کی تاریخی...... صحت کا سوال دلچسپ ضرور ہے لیکن مشکلات سے لبریز بھی۔"جو خارج سے نزول وحی کا منکر ہو' فرشتہ وحی کا مذاق اڑاتا ہو' اور اسلامی عقائد اور ان تمام احادیث طیبہ کو جن میں جبریل امین علیہ السلام کا ذکر ہے 'قرون وسطیٰ کی ناپختہ عقلوں کی گھڑی ہوئی داستان کہتا ہو' جس کے نزدیک "قرآن کے تمام احکام اسی وقت کے لئے تھے" اور "ابدیت' قرآن کے احکام کو نہیں بلکہ صرف علل وغایت کو حاصل ہے" جو شخص نسخ احکام کا حق اسی طرح مانگتا ہو جس طرح کہ نسخ کا سلسلہ دور نبوت میں جاری تھا' جس کے زعم میں قرآن کی قانون سازی خود قرآن کے نزدیک اپنے ظاہری لفظی معنیٰ میں ابدی نہیں ہو سکتی' کیا اس کا "ایمان بالقرآن" قابل تسلیم ہے؟ اور کیا ایک مسلمان کا "ایمان بالقرآن" اسی نوعیت کا ہوتا ہے؟

جس شخص کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شارع (صاحب شریعت) نہیں تھے' بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اساسی حیثیت (معاذ اللہ) صرف "اخلاقی مصلح" کی تھی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملہ میں بس وہی پیشگوئی کر سکتے تھے جو قرائن واحوال کے پیش نظر ایک عام آدمی کر سکتا ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو کوئی دائمی شریعت نہیں دی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام وفرامین اور قضایا امت کے لئے واجب الاطاعت نہیں' بلکہ محض "ایک گونہ نظیر" ہیں' جس کے نزدیک "وحی ہو یا نبی کا عمل وہ تاریخ کے ان واقعات سے بے نیاز نہیں ہو سکتے جو فوری طور پر انہیں پیش آئے۔" کیا یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اس نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بحیثیت رسول کے سمجھا اور مانا ہے' اور وہ "ایمان بالرسل" کے دعویٰ میں مخلص ہے؟

جس کے نزدیک "اسلام نام ہے چند (مبہم) مثالی معیاروں اور نصب العینوں کا' جن کو مختلف معاشرتی مظاہر اور ظروف واحوال میں ترقی پسندانہ انداز میں عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے۔" (ڈاکٹر صاحب نے اسلام کی یہ تعریف پروفیسر جی فان گرومیون سے

اخذ کی ہے) ملاحظہ ہو "فکر و نظر" مئی اور جون ۱۹۶۵ء ص ۷۷ ۹) اور یہ اسلام ہمیشہ نو بہ نو صورتیں تازہ بہ تازہ شکلیں بدلنے کا متلاشی ہو، جس کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام کی اصل روح پہلی صدی ہی میں ختم ہو گئی تھی، جو اسلام کا مذاق اس مصرعہ سے اڑاتا ہو:

"خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود"

جس کے نزدیک وہ اسلام جو چودہ صدیوں سے مسلمانوں کے درمیان متوارث چلا آتا ہے، مردہ کاورثہ، زندگی کی حرارت سے محروم، جسد بے روح، محض پوست، مغز سے خالی، ظاہری رسمی ڈھانچہ، خود فریبی میں مبتلا، قانون مبرم کا زخم خوردہ، غلو کی چکی میں پسا ہوا، نقصان رسیدہ، زوال پذیر صرف تعزیروں اور پابندیوں کا مجموعہ، قدامت پرستی کے اطوار کا شاہکار، روشن ضمیری سے محروم، ہر تمدنی ڈھانچہ کے لئے تباہ کن، بدقسمتی کا شکار، جیسے القاب کا مستحق ہو، جو شخص اسلام کو روایتی اسلام، راسخ العقیدہ گروہ کا اسلام، تشکیلی دور کا اسلام، قرون وسطیٰ کا ساختہ پرداختہ اسلام، جیسے ناموں سے یاد کرے، کیا عقل مانتی ہے کہ اس نے اسلام کو ٹھیک سمجھ کر دل کی گہرائیوں سے اسے قبول کیا ہو گا؟ کیا اس پر بااخلاص مسلمان اور مومن قانت کا لقب چسپاں کیا جا سکتا ہے؟

جو شخص عقیدۂ تقدیر، عقیدۂ معراج، عقیدۂ شفاعت اور تمام اسلامی عقائد کا مذاق اڑاتا ہو، اکابر دین، ائمہ مجتہدین فقہا و محدثین اور تمام امت اسلامیہ کا مضحکہ اڑاتا ہو، تمام ذخیرۂ حدیث اور علم دیانات کو مسلمانوں کی من گھڑت کہتا ہو، احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انمل، بے جوڑ قرار دیتا ہو، پنج گانہ نمازوں کا منکر ہو، نماز کے اوقات واحکام کو بعد کی پیداوار کہتا ہو، زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دے کر اس کے ردوبدل اور اضافہ و نسخ کو ضروری سمجھتا ہو، اسلامی حدود کا منکر ہو، دو چند سہ چند سے کم سود کو حلال

کہتا ہو' اسلام کے پورے نظامِ عقائد و اعمال کو ناپختہ عقلوں کو بناوٹ کہتا ہو' جس کے نزدیک مستشرقین کے انداز میں اسلام پر عمل جراحی ناگزیر ہو' کیا وہ محبِ اسلام ہے یا اعداءِ دین کا آلہ کار؟:

اند کے پیشِ تو گفتم حالِ دل و ترسیدم
کہ آزردہ شوی و گرنہ سخن بسیار است

ستم ظریفی کی حد ہے کہ ایک شخص اسلام کی ایک ایک بات سے ٹھٹھول کرتا ہے' قرآن کی "آیات بینات" کے قطعی مفہوم کو ٹھکراتا ہے خدا اور رسول کو :انما کنا نخوض ونلعب (ہم تو بس یوں ہی ہنسی' دل لگی کرتے تھے) کا نشانہ بناتا ہے' پوری امت اسلامیہ کے ایمان و عقائد سے کھیلتا ہے' اسلام کو مہذب گالیوں سے نوازتا ہے' مگر "میثاق" کے مدیر محترم اپنی شفقت و رأفت کا سارا زور اس کی مظلومیت و معصومیت کی وکالت پر صرف فرماتے ہیں' کیا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ مدیر میثاق نے نہ تو ڈاکٹر صاحب کے خیالات کا کافی مطالعہ کیا ہے' نہ ان کی گہرائی میں اترنے کو ضروری سمجھا ہے' نہ ان کے سامنے یہ اصول ہے کہ اسلام اور کفر کے مابین حد فاصل کچھ ہے' اگر ہمارا یہ قیاس صحیح نہیں تو وہ خود ہی بتلائیں کہ قرآن و حدیث اور اصول کفر و ایمان کی روشنی میں مندرجہ بالا نظریات کا شخص کس لقب کا مستحق ہے؟ شفقت و ترحم بڑا اچھا وصف ہے لیکن کسی اچھی چیز کا بے موقع اور بے ڈھنگا استعمال تو اچھا نہیں۔ غلط کار کی پیٹھ تھپکنا اس پر شفقت نہیں' سراسر ظلم ہے' اس کے ساتھ شفقت یہی ہے کہ اسے اس کی غلط کاری پر سراً و جہراً ٹوکا جائے' اور اگر وہ باز نہ آئے اور ایسے امور کا ارتکاب کرے جن سے ایمان ہی کے غارت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا جائے۔

ہمیں ڈاکٹر صاحب کے مخالفین کی صفِ اول میں سمجھا جاتا ہے' مگر ڈاکٹر صاحب

جانتے ہیں کہ ہم نے مہینوں نجی مجالس میں بکمال اخلاص و ہمدردی سے 'شفقت و محبت کا حق سر اُدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی' اور جب معاملہ خلوت سے جلوت میں آیا اور سر سے جہر تک پہنچا تو جس تدریج سے ڈاکٹر صاحب اسلام اور اسلامیات کے بارے میں "لسانی ارتقاء" فرماتے گئے اسی نسبت سے ہماری شفقت کا رنگ بدلتا گیا' ہم نے ! صرف ڈاکٹر صاحب کی تحریروں ہی کا نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا بھی عمیق اور بھرپور مطالعہ کیا' اور آج بھی ہم خدا کو شاہد بنا کر کہہ سکتے ہیں کہ : ہمیں مدیر میثاق سے بڑھ کر ڈاکٹر صاحب سے شفقت و محبت ہے 'لیکن اس کا کیا کیجئے شفقت کا ایک انداز "پدری شفقت" بھی ہے' جو غلط کار فرزند کی آفتوں پر آنسوے بہانے کی صورت میں نہیں' بلکہ اسے سرخ آنکھیں دکھانے میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

مدیر میثاق کو بقول ان کے ایک دینی رسالے میں یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا ہے کہ :

"ڈاکٹر صاحب تو بس وہی کچھ لکھتے ہیں جس کا اشارہ انہیں اوپر سے ملے (ان ھو الا وحی یوحی) لیکن کیا وہ اس حقیقت سے انکار کریں گے کہ ڈاکٹر صاحب جس استشراقی مدرسہ فکر کے "مجتہد فی المذہب" ہیں جس نے اسلام کا مطالعہ اسی ذہن سے کیا ہے اور گولڈ زیہر سے ڈاکٹر اسمتھ تک کے ائمہ استشراق سے اسلام' اسلامی عقائد' اسلامی قانون' رجال اسلام بلکہ الوہیت و نبوت اور وحی رسالت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے' ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ان کے اصول و مبادیات و بیان اور ذہن و فکر میں ڈھل کر لکھا ہے' وہ کسی بحث پر قلم اٹھانے سے پہلے مدرسہ استشراق کا از سر نو مطالعہ کرتے ہیں' اور بقدر ضرورت مسائل و مباحث ہی نہیں بلکہ طرز ادا' انداز نگارش تعبیرات میں بھی ان کا تتبع کرتے ہیں' ماہنامہ فکر و نظر کے مقالہ نگار کے بقول :

"یہ امر بالکل فطری ہے اور آج بھی بالعموم یہی ہوتا ہے کہ شاگرد اکثر امور میں اپنے استاد کا ہم خیال ہوتا ہے۔" (فکر و نظر ج ۳' ش ۷' ۸' ص ۵۶۷)

اور خود مدیر میثاق بھی معترف ہیں کہ :

> "ایک مخصوص تعلیم و تربیت کی بنا پر ان کا (ڈاکٹر فضل الرحمٰن) کا نظریہ ایک خاص رخ پر ڈھلتا چلا گیا ہے اور ان کے ذہن پر مغرب کے فکر و فلسفے اور مادہ پرستانہ ظرف و فکر کی چھاپ پڑتی چلی گئی ہے' چنانچہ ان کی تصنیف میں جہاں بہت قیمتی علمی مواد بھی موجود اور بعض نکات بڑے دقیق اور وقیع ہیں' وہاں صاف محسوس ہوتا ہے کہ مادہ پرستانہ نقد و نظر اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور "اسلام" کا یہ پورا مطالعہ مغربی فکر و نظر کی روشنی میں گویا ہے۔(یہ "بہت قیمتی علمی مواد" اور "بڑے دقیق و وقیع نکتے" جو مدیر میثاق کو ڈاکٹر صاحب کی کتاب "اسلام" سے دستیاب ہیں' استشراقی مارکیٹ میں یہ جنس نہایت ارزاں ہے 'اگر نہیں تو ایمان و یقین' عدل و انصاف اور فہم و بصیرت نہیں' یہی جنس کم یاب ڈاکٹر صاحب کے یہاں مفقود ہے (افرأیت من اتخذ الٰهه هواه واضله الله علی علم...... ناقل)۔"

اسی بات کو اگر کسی نے "اوپر کے اشارے" سے تعبیر کر دیا تو کیا حقیقت واقعہ کی غلط ترجمانی کی؟ میثاق کے مدیر محترم کو شکایت ہے کہ :"ان کے (ڈاکٹر صاحب) کے ساتھ انصاف بھی نہیں کیا گیا چنانچہ بعض باتیں ان کی جانب غلط بھی منسوب کی گئیں اور ان کے بعض ایسے فقروں کا جو ایک عدد زیادہ مفہوموں کے متحمل ہو سکتے تھے' ایک خاص متعین مفہوم بھی ان کے سر تھوپا گیا اور ہنگامے کے شور و شغب میں ان کی تمام وضاحتوں کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔

کسی کی جانب غلط بات کو منسوب کرنا یا کھینچ تان کر ایسے مفہوم کو' جو متکلم کی مراد

نہ ہو' اس کے منہ تھوپنا ہمارے نزدیک پلّے درجے کا کمینہ پن ہے' کسی بات کو ڈاکٹر صاحب کی طرف منسوب کرنے سے پہلے ان کے سیاق و سباق کو (بلا مبالغہ) دسیوں بار پڑھا ہے اور ان کے مجموعی ذہن و فکر کو سامنے رکھ کر ان کی مراد سمجھنے کی کوشش کی ہے اور حزم و احتیاط کے تمام پہلوؤں کو اپنے امکان کی حد تک ملحوظ رکھ کر ان پر گرفت کی ہے' تاہم اگر مدیر یثاق کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اردو عبارتوں کو سمجھنے اور ان کا ٹھیک مفہوم متعین کرنے میں ہم سے فروگزاشت ہوئی ہے' تو وہ ان مقامات کی نشاندہی فرمائیں' ہم نہ صرف ان کے مشکور ہوں گے بلکہ ڈاکٹر صاحب سے بھی علانیہ معذرت خواہ ہوں گے' رہا ان کی اخباری وضاحتوں کو نظر انداز کر دینے کا قصہ ...... اس کی ایک مثال عرض کی جاتی ہے:

ڈاکٹر صاحب نے اپنی پوری کتاب "اسلام" میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "محمد" سے تعبیر کیا ہے اور کسی جگہ اسم گرامی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اضافہ کی یا کم از کم (ص) کا نشان دینے کی زحمت نہیں کی' جب اس پر گرفت کی گئی تو وضاحتی ارشاد ہوا کہ: "چونکہ میں نے یہ کتاب غیر مسلموں (انگریزوں) کے لئے لکھی ہے اور چونکہ ان کے یہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا رواج نہیں ہے' چنانچہ میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ (حالانکہ یہ قطعاً جھوٹ ہے کتاب کا پیش لفظ اس کی تکذیب کرتا ہے ملاحظہ فرمائیے کتابچہ "نیا اسلام" ...... ناقل)۔"

(بالمعنی) مدیر یثاق انصاف فرمائیں کہ کیا یہ "چونکہ چنانچہ" کی منطق کسی التفات کی مستحق ہے؟ کیا یہ یکسر نظر انداز کر دینے کے لائق نہیں؟ کیا کسی غیر مسلم ذوق کی تسکین کے لئے مسلمان سے تعظیم نبوی (بآبائنا هو وامهاتنا صلى الله عليه وسلم) اور صلوۃ و سلام کا فریضہ ساقط ہو جاتا ہے؟ اور جو شخص سینکڑوں صفحات میں ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو "خشک" ذکر کرتا چلا جائے اور ساری

کتاب میں صلوۃ و سلام سے محروم رہے کیا اسے انوار نبوت اور فہم اسلام سے کچھ حصہ مل سکتا ہے؟ (ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون) عجیب بات ہے کہ یہی بزرگ، صحیح بخاری کی حدیث وحی کو بعد کی پیداوار فرماتے ہیں جس کی ہر حدیث کے لئے وضو اور دوگانہ کا، اور ہر باب کے لئے غسل اور طوافِ بیت اللہ کا اہتمام امام بخاریؒ نے فرمایا: (فاین الثریٰ من الثریا؟) یہی حال ڈاکٹر صاحب کی دوسری وضاحتوں کا ہے، جنہیں بقول مدیر "میثاق" نظر انداز کر دیا گیا۔

آخر میں مدیر میثاق سے گزارش ہے کہ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی ذات سے نہیں، نظریات سے اختلاف ہے، ان کے مناصب سے نہیں، مقاصد سے ضد ہے، ہم ان کی ذاتی خوبیوں کے علاوہ ان کے وسیع معلومات کے بھی معترف ہیں (نہ کہ علم کے) اگر حق تعالیٰ انہیں توفیق دے اور وہ اپنے نظریات میں اعتدال پیدا کر لیں اور ان کی تحریروں سے جو نقصان اسلام اور ملت اسلامیہ کو پہنچا ہے، انہیں اس کا احساس ہو جائے اور وہ اس کی تلافی کر لیں تو نہ صرف یہ کہ امتِ اسلامیہ انہیں سر آنکھوں پر بٹھائے گی، بلکہ ان کے قابل احترام والد بزرگوار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک بھی ان سے خوش ہو جائے گی، اور ان کی ذہانت و فطانت یوں رائیگاں نہ جائے گی، ہماری یہی گزارش "ادارۂ تحقیقات اسلامی" کے ان رفقاء کے بارے میں بھی ہے جو اب تک ڈاکٹر صاحب سے ذہناً متفق اور عملاً ان کے نقش قدم پر رواں دواں رہے ہیں۔

وفقنا اللہ لما یحبہ ویرضاہ بحرمۃ نبیہ وصفوۃ خلقہ
محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وبارک وسلم۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی خدمت میں!

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماہنامہ "میثاق" لاہور' بابت اکتوبر ۱۹۶۸ء میں تذکرہ و تبصرہ کے عنوان سے ادارہ تحقیقات اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن بالقابہ کی "معصومیت" و "مظلومیت" کی دہائی دیتے ہوئے انہیں جس طرح پاک صاف باور کرانے کی کوشش کی ہے وہ اگرچہ باعث تعجب نہیں' مگر قابل افسوس ضرور ہے۔ انہیں کم از کم ایک ایسے شخص کے وکیل صفائی کا کردار نہیں ادا کرنا چاہئے تھا جو نہ صرف دور حاضر کے تمام علمأ اور صلحأ کو یکسر غلط کہتا ہے بلکہ پورے دین اور قرآن و سنت کو وقتی اور عارضی چیز اور قابل اصلاح گردانتا ہے۔ مگر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہیں کہ اسے دین و دیانت کی سند عطا کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ہماری رائے میں نہ تو ان کی طبیعت میں اسلام کے خلاف نشوز پایا جاتا ہے"۔ اور "نہ ہی وہ محض پیٹ پالنے کے لئے دین وایمان کا سودا کرنے والے لوگوں میں سے ہیں۔"

اس سلسلہ میں مدیر بینات کو حیدر آباد سندھ کے ایک دینی حمیت اور غیرت کے حامل نہایت نیک دل قاری کا جناب ڈاکٹر اسرار

احمد صاحب کے نام اصلاحی مکتوب موصول ہوا۔ جو بینات کراچی بابت رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ میں مندرجہ بالا مضمون کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع ہو چکا ہے، مناسب معلوم ہوا کہ اس کی افادیت کے پیش نظر اب بھی اسے بطور ضمیمہ شامل اشاعت کیا جائے۔

(سعید احمد جلال پوری)

محترم اسرار احمد صاحب، مدیر ماہنامہ میثاق لاہور، السلام علیکم!

آپ کا مضمون بعنوان "تذکرہ و تبصرہ" ماہنامہ میثاق شمارہ اکتوبر ۱۹۶۸ء نظر سے گزرا، اس "تذکرہ و تبصرہ" کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے:

۱:...... یہ متضاد چیزوں سے بھرا ہوا ہے، یہ گمراہ کن ہے، بہت سی جگہ آپ نے ڈاکٹر صاحب کے کارناموں کو سراہا ہے اور سچ یہ ہے کہ آپ نے ڈاکٹر صاحب کے لئے وکالت کا حق ادا کر دیا ہے۔

۲:...... آپ نے کئی جگہ ڈاکٹر صاحب سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے مثلاً:

"اس معاملہ میں سب سے زیادہ نقصان ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی ذات کو پہنچا ہے اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان پر کسی قدر زیادتی بھی ہوئی ہے۔"

۳:...... آپ کو ڈاکٹر صاحب کے نقاصن کی تو بڑی فکر ہے لیکن آپ کو امت مسلمہ کے ایمان کھو جانے کا تو شاید ذرہ بھر بھی احساس نہیں۔

۴:...... ایک جگہ آپ نے لکھا ہے:

"اس کے بالکل برعکس معاملہ "اسلام" کا ہے کہ بظاہر یہ مختصر کتاب ایک متعین فکر پر مبنی ہے اور اس نے اسلام کے

اساسی اعتقادات سے لے کر نظام شریعت کی تفصیل و تشکیل تک پورے مسئلے کو ایک خاص نقطہ نظر کے ساتھ مربوط شکل میں پیش کیا ہے اور اپنی طرز فکر کی تائید و تقویت کے لئے ایک ماہر فن مؤرخ کی طرح اسلام کی پوری تاریخ کا تجزیہ بھی اسی نقطہ نظر سے کر دکھایا ہے اور اس کی عقلی توجیہ بھی پیش کر دی ہے۔"

کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اس "خاص نقطہ" نظر کی وضاحت بھی کرتے کہ وہ نقطہ نظر ...... اسلامی اساسی اعتقادات سے لے کر نظام شریعت کی تفصیل و تشکیل تک کیسے فٹ بیٹھتا ہے' جس نقطہ نظر میں مستشرقین کا زہر بھرا ہوا ہے کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان کے نقطہ نظر سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت' قرآن کے کلام اللہ ہونے کی عظمت کے اوپر بہت بڑی آنچ آتی ہے؟ جس کی جسارت اس سے پہلے شاید ہی کسی مسلمان کہلوانے والے نے کی ہو گی۔ اگر کسی نے کی تو امت مسلمہ نے اسے کبھی (حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی) معاف نہیں کیا' اور وہ امت مسلمہ کی نظر میں ہمیشہ ہمیشہ ذلیل اور رسوار ہے۔

۵ :......ایک اور جگہ آپ نے فرمایا ہے :

"ہمارے اندازے کے مطابق وہ ایک سنجیدہ طالب علم ہے' ہماری رائے میں نہ تو ان کی طبیعت میں اسلام کے خلاف "نشوز" پایا جاتا ہے اور نہ ہی یہ خیال درست ہے کہ وہ محض پیٹ پالنے کے لئے دین ایمان کا سودا کرنے والے لوگوں میں سے ہے۔"

کہیں آپ ان کو ایک سنجیدہ طالب علم بتاتے ہیں اور کہیں ماہر فن مؤرخ کی طرح اسلام کی پوری تاریخ کا تجزیہ کرنے والا۔ اب ان دونوں القاب میں سے کونسا لقب

ڈاکٹر موصوف کے لئے موزوں ہے خود فیصلہ کرلیں۔

آپ کا یہ کہنا کہ :

"ہماری رائے میں نہ تو ان کی طبیعت میں اسلام کے خلاف نشوز پایا جاتا ہے۔"

سے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا سارا کارنامہ بعینہ اسلام کے مطابق ہے اور اس سے اسلام کو بڑی تقویت پہنچی ہے جس پر ڈاکٹر صاحب کو داد دینی چاہئے اور علماً دین نے سالہاسال ان کے کارناموں کے خلاف اپنے ماہناموں اور تقاریر میں جو احتجاج کیا ہے اور ابھی تک کر رہے ہیں وہ سب لغو ہے۔ جب آپ کی نظر میں مندرجہ ذیل اعتقادات رکھنے والے اور اشاعت کرنے والے آدمی کی طبیعت میں بھی اسلام کے خلاف نشوز نہیں پایا جاتا تو آخر وہ کونسی چیز ہوگی جس کو آپ کی غیرت و حمیت' اسلام کے خلاف تصور کرے گی؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ : پورا قرآن کلام الٰہی بھی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بھی...... قرآنی قوانین ابدی نہیں...... قرآن میں صرف تین نمازوں کا ذکر ہے۔ باقی دو زائد نمازیں بعد کی اختراع ہیں' معراج کا عقیدہ ایک افسانہ ہے' زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے' احادیث کے سارے صحیفے ساقط الاعتبار ہیں وغیرہ وغیرہ (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ)

ہمارے خیال میں ڈاکٹر صاحب کے کارنامے کی تائید میں یہ الفاظ کافی ہیں اور اس سے زیادہ انہیں کیا سرٹیفکیٹ چاہئے کہ ایک ایسے دینی رسالے میں جس کی سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی صاحب جیسی شخصیت کو حاصل ہے اس میں یہ لکھا ہوا ملے کہ :

"ہمارے اندازے کے مطابق وہ ایک سنجیدہ طالب علم ہیں' ہماری رائے میں نہ تو ان کی طبیعت میں اسلام کے خلاف

نشوز پایا جاتا ہے اور نہ ہی یہ خیال درست ہے کہ وہ محض پیٹ پالنے کے لئے دین وایمان کا سودا کرنے والے لوگوں میں سے ہیں۔"

اگر ہم سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیف "خلافت و ملوکیت" کے بارے میں یہ کہتے رہتے ہیں کہ ایک شیعہ عالم کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے کہ وہ اپنے مذہب کی تائید میں ایک سنی عالم کی یہ تصنیف پیش کردے' تو ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور ان کے گروہ مغرب پرست اور الحاد پسند کو تجدد کی تائید میں اس سے زیادہ اور کونسی چیز درکار ہو سکتی ہے جو آپ نے اپنے اداریے میں پیش کر دی؟

۲ : ......اگر کہیں آپ نے ڈاکٹر صاحب کے کارنامے سے کچھ اختلاف کی جھلک دکھائی ہے تو اس کو اس طرح ہاکا کر کے دکھایا ہے مثلاً :

"یہ دوسری بات ہے کہ ایک مخصوص تعلیم و تربیت کی بنا پر ان کا نقطہ نظر ایک خاص رخ پر ڈھلتا چلا گیا ہے اور ان کے ذہن پر مغرب کے فلسفہ اور مادہ پرستانہ طرز فکر کی چھاپ پڑتی چلی گئی ہے۔"

"ہم نے سر سید مرحوم کی جدید مذہبی عقلیت کے یہ چند شاہکار اس لئے پیش کر دیئے ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ آج کی تمام نام نہاد مذہبی عقلیت خواہ پرویزیت کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے یا فضل الرحمانیت کی شکل میں' در حقیقت فکر سر سید ہی کی خوشہ چینی اور نہایت کورانہ تقلید ہے۔"

اس بارے میں آپ کو ایک اصولی بات یاد رکھنا چاہئے کہ ایسے اعتقادات کی اشاعت جس سے کہ اسلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو مجروح کیا

جارہا ہو خواہ سرسید سے ہو' پرویز سے 'فضل الرحمٰن سے ہو یا کسی اور سے ہو' مسلمانوں کا یہ دینی فریضہ ہے کہ ان کا مقابلہ ڈٹ کر کیا جائے۔ خواہ اس میں جان کی بازی لگانی پڑے۔ اور یہ مسلمان خدا کے فضل سے ہر وقت کرتے چلے آئے ہیں البتہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی ذات اس بارے میں خاص امتیازی حیثیت رکھتی تھی کیونکہ وہ ایک اسلامی مملکت کی مشنری کے جزو کی حیثیت سے ایک ایسی چیز کو تشکیل دے رہے تھے جو مسلمانوں کے بنیادی اعتقادات اور شریعت اسلامی کے صریح خلاف تھی' جس نے مسلمانوں کے خواص و عوام میں زبردست تشویش اور غم و غصہ کی لہر دوڑادی اور بالآخر حکومت کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے منصب سے الگ کردے یا ڈاکٹر صاحب نے خود مجبور ہو کر اپنے کو اس عہدے سے الگ کردیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور ان کے گروہ کی کوششوں کے خلاف مسلمانوں میں جتنا غم و غصہ پھیلا ہے آپ کی مذکورہ وکالت نے "میثاق" کے خلاف بھی اسی قسم کے غصہ کی لہر دوڑادی ہے۔

تاہم میرا خیال ہے کہ آپ کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے وہ ایک فکری سہو کا نتیجہ ہے اور آپ کی دینی غیرت و حمیت سے پوری توقع رکھتا ہوں کہ آپ کی توجہ اس طرح مبذول کرانے پر آپ اب "سجدہ سہو" کے طور پر مذکورہ خیالات سے علی الاعلان رجوع اور برأت کا اظہار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق دے۔ (آمین)

عبید اللہ ہاشمی (حیدر آباد)

کیا تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء سیاسی تھی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد :

ماہنامہ "میثاق" لاہور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے، اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف "مولانا مودودی مرحوم اور میں" کے عنوان سے اپنی سرگزشت قلمبند کر رہے ہیں، اس کی دوسری قسط میں، جو ذوالحجہ ۱۴۰۲ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں شائع ہوئی ہے ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :

> "۱۹۵۳ء کو پاکستان کی تاریخ میں انتہائی اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ اس کے دوران ایک جانب تو پاکستان کی عوامی سیاست کے میدان میں وہ عظیم ہنگامہ خیز تحریک برپا ہوئی جس نے ہمیشہ کے لئے پاکستانی سیاست کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار کر رکھ دیا، چنانچہ پاکستان میں پہلی بار ایک محدود پیمانے پر مارشل لا نافذ ہوا، اور دوسری طرف پاکستانی طلبہ میں بھی بائیں بازو کے عناصر نے عظیم ترین ہل چل پیدا کی جس کے نہایت دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

۱۹۵۳ء کی انٹی قادیانی تحریک کا آغاز تو مجلس احرار کے زعما نے کیا تھا جو ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کی صورت میں جو شکست فاش انہیں ہوئی تھی اس کے زیر اثر پورے چھ سال منقار زیر پر رہے تھے اور اب اچانک انٹی قادیانی تحریک کا علم اٹھائے منظر عام پر ظاہر ہوئے تھے' لیکن بعد میں اس میں دوسرے مذہبی عناصر بھی کچھ دل آمادگی کے ساتھ اور کچھ مجبوراً شامل ہوتے چلے گئے' دل آمادگی کے ساتھ شامل ہونے والوں میں سرفہرست حلقہ دیو بند کے وہ علما کرام تھے جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیر قیادت کانگریس کے ہمنوا رہے تھے' اور حالات کے دباؤ کے تحت شامل ہونے والوں میں اولاً حلقہ دیوبند کے مسلم لیگی علما اور ثانیاً بریلوی مکتب فکر کے علما وزعما تھے"۔

مسلمانوں کا بچہ بچہ اس پر ایمان رکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی "ختم نبوت" کا مسئلہ خالص دینی ومذہبی مسئلہ ہے' ۱۹۵۳ء میں قزاقان ختم نبوت کی جارحیت اس قدر شدید ہوگئی تھی کہ علمائے امت اور زعمائے ملت کو اس کے انسداد کی طرف متوجہ ہونا پڑا' اور اس وقت کے ارباب اقتدار کی ناعاقبت اندیشی سے یہ دینی مطالبہ پوری قوم کا مطالبہ بن گیا۔

اس کے برعکس جناب ڈاکٹر صاحب موصوف اس کو دینی نہیں بلکہ سیاسی مسئلہ فرماتے ہیں اور ان تمام اکابرین کی نیت پر حملہ کرتے ہیں جو اس مقدس تحریک کا ہراول دستہ تھے' ڈاکٹر صاحب نے جس خیال کا اظہار فرمایا ہے وہ خالص "قادیانی ذہن" کی ترجمانی ہے' البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس ذہن سازی میں کن کن لوگوں کا حصہ ہے' یا قادیانیوں کے ساتھ ان کا کون سا جلی یا خفی رشتہ ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد،

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماہنامہ "میثاق" لاہور (ذوالحجہ کی اشاعت) میں تحریک ختم نبوت ۵۳ء کے بارے میں اظہار خیال فرمایا تھا۔ راقم الحروف نے اس سلسلہ میں ایک عریضہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں لکھا، حال ہی میں اس کا جواب مرحمت فرماتے ہوئے موصوف نے فرمائش کی ہے کہ اسے "بینات" میں شائع کردیا جائے، تقریب سخن کے لیے مناسب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کا زیر بحث اقتباس اور اس پر راقم الحروف کا خط بھی درج کیا جائے۔ نیز ڈاکٹر صاحب کے جواب کی روشنی میں چند مزید باتیں عرض کردی جائیں۔ گویا یہ مضمون علی الترتیب چار حصوں پر مشتمل ہوگا :

۱۔۔۔۔۔ ماہنامہ میثاق کا زیر بحث اقتباس

۲۔۔۔۔۔ راقم الحروف کا خط

۳۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کا جواب

۴۔۔۔۔۔ اس جواب پر تبصرہ۔۔۔۔۔ واللہ الموفق

محمد یوسف عفا اللہ عنہ

(۱)

ماہنامہ میثاق لاہور کا اقتباس

"سنہ ۱۹۵۳ء کو پاکستان کی تاریخ میں انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ اس کے دوران ایک جانب تو پاکستان کی عوامی سیاست کے میدان میں وہ عظیم ہنگامہ خیز تحریک برپا ہوئی جس نے ہمیشہ کیلئے پاکستانی سیاست کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار کر رکھ دیا۔ چنانچہ پاکستان میں پہلی بار ایک محدود پیمانے پر مارشل لا نافذ ہوا' اور دوسری طرف پاکستانی طلبہ میں بھی بائیں بازو کے عناصر نے عظیم ترین ہل چل پیدا کی جس کے نہایت دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

سنہ ۱۹۵۳ء کی انٹی قادیانی تحریک کا آغاز تو مجلس احرار کے ان زعما نے کیا تھا جو سنہ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کی صورت میں جو شکست فاش انہیں ہوئی تھی اس کے زیر اثر پورے چھ سال منقار زیر پر رہے تھے اور اب اچانک انٹی قادیانی تحریک کا علم اٹھائے منظر عام پر ظاہر ہوئے تھے۔ لیکن بعد میں اس میں دوسرے مذہبی عناصر بھی کچھ دلی آمادگی کے ساتھ اور کچھ مجبوراً شامل ہوتے چلے گئے۔ دلی آمادگی کے ساتھ شامل ہونے والوں میں سرفہرست حلقہ دیوبند کے وہ علمائے کرام تھے جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیر قیادت کانگریس کے ہمنوا رہے تھے' اور حالات کے دباؤ کے تحت شامل ہونے والوں میں نمایاں اولاً حلقہ دیوبند کے مسلم لیگی زعما اور ثانیاً بریلوی مکتب فکر کے علما وزعما تھے۔ جماعت اسلامی اور مولانا

مودودی اس معاملے میں بالکل :

"نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی!"

والے مخمصے میں مبتلا ہو گئے تھے اس لیے کہ جماعت کی تاسیس جن اصولی نظریات کی بنیاد پر ہوئی تھی ان کی رو سے اس کا اس تحریک میں حصہ لینا کسی طور سے صحیح نہ بنتا تھا۔ لیکن سیاسی اکھاڑے میں اتر جانے کے باعث عوامی دباؤ کو بالکل نظر انداز کر دینا بھی اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس کا معاملہ مسلسل "نیمے دروں نیمے بروں" کا رہا یعنی یہ کہ بظاہر، تحریک میں شامل بھی ہیں، لیکن بباطن، اس سے علیحدہ اور بری بھی۔!! بہرحال اس وقت پیش نظر اس طویل اور تلخ داستان کی تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ اس واقعے کا اظہار ہے کہ اس زمانے میں میرا نہایت قریبی رابطہ مولانا سے قائم رہا۔ اور اس پورے معاملے کے دوران کی نشیب و فراز کا علم مجھے بہت قریب سے ہوتا رہا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جس روز متحدہ مجلس عمل، نے راست اقدام یعنی ڈائریکٹ ایکشن کے آغاز کا اعلان کیا، اور جماعت اسلامی کی جانب سے یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا کہ ہم اس راست اقدام میں تو شریک نہیں ہیں "البتہ ہم نے اپنے حصے کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے"۔ اس روز مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بہت خوش اور ہشاش بشاش تھے اور میں نے پہلی بار ان کی زبان سے انگریزی کا ایک محاورہ سنا---- مولانا نے فرمایا "ہم اس صورت حال سے ود فلائنگ کلرز (فتح کے جھنڈے لہراتے ہوئے) نکلتے ہیں!"۔ لیکن افسوس کہ مولانا کی یہ

خوش فہمی بہت عارضی ثابت ہوئی اور نہ صرف یہ کہ حکومت کے "جوابی اقدام" کی لپیٹ میں دوسرے علما وزعما کے ساتھ مولانا بھی آگئے بلکہ وقت کے بعض "فراعنہ" نے جو موقع کی تاک ہی میں تھے بھرپور وار کیا اور مولانا پر مارشل لا کے تحت فوجی عدالت میں مقدمہ قائم کردیا۔"

(۲)

ڈاکٹر صاحب کے نام راقم الحروف کا خط

"محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سلمہ اللہ وعافاہ۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ' امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔ "میثاق" کے تازہ شمارہ (ذوالحجہ ۱۴۰۲ھ) میں جناب نے اپنے مضمون "مولانا مودودی مرحوم اور میں" میں صفحہ ۶۵-۶۶ پر ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے' (یہاں ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ بالا اقتباس کا حوالہ دیا گیا)

اس ناکارہ نے جناب کی اس تحریر سے حسب ذیل نتائج اخذ کئے ہیں :

۱:— سنہ ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت (جسے جناب "انٹی قادیانی تحریک" سے تعبیر فرماتے ہیں) مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تحریک تھی'

۲:—— یہ تحریک ملک وملت کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی'

۳:—— یہ اتنی ہی خطرناک تھی جتنی کہ کمیونسٹ عناصر کی

پاکستانی طلبہ میں عظیم ترین ہل چل'

۴: ------اس تحریک کے بانی مبانی اور مدار المہام "احرار" تھے جن کا مقصد پاکستان سے اپنی شکست فاش کا انتقام لینا تھا'

۵: ------"احرار" کے علاوہ جس قدر علما و صلحا نے اس میں حصہ لیا وہ یا تو اپنی کانگریسی ذہنیت کی بنا پر اس میں شریک ہوئے یا اپنے ضمیر ووجدان کے علی الرغم محض عوامی دباؤ کی وجہ سے' گویا خدا ورسول کی رضامندی اور دینی حمیت وغیرت کی بنا پر ان میں سے ایک بھی شریک نہیں ہوا تھا۔

تحریک ختم نبوت ۵۳ء کے اکثر زعما خدا تعالیٰ کے حضور پہنچ چکے ہیں' اور ہر ایک کو اپنے کئے کا بدلہ مل چکا ہے' "ان خیرا فخیر وان شرا فشر"۔ ظاہر ہے کہ وہ ہماری مدح وستائش اور ذم ونکوہش سے بالاتر ہیں۔ آپ نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کا تو کوئی نقصان نہیں بلکہ کچھ نفع ہی ہوا ہوگا' کہ اس "غیبت" کے ذریعہ جناب نے اپنی نیکیوں کا تحفہ ان کو عطا کیا' میرا خیال ہے کہ جماعت اسلامی کے اسیر حلقہ رہنے کی وجہ سے جناب کو نہ تو ان معروضی حالات کا علم ہے جن کی وجہ سے یہ تحریک اٹھی' اور نہ ان اکابر امت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا' اس ناکارہ کو ان اکابر کی خدمت میں حاضری کا موقعہ ملا ہے' اور ان کی خلوت وجلوت کا بغور مطالعہ کیا ہے' اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر اگر ان کے صدق واخلاص اور حمیت ولّلہیت کی قسم کھاؤں تو انشاء

اللہ حانث نہیں ہوں گا۔

صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ یہ ناکارہ جناب کی اس تحریر کو سفید جھوٹ اور اکابر اولیاء اللہ کے حق میں "سبحانک ھذا بھتان عظیم" کا مصداق سمجھتا ہے۔ اس افترا پردازی سے جناب کے بارے میں جو خوش فہمی تھی وہ بھی زائل ہو گئی۔ عارف رومیؒ کے بقول :

"چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنہ پاکاں زند"

ارادہ تھا کہ جناب کی اس دل خراش تحریر پر حسبۃً للّٰہ وذبًا عن اولیائہ کچھ لکھوں' پھر خیال ہوا کہ اس سلسلہ میں چند امور دریافت کر لئے جائیں :

۱ــــ تحریک کے دو ہدف تھے۔ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے' اور قادیانی وزیر خارجہ کو' جس نے اپنی سرکاری حیثیت کو قادیانیت کے فروغ و تبلیغ کا ذریعہ بنا رکھا تھا' برطرف کیا جائے۔ اسی کے ساتھ ایک مطالبہ یہ تھا کہ قادیانی مرتدین کو کلیدی اسامیوں سے ہٹایا جائے۔ کیا آپ ان مسائل کو دینی مسائل سمجھتے ہیں یا آپ کے نزدیک یہ "سیاست" ہے؟ اگر یہ سیاست ہے تو "دینی مسائل" کی کیا تعریف ہے۔

۲ــــ سنہ ۱۹۷۴ء کی تحریک کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا وہ بھی "سیاست بازی" تھی؟ اگر جواب نفی میں ہے تو جو مسئلہ

۱۹۵۳ء میں سیاسی تھا۔ وہی ۱۹۷۴ء میں دینی کیسے بن گیا؟ اور اگر یہ بھی "سیاست" تھی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ۱۹۷۴ء کے آئینی فیصلے سے جناب کو اتفاق نہیں؟

۵۔۔۔۔۔۔۔جناب نے اکابر ملت پر جو الزام لگایا ہے اس کا تعلق نیت و ارادہ سے ہے، یعنی یہ کہ ان کا مقصد دین نہیں تھا، بلکہ اپنی سیاسی حیثیت بحال کرنا تھا، اور باقی لوگ اپنے ضمیر کے خلاف شریک ہوئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ جناب کو اس کا علم کس ذریعہ سے ہوا؟ اگر اس کی بنیاد کسی خبر پر ہے تو کیا آپ نے اس خبر کو قرآنی معیار " ان جاء کم فاسق بنبا فتبینوا" کے مطابق جانچ پرکھ کر اس کی صداقت کا علم الیقین حاصل کرلیا ہے؟ اور ہزاروں لاکھوں مقبولان خداوندی کی نیتوں پر حملہ کرنے والے فاسق کے بارے میں اطمینان فرمالیا ہے؟ اگر جناب کی تحریر کی بنیاد کسی خبر پر نہیں، بلکہ اپنی ذاتی فہم و فراست پر ہے تو کیا حدیث نبویؐ "فهلا شققت عن قلبه" کے مطابق جناب نے ان کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ یا جناب کے یہاں "احوال قلب" دریافت کرنے کا کوئی آلہ دریافت ہوا ہے؟ ان اکابر امت سے جناب کا یہ سوء ظن آیت کریمہ "یا ایها الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم" اور ارشاد نبویؐ "ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث" کے خلاف تو نہیں؟ اور پس از مرگ ان پر یہ سنگین الزام عائد کیا "اذکروا موتاکم بخیر" اور "لا یغتب بعضکم بعضا" سے سرتابی تو نہیں؟

۶۔۔۔۔۔۔۔جناب نے ان اکابر امت پر جو الزام عائد کیا ہے اس

سے پہلے قادیانی صاحبان اور افجر القوم جسٹس منیر بھی یہی الزام لگا چکے ہیں' اس کو ذوق و فکر کی اتفاقیہ ہم آہنگی تصور کیا جائے۔ یا خاص تعلیم و تربیت کا کرشمہ باور کیا جائے؟ کیونکہ بعض لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ آنجناب مسٹر محمد علی لاہوری کی قرآن دانی کے بڑے مداح ہیں' اور آپ کا میلان لاہوریوں کی جانب ہے' کیا جناب کی اس تحریر سے ان لوگوں کے خیال کی تائید نہیں ہوتی۔

امید ہے کہ جناب اس ناکارہ کی جرات و گستاخی سے درگزر فرماتے ہوئے ان امور کی وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

والسلام

محمد یوسف

۱۸/۱۲/۱۴۰۲ھ

(۳)

ڈاکٹر صاحب کا جواب

محترمی و مکرمی مولانا محمد یوسف لدھیانوی' زید لطفکم

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ مورخہ ۱۸/ ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ بروقت مل گیا تھا لیکن کچھ علالت طبع اور کچھ شدید مصروفیت کے باعث جواب میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں' بلکہ میں نے زبانی معذرت مولانا محمد طاسین مدظلہ کی معرفت پہنچائی بھی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا بھول گئے! اس لیے کہ

میں نے معذرت کے ساتھ یہ درخواست بھی کی تھی کہ میرے جواب سے قبل اس معاملے کو "بینات" میں نہ چھیڑا جائے۔ لیکن بینات، بابت محرم الحرام ۱۴۰۳ھ میں آپ نے اس معاملے کو ذکر فرمادیا۔ بہرحال چونکہ تاخیر کی تقصیر میری جانب سے ہوئی ہے لہٰذا مجھے شکایت کا کوئی حق حاصل نہیں۔

آپ کے خط سے مجھے بعض پہلوؤں سے اطمینان بلکہ خوشی بھی حاصل ہوئی لیکن ایک پہلو سے افسوس بھی ہوا۔ خوشی اس بات سے ہوئی کہ آپ نے اس معاملے کو پرچے میں چھیڑنے سے قبل مجھے وضاحت کا موقع عنایت فرمایا (یہ دوسری بات ہے کہ میں اس سے بوجوہ فائدہ نہ اٹھاسکا!)۔ اطمینان اس سے ہوا کہ آپ ہماری مطبوعات پر نظر رکھتے ہیں۔ لہٰذا آئندہ بھی جہاں کوئی غلط فہمی یا غلط رجحان پائیں متوجہ فرمادیں گے۔ اور افسوس اس بات کا ہوا کہ آپ نے میری تحریر سے نتائج اخذ کرنے میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ ہر معاملے کے بہت سے درمیانی امکانات اور دیگر توجیہات کو نظر انداز کرتے ہوئے لمبی چھلانگ لگا کر آخری ممکنہ نتیجے اور ناگوار توجیہ تک جاپہنچے ہیں۔

میری تحریر کے جس حصے پر آپ نے گرفت فرمائی ہے اس کے بارے میں یہ حقیقت یقیناً آپ کی نگاہ سے اوجھل نہ ہوگی کہ اس میں اصل بحث سنہ ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے مالہ یا ماعلیہ پر نہ تھی بلکہ اصلاً ذکر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے موقف کا تھا۔ تحریک کا آغاز کرنے والوں یا اس میں پہلے

یا بعد میں شریک ہونے والوں کا ذکر محض تمہیدی اور سرسری طور پر آیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں بات بہت مختصر ہوئی اور اسی اختصار کے باعث غلط فہمی کے دروازے وا ہوئے۔ بہرحال میں ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے وضاحت کا موقع دیا' اور اب جب کہ اس معاملے کا ذکر "بینات" میں آہی گیا ہے متوقع ہوں کہ آپ میری وضاحت بھی شائع فرمادیں گے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی مسئلے یا مطالبے کے فی نفسہ صحیح یا غلط ہونے کا معاملہ جدا ہے اور اس کو ایک تحریک کی صورت میں لے کر اٹھنے والوں کا جدا۔ پھر تحریک لے کر اٹھنے والوں کے بھی طرز عمل اور طریق کار کا مسئلہ جدا ہے اور ان کی نیتوں اور قلبی ارادوں کا جدا !!! تبھی تو بعض تحریکوں کے بارے میں بعض اکابر سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ "کلمۃ حق ارید بھا الباطل!" جو یقیناً جناب کے علم میں ہوں گے۔ (یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فقرہ خارجیوں کے بارے میں تھا' ناقل)۔

کسی بھی تحریک کے ضمن میں ان تین چیزوں (یعنی اصل نوعیت مسئلہ ۲۔ طریق کار اور طرز عمل' ۳۔ اور نیت و ارادہ) کے مابین خلط مبحث کے سے بہت سے مغالطے پیدا ہوسکتے ہیں' اور یہی غلطی' میں ادب کے ساتھ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ میری اس تحریر کے ضمن میں آپ سے ہوئی ہے۔ کہ میں نے اس میں نہ اصل مسئلہ ختم نبوت کے بارے میں کوئی بحث کی ہے نہ ہی تحریک چلانے والوں کی نیت کے بارے میں کوئی

رائے ظاہر کی ہے بلکہ واقعاتی انداز میں تحریک کے رخ اور نہج پر گفتگو کی ہے۔ گویا میری گفتگو متذکرہ بالا تین امور میں سے صرف درمیانی معاملے کے بارے میں تھی' لیکن آپ نے از خود میرے بعض الفاظ سے (جن کی دوسری توجیہ بھی ہے جو میں ابھی عرض کروں گا) اول و آخر کے بارے میں بھی میری رائے مستنبط فرمائی اور پھر اس پر پوری تنقید کی بنیاد رکھ دی۔ اور مجھے سوء ظن سے اجتناب کی بجاطور پر تلقین کرتے ہوئے خود میرے بارے میں سوء ظن کی انتہائی حدوں کو چھوا۔

کون مسلمان بقائمی ہوش و حواس یہ کہہ سکتا ہے کہ ختم نبوت کا مسئلہ خالص دینی اور مذہبی نہیں سیاسی ہے۔ اور الحمد للہ کہ میری تحریر میں ایک حرف بھی ایسا نہیں جس کی اساس پر میری جانب یہ رائے منسوب کی جاسکے۔ البتہ اس کے لیے جو تحریک سنہ ۵۳ء میں اٹھی تھی اس کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اس کا انداز اولاً تو خود بھی سیاسی تھا۔ اور ثانیاً اسے اس وقت کے برسر اقتدار لوگوں نے باہمی کشمکش کا آلہ بناکر مزید سیاسی رنگ دے دیا' اور اس کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ بھی ملک وملت دونوں کے حق میں مضر ثابت ہوئے کہ جہاں تک قادیانیت' یا ختم نبوت کے مسئلے کا تعلق ہے وہ تو جوں کا توں رہا اور اس کے حل کی جانب پیش قدمی نہ ہوسکی' البتہ ملکی سیاست کی گاڑی کو جمہوری پٹڑی سے اتار کر مارشل لا اور آمریت کے رخ پر ڈالنے کے لیے میدان ہموار ہوگیا۔

رہا اس تحریک کا آغاز کرنے والوں یا بعد میں شامل ہونے والوں کی نیت کا معاملہ تو اس پر میں نے نہ تو اس تحریر میں کوئی حملہ کیا ہے اور نہ ہی' خدا گواہ ہے کہ' میرے دل ودماغ کے کسی بعید ترین گوشے تک میں ان کے حسن نیت کے بارے میں کوئی شک موجود ہے!!!

میرے نزدیک صورت واقعہ تو یہی ہے کہ اس تحریک کا آغاز زعمائے احرار نے کیا تھا جو سیاست کے میدان کے معروف شہسوار تھے' لیکن اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ ان کی نیتیں ٹھیک نہ تھیں بلکہ ان میں کوئی فتور تھا اور معاذ اللہ ملک وملت کو کوئی نقصان پہنچانا ان کے پیش نظر تھا۔ اسی طرح اس تحریک کے قوت پکڑ جانے کے بعد جو حضرات جس ترتیب کے ساتھ اس میں شریک ہوئے ان کا ذکر بھی بطور اظہار واقعہ ہوا ہے جس پر اس اعتبار سے تو یقیناً بات ہوسکتی ہے کہ وہ واقعاتی طور پر صحیح ہے یا نہیں لیکن اس سے ان کی نیتوں کے بارے میں میری جو رائے آپ نے مستنبط فرمائی ہے اس سے میں پوری شدت کے اظہار برات کرتا ہوں۔

میرے نزدیک اس صورت واقعہ کی اصل توجیہ یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر جماعت کے سامنے کرنے کے کاموں' کے ضمن میں اولیت اور ثانویت اور تقدیم و تاخیر کا کوئی تصور ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ظاہر ہے کہ ہر شخص یا گروہ بیک وقت تمام کام نہیں کرسکتا۔ چنانچہ وہ اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق اپنے لیے

کرنے کا اصل کام متعین کرلیتا ہے اور اسی پر اپنی بہتر و بیشتر مساعی کو مرکوز کردیتا ہے اور بہت سے دوسرے کاموں سے اصولی اتفاق کے باوجود اپنی عملی مساعی کا رخ ان کی جانب نہیں پھیرتا۔ اگرچہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ باقی تمام کاموں کو وہ یکسر غلط خیال کرتا ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص یا گروہ کسی وقت کسی اور مسئلے کو اٹھاکر بالفعل سامنے لاکر کھڑا ہی کردے تو اسے اس کے ضمن میں کوئی منفی یا مثبت موقف اختیار کرنا پڑتا ہے۔ میرے نزدیک سن ۵۳ء کی انٹی قادیانی تحریک بالکل اسی نہج پر آگے بڑھی کہ ایک دینی اعتبار سے بالکل صحیح مسئلے کو لے کراولاً زعمائے احرار اٹھے۔ لیکن بعد میں جب اس نے قوت پکڑلی تو دوسرے حضرات بھی جو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اس کی طرف متوجہ ہوئے اور رفتہ رفتہ اس میں شامل ہوتے چلے گئے (اسی کو میں نے اپنی تحریر میں حالات کے دباؤ سے تعبیر کیا ہے!) بہرحال علما کرام کے مختلف حلقے جو اس میں شامل ہوئے ان میں کون پہلے آیا' اور کون بعد میں یہ تو ایک خالص واقعاتی مسئلہ ہے۔ البتہ ان کا اس میں شریک ہونا اور ان کے موقف کے اعتبار سے ہرگز کسی تضاد عملی کا مظہر نہیں تھا جب کہ اس میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی شرکت میرے نزدیک ان کے سابقہ موقف کے اعتبار سے صریح تضاد کا مظہر تھی۔ اور اپنی اسی رائے کے اظہار کے لئے میں نے "مولانا مودودی اور میں" میں اس واقعے کا مختصر ذکر کیا ہے۔ اس

لئے کہ فی الواقع ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے ضمن میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے طرز عمل ہی سے پہلی بار میرا ذہن اس حقیقت کی جانب متوجہ ہوا تھا کہ یہ تحریک اپنے اصل اساسی نظریات سے منحرف ہو رہی ہے!۔۔۔۔!!

یہ ہے میرے ذہن کے مطابق صورت واقعہ کی اصل تصویر!۔۔۔۔ اب اس پر آپ خود ہی غور فرمالیں کہ میری جانب ان خیالات کی نسبت کس قدر غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ :

"۱۔ احرار کا مقصد" پاکستان سے اپنی شکست فاش کا انتقام لینا تھا!"

۲۔" احرار کے علاوہ جس قدر علما و صلحا نے اس میں حصہ لیا وہ یا تو اپنی کانگریسی ذہنیت کی بنا پر اس میں شریک ہوئے تھے یا اپنے ضمیر اور وجدان کے علی الرغم محض عوامی دباؤ کی وجہ سے۔۔۔۔ گویا خدا اور رسولؐ کی رضامندی اور دینی حمیت و غیرت کی بنا پر ان میں سے ایک بھی شریک نہیں ہوا تھا"۔

مجھے یقین ہے کہ آپ خود بھی دوبارہ غور فرمائیں گے تو یہ محسوس کرلیں گے کہ میری تحریر سے ان انتہائی نتائج تک پہنچنے میں آپ نے بہت بڑی چھلانگ لگائی ہے۔ ورنہ میرے الفاظ کا لازمی نتیجہ وہ نہیں ہے جو آپ نے نکالا ہے۔ بالخصوص آپ کی محولہ بالا عبارت کا آخری جملہ تو آپ کی "زیادتی" کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بہرحال اگر میرے الفاظ میں اختصار کی بنا پر یا غیر محتاط طرز تعبیر کے باعث اس معاملے میں کسی غلط فہمی کی کوئی بنیاد ہے تو میں اپنی اس

تحریر کے ذریعے اس سے اعلان برات کرتا ہوں' اور اعلان کرتا ہوں کہ ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کو لے کر اٹھنے والوں یا بعد میں شامل ہونے والوں میں سے کسی کی نیت کے بارے میں مجھے کوئی شک یا شبہ نہیں ہے۔

آپ کا فرمانا یہ صحیح ہے کہ مجھے ان اکابر کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع بالکل نہیں ملا یا بہت کم ملا' اور یہ بھی صحیح ہے کہ اپنی نوجوانی کے دور میں مجھ پر ایک خاص حلقے اور اس کے مخصوص طرز فکر کی چھاپ رہی ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس حلقے کے ساتھ شدید قلبی لگاؤ اور عملی وابستگی کے دور میں بھی بحمد اللہ مجھ پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جس میں پالیسی یا طریق کار کے ضمن میں شدید اختلاف کے باوجود "کانگریسی علما" یا "احراری زعما" کی نیتوں کے بارے میں سوء ظن کا کوئی پرچھانواں میرے ذہن یا قلب پر پڑا ہو۔ رہا حالات وواقعات سے پوری طرح باخبر ہونے کا الزام تو اس کے امکان کو میں کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب بھی کسی واقعے کے بارے میں میرے علم میں آیا کہ اس کے بارے میں میری معلومات درست نہ تھیں تو میں اس پر از سر نو غور کرنے کے لیے کھلے دل سے تیار ہوں گا۔ اور اس ضمن میں آپ کی جانب سے کسی نشاندہی کا نہ صرف یہ کہ خیر مقدم کروں گا بلکہ اس پر تہہ دل سے آپ کا ممنون ہوں گا۔

جہاں تک سنہ ۴۷ء کی تحریک کے بارے میں آپ کے سوالات کا تعلق ہے تو اگرچہ ان کا جواب بھی میری مندرجہ صدر

گزارشات میں آگیا ہے تاہم اسکے ضمن میں اپنی تفصیلی رائے کی وضاحت کے لیے میں آپ کو "میثاق" کی نومبر ۷۴ء کی اشاعت کا ایک نسخہ ارسال کررہا ہوں جس کے تذکرہ و تبصرہ میں صفحہ ۲ سے صفحہ ۱۴ تک نہ صرف ۷۴ء کی تحریک بلکہ مسئلہ ختم نبوت اور قادیانیوں کی تکفیر کے بارے میں میری مفصل رائے درج ہے۔ پوری بحث تو انشاء اللہ آپ اس میں پڑھ ہی لیں گے اس میں جس خاص بات کی جانب میں آپکی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سنہ ۵۳ء کی تحریک کے مقابلے میں سنہ ۷۴ء کی تحریک کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے اسباب و عوامل میں سے اہم ترین عوامل میرے نزدیک یہی تھے کہ ایک تو اس بار اسے کسی سیاسی جماعت نے نہیں اٹھایا تھا بلکہ یہ بالکل از خود سراسر قادیانیوں کی اپنی حماقت کے باعث اٹھی تھی' اور دوسرے یہ کہ اس کی قیادت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے ہاتھ میں آئی جو معروف اور مروجہ معانی کے اعتبار سے خالص غیر سیاسی شخصیت تھے۔ اس تقابل سے انشاء اللہ ۵۳ء کی تحریک کے بارے میں میرے ان مختصر الفاظ کا مفہوم آپ کے سامنے زیادہ نکھر کر آجائے گا جن کی بنا پر آپ کو غلط فہمی لاحق ہوئی۔

آخر میں اعتراف اور دو احتجاج'

اعتراف اس کا کہ قادیانیوں کے خارج از ملت ہونے کے بارے میں تو کوئی اشتباہ مجھے کبھی بھی نہیں رہا۔ البتہ جس حلقے کی چھاپ کا ذکر اوپر آیا ہے اس کے زیر اثر لاہوریوں' کو کافر قرار دینے

سے ہچکچاتا رہا۔ اس لئے کہ وہ آنجہانی غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں بلکہ صرف مجدد مانتے ہیں۔ (مولانا مودودی نے بھی منیر کمیشن کے سامنے لاہوری احمدیوں کو کافر نہیں' منافق قرار دیا تھا!) لیکن سنہ ۷۴ء کی تحریک کے دوران یہ مسئلہ جس طرح منقح ہو کر میرے سامنے آیا اس سے بحمد اللہ میرا یہ وسوسہ دور ہو گیا (میری تالیف "تحریک جماعت اسلامی" میں بھی اس ضمن میں میری سابقہ رائے درج ہے وہ ایک عرصے سے غیر دستیاب ہے۔ آئندہ جب بھی اس کی طباعت کی نوبت آئی اس میں میں اپنی تبدیل شدہ رائے کی وضاحت کروں گا!)

احتجاج نمبرا------اس پر کہ اگر میں نے اپنی تحریر میں ۵۳ء کے دو اہم واقعات (یعنی انٹی قادیانی موومنٹ اور کمیونسٹ طلبہ کی پیدا کردہ ہل چل) کا ذکر کیا تھا تو اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ میرے نزدیک وہ دونوں یکساں غلط یا برابر خطرناک تھے؟

اور دوسرا احتجاج— اس پر کہ آپ نے نہ صرف یہ کہ میری سوچ کے ڈانڈے قادیانیوں اور جسٹس منیر سے ملا دیئے لیکن اس سے بھی بڑھ کر "بعض لوگوں" کے حوالے سے مجھ پر لاہوریوں کی جانب میلان اور "مسٹر محمد علی کی قرآن دانی" کی مداحی کا الزام بھی عائد کر دیا۔ حالانکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' کچھ ہی عرصہ قبل میری کراچی کی ایک تقریر کی غلط اخباری رپورٹنگ پر آپ کی جانب سے استفسار کے جواب میں میرے بزرگ رفیق کار

شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے آپ کو ہماری دوسری مطبوعات کے ساتھ "تاریخ دعوت رجوع الی القرآن" کے ضمن میں میری مفصل تحریر بھی ارسال کردی تھی۔ اس کے باوجود آپ کی جانب سے اس شبہ کا اعادہ ناقابل فہم ہے۔ بہرحال میں ان دونوں باتوں سے شدت کے ساتھ اعلان برات کرتے ہوئے آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ جن صاحب نے یہ بہتان مجھ پر لگایا تھا آج وہ خود تو حد رجم' کے مسئلے میں قادیانیوں' لاہوریوں اور منکرین حدیث کی صف میں کھڑے ہیں اور میں نے اسی بنا پر ان سے قطع تعلق کا اعلان ماہنامہ "حکمت قرآن" کی اشاعت بابت جولائی اگست ۸۲ء میں کیا ہے جو اس کے صفحہ نمبر۵۷ پر دیکھا جاسکتا ہے (فوری حوالے کے لیے میں اس کا بھی ایک نسخہ ارسال کررہا ہوں)

میں انشاء اللہ العزیز ۱۹ تا ۲۸ دسمبر ۸۲ء کراچی میں مقیم رہوں گا۔ اور اس دوران میں انشاء اللہ کسی روز وقت نکال کر آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوں گا جس کے لیے میرے رفیق کار عبد الواحد عاصم آپ سے پیشگی وقت طے کرلیں گے۔

(نوٹ) اس خیال سے کہ شاید آپ کے پاس اپنے گرامی نامے کی نقل نہ ہو فوری حوالے کے لیے اس کی فوٹو اسٹیٹ بھی ارسال خدمت ہے!) باقی عند الملاقات۔ فقط والسلام مع الاکرام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ ر۱۰ دسمبر ۸۲ء

جواب پر تبصرہ

۱۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر صاحب اپنے وضاحتی مکتوب میں تسلیم کرتے ہیں کہ تحریک ختم نبوت ۵۳ء میں جن حضرات نے حصہ لیا وہ ان کے نزدیک مخلص اور نیک نیت تھے اور یہ کہ ان کا مطالبہ صحیح اور حق بجانب تھا' لیکن موصوف کو دو باتوں پر ہنوز اصرار ہے۔ ایک یہ کہ تحریک کا آغاز احرار نے کیا۔ دوم یہ کہ مطالبہ کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا وہ صحیح نہیں تھا۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ دو باتیں بھی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ اور قادیانیت کا رد و تعاقب احرار کا ہمیشہ سے خصوصی ہدف رہا۔ مارچ ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین کے عظیم جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو "امیر شریعت" منتخب کرتے ہوئے ان کے ہاتھ پر خود بھی بیعت کی' اور پانچ سو اکابر علما جو اس جلسہ میں موجود تھے۔ ان سے بھی بیعت کرائی' (ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ فرماتے تھے کہ میں اس جلسہ میں موجود تھا' اور بیعت کرنے والوں میں چوتھا یا پانچواں نمبر میرا تھا) حضرت امام العصرؒ کو رد قادیانیت کا خصوصی اہتمام تھا' اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو "امیر شریعت" کا خطاب دے کر اہل علم سے ان کے ہاتھ پر بیعت کرانا اس امر کی وضاحت تھی کہ عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کی خدمت ان کے سپردِ کی جارہی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں "مجلس احرار اسلام" قائم ہوئی' وہ دن اور آج کا دن' حضرت امیر شریعتؒ اور ان کی جماعت (پہلے مجلس احرار اور پھر مجلس تحفظ ختم نبوت) اس فریضہ سے کبھی غافل نہیں ہوئی' اور انہوں نے مسلمانوں میں عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت اور سارقین حریم نبوت کی بخیہ دری کو اپنی

زندگی کا نصب العین بنالیا۔ قیام پاکستان کے بعد سے تحریک ختم نبوت ۵۳ء تک بھی انہوں نے اس سلسلہ میں پورے خلوص اور تندہی سے کام کیا' اور امت مسلمہ کو فتنہ قادیانیت کی ہولناکیوں سے آگاہ کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن عقیدہ ختم نبوت پر احرار کی اجارہ داری نہیں تھی۔ بلکہ یہ ملت اسلامیہ کا مقدس ترین مشترک سرمایہ تھا۔ اور اپنے اپنے دائرے اور اپنی اپنی حیثیت میں دوسرے حضرات بھی اس کام کو ہمیشہ کرتے رہے۔ ۵۳ء میں احرار نے دیگر اعضائے ملت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا' بلکہ سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا گیا اور تمام جماعتوں کی نمائندہ "مجلس عمل" تشکیل دی گئی' وہی اس تحریک کی ذمہ دار تھی۔ پس احرار ڈاکٹر صاحب کے بقول' چھ سال تک منقار زیر پر رہنے کے بعد اچانک تحریک کا علم اٹھائے منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ناساعد حالات میں بھی احرار نے خون جگر سے شمع ختم نبوت کو روشن رکھا۔ تا آنکہ وہ وقت آیا کہ ۵۳ء میں تمام جماعتوں نے مل کر تحریک کا علم اٹھایا' اور جو جماعتیں مسلمانوں کے اس اجتماعی مطالبہ میں شریک ہوئیں وہ کسی مجبوری' دباؤ یا اضطراری کیفیت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے دین وایمان اور عقیدے کی بنا پر۔

۲ ------رہا طریقہ کار کا سوال' تحریک ختم نبوت ۷۴ء کے بارے میں خود ڈاکٹر صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ صحیح تھی۔ حالانکہ ۷۴ء کی تحریک میں جو طریقہ کار اپنایا گیا ٹھیک وہی ۵۳ء میں اختیار کیا گیا تھا۔ وہی تمام جماعتوں کا مشترک پلیٹ فارم' وہی مجلس عمل' وہی مشترک لائحہ عمل۔

ان دونوں تحریکوں میں تحریک اٹھانے والوں کے طریقہ کار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ البتہ جن حکمرانوں سے مطالبہ کیا جارہا تھا ان کے طریقہ کار میں ضرور فرق رہا۔ ۷۴ء کے حکمرانوں نے مسئلہ کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اور ملت کے احساسات

وجذبات کا صحیح اندازہ کرکے اس مسئلہ کو قومی اسمبلی کے سپرد کردیا۔ جب کہ ۵۳ء میں قومی اسمبلی بھی موجود تھی اور اس مسئلہ کو قومی اسمبلی میں لے جاکر دلائل وبراہین کی روشنی میں حل کرنا بھی کوئی مشکل کام نہ تھا مگر اس وقت کے خداوندان اقتدار نے نہ تو مسئلہ کی نزاکت کو سمجھا نہ ملت اسلامیہ کے جذبات واحساسات کا ٹھیک مطالعہ کیا۔ نہ وہ اس مسئلہ کے سیدھے سادے آئینی حل پر آمادہ ہوئے۔ ان کی دوربینی ودور اندیشی امریکہ وبرطانیہ اور اقوام عالم کے رد عمل کو صاف دیکھتی تھی مگر خود ان کے ملک میں اور ان کے پاؤں کے نیچے جو قیامت برپا تھی وہ انہیں نظر نہیں آرہی تھی، مسلمانوں کے صحیح اور معقول مطالبے کو اگر اس وقت تسلیم کرلیا جاتا تو یہ مسئلہ ۷۴ء کے بجائے ۵۳ء میں خوش اسلوبی سے طے ہوگیا ہوتا' نہ دار ورسن کی ضرورت پیش آتی۔ نہ حکومت کا نظام مفلوج ہوتا۔ نہ مارشل لا کا پہلا تجربہ ہوتا۔ نہ ڈاکٹر صاحب کے بقول ملک جمہوریت کی پٹڑی سے اترتا۔ اور نہ وہ خداوندان اقتدار فصب علیھم ربک سوط عذاب" کے تحت آتے۔ الغرض فرق دونوں تحریکوں کے درمیان نہیں جیسا کہ ڈاکٹر صاحب سمجھ رہے ہیں۔ بلکہ فرق دونوں وقت کے حکمرانوں کے رویہ اور ان کی قوت فیصلہ کے درمیان تھا۔

۳ــــــ جناب ڈاکٹر صاحب کو شکایت ہے کہ میں نے ان کی تحریر کے درمیانی امکانات وتوجیہات کو نظر انداز کرکے لمبی چھلانگ لگائی' اور آخری نتیجہ ان کی طرف منسوب کردیا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کے جن الفاظ سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھے :

> "سنہ ۵۳ء کی انٹی قادیانی تحریک کا آغاز تو مجلس احرار کے زعما نے کیا تھا جو قیام پاکستان کی صورت میں جو شکست فاش انہیں ہوئی تھی اسکے زیر اثر پورے چھ سال منقار زیر پر رہے تھے۔ اور اب

اچانک انٹی قادیانی تحریک کا علم اٹھائے منظر عام پر ظاہر ہوئے تھے"۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کے ان فقروں سے جو نتیجہ اخذ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں یہ لوگ اس تحریک میں مخلص نہیں تھے' اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ احرار کے شکست خوردہ ہونے یا ان کے "منقار زیر پر" رہنے کا ۵۳ء کی تحریک کے ساتھ کوئی منطقی ربط نہیں جب تک کہ یہ تسلیم نہ کرلیا جائے کہ یہ تحریک احرار نے اپنی شکست کا انتقام لینے اور ملک کو نقصان پہنچانے کے لیے اٹھائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بڑی دردمندی کے ساتھ ان عظیم ترین نقصانات کو بھی ذکر کررہے ہیں جو اس تحریک سے ملک کو پہنچے' اور اسی کے ذیل میں احرار کے علمبردار تحریک ہونے کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان کے مقابلہ میں ان کی شکست خوردگی اور اس کے زیر اثر چھ سال تک ان کے "منقار زیر پر" رہنے کو بطور خاص نوٹ کررہے ہیں' اس سیاق وسباق میں کون کہہ سکتا ہے کہ جو نتیجہ میں نے ان کی عبارت سے اخذ کیا ہے' وہ غلط اور عاجلانہ ہے' یا ڈاکٹر صاحب کے بقول میں نے لمبی چھلانگ لگاکر نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب ان حضرات کو مخلص اور نیک نیت سمجھتے تھے اور ان کو اپنے خیال کے مطابق صرف اظہار واقعہ مقصود تھا تو انہیں احرار کی "شکست فاش" اور ان کے "منقار زیرِ پَر رہنے" جیسے تکلیف دہ الفاظ (جن کا تحریک ۵۳ء سے کوئی ربط نہیں) استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سیدھے الفاظ میں کہہ سکتے تھے کہ اس تحریک کا علم ایک سیاسی جماعت "احرار" نے اٹھایا تھا۔ گو یہ بات بھی خلاف واقعہ ہوتی' مگر ان بزرگوں کے بارے میں سوئے ظن پیدا نہ ہوتا۔

دوسری وجہ جس کی بنا پر میں نے ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ کا وہ نتیجہ اخذ کیا یہ تھی کہ جن لوگوں نے تحریک ختم نبوت ۵۳ء کو غلط کہا (خواہ وہ قادیانی ہوں یا سرکاری دوائر) انہوں نے سب سے پہلے تو اس تحریک کی تمام تر ذمہ داری احرار پر ڈالی' پھر ان

کی شکست فاش بمقابلہ تحریک پاکستان کو ذکر کیا' اور پھر ان دونوں باتوں کی بنیاد پر بتکرار واصرار یہ اعلان کیا کہ یہ تحریک کسی اخلاص اور نیک نیتی کی بنیاد پر نہیں اٹھائی گئی' بلکہ احرار کا مقصد اپنی شکست کا انتقام لینا اور ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔ جیسا کہ منیر انکوائری رپورٹ میں بار بار یہی راگ الاپا گیا ہے۔

اب ڈاکٹر صاحب بھی یہی کہانی دہراتے ہیں کہ تحریک ۵۳ء غلط تھی' اس کے علمبردار احرار تھے۔ جنہیں تحریک پاکستان کے مقابلے میں "شکست فاش" ہوئی تھی۔ اور وہ چھ سال تک منقار زیر پر رہنے کے بعد تحریک کا علم اٹھائے نمودار ہوئے تھے اور پھر اس تحریک سے ملک کو عظیم تر نقصانات پہنچے۔ تو اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے بدیہی طور پر ذہن یہی نتیجہ اخذ کرتا ہے جو میں نے اخذ کیا۔ تاہم جب ڈاکٹر صاحب خود تشریح فرمارہے ہیں کہ ان کا یہ مطلب تھا۔ یہ نہیں تھا تو ان کا بیان کردہ مفہوم ان کے الفاظ سے کتنا ہی بعید کیوں نہ ہو ہمیں اپنے قصور فہم کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ہم ان کی عبارت کے اس پوشیدہ مطلب کو سمجھنے سے قاصر رہے (اور اب تک قاصر ہیں) ڈاکٹر صاحب اپنی عبارت کا جو مطلب بیان فرمارہے ہیں تسلیم کرنا چاہئے کہ وہی ٹھیک ہو گا۔

اسی طرح احرار کے علاوہ کانگریسی علما کے دلی آمادگی کے ساتھ اور دوسروں کے مجبوراً حالات کے دباؤ کے تحت تحریک میں شامل ہونے کا جو مفہوم ڈاکٹر صاحب بیان فرمارہے ہیں اسی کو صحیح تصور کرنا چاہئے گو "دلی آمادگی" کے مقابلے میں "مجبوری" اور "حالات کے دباؤ" کے الفاظ اس کی تائید کرنے سے معذور ہیں' اس موقع پر کانگریسی اور غیر کانگریسی کا مقابلہ بھی بے محل ہے' اور پھر ڈاکٹر صاحب کا یہ سمجھنا کہ فلاں تو "دلی آمادگی" سے شروع ہوا' اور فلاں کو حالات کے دباؤ کے تحت مجبوراً شریک ہونا پڑا یہ بھی محض ان کا اندازہ و تخمینہ ہے' جس کی کوئی صحیح دلیل وہ قائم

دینی تحریک کی قیادت کا منصب اور ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی۔ اما بعد'

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ماہنامہ میثاق ستمبر ۱۹۸۴ء میں "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات' اور ان کے بارے میں علما کرام کے خدشات" کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کی ایک تقریر شائع ہوئی ہے جو موصوف نے ۲۹ رمضان ۱۴۰۴ھ کے آخری جمعہ میں کی تھی۔ نیز اسی شمارہ میں ان کی ایک تقریر "جہاد بالقرآن" کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے' رسالہ کے مدیر جناب جمیل الرحمٰن نے اہل علم سے اپیل کی ہے کہ :

> "جن کی خدمت میں میثاق پہنچتا ہے یا جن کی نظر سے گزرتا ہے وہ ان دونوں خطابات کے متعلق اپنی تنقید' تبصرے' مشورے اور آرا سے ہمیں اور ڈاکٹر صاحب کو مستفید ہونے کا موقع مرحمت فرمائیں۔"

ڈاکٹر صاحب کا خطاب اہل علم سے ہے۔ امید ہے اکابر اہل علم انہیں اپنی آرا سے مستفید فرمائیں گے۔ یہ ناکارہ اہل علم کی صف میں شمار کے لائق نہیں' مگر اس خیال سے چند امور عرض کرتا ہوں کہ :

گاہ باشد کہ کودک ناداں
بہ غلط بر ہدف زند تیرے

اگر کوئی صحیح اور مفید بات قلم سے نکل جائے تو ڈاکٹر صاحب اس پر غور فرمائیں گے ورنہ "کالائے بد بریش خاوند"۔

جناب ڈاکٹر صاحب "رجوع الی القرآن" اور "جہاد بالقرآن" کے داعی ہیں' انہوں نے "تنظیم اسلامی" کے نام سے اپنے مداحوں کی ایک جماعت بنا رکھی ہے' اور انہوں نے "تنظیم اسلامی" میں شامل ہونے والوں سے بیعت لینے کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ موصوف کو شکایت ہے کہ علما کرام نہ صرف یہ کہ ان کے مبارک سلسلہ سے تعاون نہیں کر رہے بلکہ ان کی طرف سے کچھ مخالفت بھی شروع ہو گئی ہے' وہ فرماتے ہیں :

"مجھے یہ کام کرتے ہوئے تقریباً بیس سال ہونے کو آئے ہیں' اور میں نے اس کا آغاز اسی آپ کے شہر لاہور سے کیا تھا' میں بحمد اللہ اسی کام میں مسلسل لگا ہوا ہوں' میں نے تو بہرحال اپنی زندگی اسی کام کیلئے وقف کر رکھی ہے، تجربہ یہ ہوا کہ جیسے جیسے کام اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید سے آگے بڑھنا شروع ہوا تو ویسے ویسے چند علما کی طرف سے کچھ مخالفت بھی شروع ہو گئی۔ ان کی جانب سے کچھ اندیشوں کچھ خطروں کا اظہار ہونے لگا۔ یہ دعوت کیا ہے؟ کہیں قرآن کا نام لے کر کوئی نیا فتنہ تو نہیں اٹھ رہا؟ میں حیران ہوتا تھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ پھر یہ مخالفت صرف ایسے علما کی طرف سے نہیں تھی کہ جن کے بارے میں لوگوں کی رائے اچھی نہ ہو بلکہ ثقہ علما وہ جن کا میرے اپنے دل میں بھی بڑا احترام ہے جن کے ساتھ میرا حسن عقیدت کا معاملہ ہے' میں نے محسوس کیا کہ سب کے سب کچھ الرجک ہیں' قرآن کے نام کی دعوت سے بہت گھبراتے

ہیں' انہیں کچھ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ قرآن قرآن کا جو لفظ لیا جارہا ہے تو کہیں یہ انکار سنت والی بات نہ ہوجائے' کہیں حدیث کا انکار تو کرنے نہیں چلے"۔

(میثاق ستمبر ۱۹۸۴' ص ۲۷)

طویل غور و فکر کے بعد علما اور ثقہ علما کی الرجی کا سبب ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوگیا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

"لیکن مجھے پچھلے سال کے دوران اس معمے کا حل مل گیا اور علما کرام کے طرز عمل اور رویہ کا سبب میری سمجھ میں آگیا۔

ہمارے علما کی طرف سے' بالخصوص ان کی طرف سے' جن کا ہمارے قدیم حلقوں سے تعلق ہے' جن اندیشوں اور خدشات کا اظہار ہوتا ہے' اصل میں اس کا سبب ان کا ایک طویل تجربہ ہے' وہ تجربہ یہ ہے کہ ماضی قریب وبعید میں مسلمانوں میں جتنی بھی گمراہ تحریکیں اٹھیں وہ سب قرآن کا نام لے کر اٹھیں۔ چکڑالویت اٹھی قرآن کے نام پر' اسی طریقہ سے پرویزیت اٹھی قرآن کے نام پر' اور تو اور قادیانیت اٹھی قرآن کے نام پر۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے کام کی ابتدا قرآن کی عظمت کے بیان سے کی۔ ان گمراہ تحریکوں کی تکنیک اور طریق کار کو میں آگے چل کر قدرے تفصیل سے ذکر کروں گا۔

ان سب سے پہلے بہت سی گمراہیوں کا سرسید احمد خان نے آغاز کیا قرآن کے نام پر۔ تو معلوم ہوا کہ پے بہ پے اتنے چرکے

لگے ہیں اور علما کو ایسے غلط تجربات (یہاں "غلط تجربات" کا لفظ غیر موزوں ہے۔ غالباً ڈاکٹر صاحب کی مراد "تلخ تجربات" سے ہے۔ ناقل) ہوئے ہیں کہ جیسے ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے کہ "دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک کر پیتا ہے" یا ایک دوسری کہاوت ہے کہ "جو سانپ سے ڈسا ہو وہ رسی سے بھی ڈرتا ہے"۔ یہی انداز اب ہوگیا ہے اور ایک عقدہ لاینحل بن گیا ہے کہ ہمارے دینی حلقوں کا یہ مزاج ہے کہ قرآن کے نام پر اٹھنے والی کسی بھی دعوت اور تحریک کے بارے میں ان کو فوراً ایک خطرہ' ایک اندیشہ' ایک سوء ظن لاحق ہوجاتا ہے۔ اور ان کی جانب سے خدشات کا برملا اظہار ہونے لگتا ہے جو مخالفت کا رنگ اختیار کرلیتا ہے' سابقہ "غلط تجربات" کی بنیاد پر ان کا اس قدر الرجک ہوجانا بڑی حد تک قابل فہم ہے"۔

(ص ۲۹)

قرآن کریم کے نام پر اٹھنے والی تحریکات سے حضرات علما کرام کے توحش کا جو سبب ڈاکٹر صاحب نے بیس بائیس برس کے غور و فکر کے بعد دریافت کیا ہے۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کو "اصل سبب" قرار دے کر خاصی سطحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان تحریکات سے علما کرام کے بدکنے کا اصل سبب یہ نہیں کہ چونکہ علما کرام کو پے بہ پے تلخ تجربات (یا ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں غلط تجربات) ہوتے رہے ہیں اس لئے وہ فطرتاً ہر ایسی تحریک سے جو قرآن کے نام پر اٹھے' فوراً بدک جاتے ہیں اور وہ کچھ اندیشے اور خطرے محسوس کرنے لگتے ہیں۔ بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ان تحریکات کے قائد و بانی' علم و عمل اور صلاح و تقویٰ

کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے، جو کسی دینی تحریک کے قائد وبانی کے لئے ناگزیر ہے۔

قرآن کریم کی تشریح وتفسیر کا منصب ہو یا کسی دینی تحریک کی قیادت کا منصب، یہ ایک بار امانت ہے جیساکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تھا:

یا ابا ذر! انک ضعیف، وانها امانة، وانها یوم القیامة خزی وندامة الا من اخذها بحقها وادی الذی علیه فیها۔

(صحیح مسلم۔ ص ۱۲۱ ج ۲)

ترجمہ: "اے ابو ذر! تم کم زور ہو، اور یہ امانت ہے، اور یہ قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا موجب ہے الّا یہ کہ کوئی اس کو حق کے ساتھ لے، اور اس سلسلہ میں جو حقوق اس پر لازم ہیں ان کو ادا کرے"۔

کسی دینی تحریک کی قیادت درحقیقت نیابت نبوت ہے، اور نیابت نبوت کا اہل وہی شخص ہو سکتا ہے جو وراثت نبوت کا حامل ہو، اور وراثت نبوت کے اصول تین ہیں۔ علم صحیح، عمل صحیح اور تزکیہ باطن۔ جن کی طرف آیت کریمہ ویعلمهم الکتاب والحکمة ویزکیهم میں اشارہ فرمایا ہے۔ پس جو شخص کہ علمی رسوخ میں لائق اعتماد نہ ہو، جس کا عملی معیار مستند نہ ہو، جس نے اہل قلوب اور ارباب باطن کی صحبت میں رہ کر اپنے اخلاق کا تزکیہ اور اپنی باطنی کیفیات کی تصحیح نہ کی ہو، اس کے بارے میں کیسے باور کرلیا جائے کہ وہ کسی دینی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے نیابت نبوت کے حقوق ٹھیک ادا کرسکے گا، اور وہ کسی افراط وتفریط خود رائی وکج

روی کا شکار نہیں ہو گا۔ دینی قیادت تو بہت دور کی بات ہے دنیا کا وہ کون سا کام ہے جس کے لئے بقدر ضرورت لیاقت و مہارت کی شرط کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اور جب کوئی اناڑی اس کام میں ہاتھ ڈالے تو اہل عقل و خرد اس سے اندیشہ و خطرہ محسوس نہیں کرتے؟ ایک گاڑی کا ڈرائیور' جس نے ڈرائیونگ نہ سیکھی ہو جب مسافروں سے بھری گاڑی کو لے کر چلے تو کیا اہل عقل اس سے خطرہ محسوس نہیں کریں گے۔ اور کیا ٹریفک کے سپاہی اس سے لائسنس کا مطالبہ نہیں کریں گے؟ اور کیا ڈاکٹر صاحب نے اہل عقل کے اس اندیشے اور ٹریفک کانسٹیبل کے اس مطالبہ پر کبھی تعجب کا اظہار کیا؟ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے علوم نبوت کو کسی ماہر سے نہیں سیکھا' جس نے کسی مرد کامل کی صحبت میں رہ کر اپنا تزکیہ باطن نہیں کرایا' جس نے لائق اعتماد مشائخ سے حکمت دین کا درس نہیں لیا' جس نے کتاب و سنت کے اسرار و حقائق کو کسی جاننے والے سے نہیں سمجھا' جس نے اپنے علم و عمل' عقائد و نظریات اور سیرت و اخلاق کو اسوۂ نبویؐ میں ڈھالنے کی محنت و ریاضت نہیں کی' اور جس کا فہم دین جنگل کی خود رو گھاس ہے' وہ دینی قیادت کا منصب سنبھالتا ہے' اور دین کی گاڑی کا ڈرائیور بن کر نکلتا ہے۔ اور حضرات علما کرام' جن کو حق تعالیٰ شانہ نے دین کا صحیح فہم عطا فرمایا ہے' اس پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب سراپا حیرت بن کر پوچھتے ہیں کہ یہ آخر ایسی کون سی بات ہے جس پر علما کرام' خوامخواہ دور دراز کے اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں' اس غریب نے آخر کیا جرم کیا ہے جس پر علما کرام پریشان ہیں' "رجوع الی القرآن" کی دعوت کا بیڑا ہی تو اٹھایا ہے اور "تنظیم اسلامی" کی قیادت اور "جہاد پر بیعت" لینا ہی تو شروع کیا ہے۔

گویا قرآن کریم کی دعوت و ترجمانی اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ایک تنظیم کی قیادت کا منصب ایک بہت ہی سرسری اور معمولی بات ہے جس پر اہل علم کو

کسی اندیشے اور خطرے کا احساس نہیں کرنا چاہئے۔ فیا لغربۃ الاسلام، وضیعۃ المسلمین--- انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر صاحب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد ہوگی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ قیامت کب ہوگی؟ فرمایا، جب امانت ضائع کردی جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ عرض کیا گیا، امانت کیسے ضائع کردی جائے گی، فرمایا :

اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ (صحیح بخاری ص۱۴ ج۱)

ترجمہ :" جب معاملہ نا اہل کے سپرد کردیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو"۔

اور یہ بھی کہ :

لا یقص الا امیر او مامور او مختال۔ (وفی روایۃ او مراء) (مشکوۃ ص۳۵)

ترجمہ :" وعظ کہنا تین آدمیوں کا کام ہے۔ امیر کا، مامور کا، یا متکبر کا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ یا ریاکار کا"۔

الغرض ڈاکٹر صاحب نے علما کی تشویش کا جو سبب دریافت کیا ہے، وہ حقیقی سبب نہیں۔ بلکہ اصل سبب وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی ہو یا غلام احمد پرویز۔ ان سب کی خودرائی وخودروی کا اصل سبب بھی یہی تھا کہ انہوں نے دینی طب کی ڈگری حاصل کئے بغیر امت کی مسیحائی کا کام شروع کر دیا، اس " عطائیت" کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس کی خواہشات جہاں تک لے جاسکیں وہ وہاں پہنچ

گیا۔ کوئی الحاد و زندقہ کی وادیوں میں بھٹکنے لگا' اور کوئی اس حد کے عبور کرنے میں کسی حد تک محتاط رہا۔

یہ ہے وہ مسلسل تجربہ' جو علمائے امت کو خوارج و روافض کے دور سے آج تک ہوتا رہا' اور جسے تنظیم اسلامی کے امیر محترم ایک بار پھر دہرا رہے ہیں' اور لطف یہ ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ خود اپنی حالت پر غور کرتے کہ وہ دینی قیادت کے بلند ترین منصب کے اہل بھی ہیں یا نہیں' الٹا علمائے کرام سے شکایت کرتے ہیں کہ وہ ان کی قرآنی دعوت اور ان کے حلقہ بیعت سے تعاون کیوں نہیں کرتے' جب کہ ٹیلی ویژن پر ان کے "الہدیٰ" کا غلغلہ بلند ہے۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں پڑھے لکھے لوگ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کو سعادت سمجھ رہے ہیں' اور وہ پاکستان سے امریکہ تک قرآن کی دعوت کو پھیلانے اور مسلمانوں کو جہاد کے لئے منظم کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔

کاش !ان سے گزارش کی جاسکتی کہ قبولیت عند اللہ کے بازار میں اس شہرت و قبولیت کی قیمت پھوٹی کوڑی کے برابر بھی نہیں' اور جب تک کسی صاحب نظر کی طرف سے یہ کام تفویض نہ کیا جائے اس سے دھوکہ کھانا کسی طرح بھی روا نہیں :

بصاحب نظرے بنما گوہر خودرا
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

یا مولانا معین الدین اجمیری کی طرح کوئی ان سے جرات کے ساتھ کہہ سکتا کہ :

ایاز قدر خویش بشناس!

مگر ڈاکٹر صاحب مطمئن ہیں کہ اس آزادی کے زمانے میں ان کو امامت و قیادت سے کون روک سکتا ہے' اور چند سرپھرے ان کے بارے میں کچھ لکھیں گے

بھی تو ان کے ارادت مندوں کا حلقہ سلامت رہے' یہ لوگ ان کا کیا بگاڑ لیں گے' ان کو تو "علمائے سو" "کٹھ ملا" یا کم از کم "تنگ نظر" کے چھوٹے سے بم سے اڑا دیا جائے گا' رہا آخرت کا معاملہ! سو وہ جب آئے گا دیکھا جائے گا :

ستعلم لیلی ای دین تدانیت
وای غریم یوم التقاضی غریمها

ڈاکٹر صاحب تو اپنی فتوحات پر نازاں ہیں اور اسے تائید و نصرت الٰہی کا کرشمہ سمجھ رہے ہیں' لیکن یہ ناکارہ' ان کی اس بلند پروازی اور ان کے اس جراتمندانہ اقدام سے واقعتاً کانپ رہا ہے' خدا ہی خیر کرے جو جتنا اونچا اڑتا ہے۔ جب گرتا ہے تو اتنا ہی نیچا گرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اسی خطاب میں یہ بھی فرمایا ہے کہ ان کی قرآن کانفرنسوں میں مولانا محمد یوسف بنوری' مولانا شمس الحق افغانی' مولانا محمد گوندلوی' مفتی محمد حسین نعیمی' مولانا عبید اللہ انور' مولانا تقی عثمانی' مولانا عبد الرحمٰن جامعہ اشرفیہ' مولانا سید ابو بکر غزنوی' پروفیسر سلیم چشتی' مولانا طاسین اور ڈاکٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن جیسے اکابر تشریف لاتے رہے ہیں۔

(ص ۵۸)

ان حضرات کی "قرآن کانفرنس" میں شرکت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کو قرآن فہمی میں درجہ استناد حاصل ہو چکا ہے اور اب وہ قرآن کی دعوت پر تنظیم اسلامی قائم کر کے لوگوں کو اپنے حلقہ بیعت میں داخل کرنے کے بھی مجاز ہو چکے ہیں۔ دوسرے کے بارے میں نہیں تو کم از کم اپنے شیخ و مربی حضرت اقدس مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ کے بارے میں تو یہ ناکارہ عرض کر سکتا ہے کہ وہ ڈاکٹر

صاحب کی خودرائی اور قلت علم کے شاکی تھے اور انہیں قرآن کریم کی تشریح و تفسیر اور دینی قیادت کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ "ماہنامہ بینات" کا آخری شمارہ جو حضرتؒ کی زندگی میں شائع ہوا' اس کے "بصائر و عبر" میں ڈاکٹر صاحب کی تفسیردانی پر تنقید کرتے ہوئے حضرت لکھتے ہیں :

"افسوس کہ آج کل ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ سب سے آسان کام یہی ہے کہ قرآن کریم کی تفسیرو تشریح کا بیڑہ اٹھائیں پھر چاہے اسلام کا بیڑہ بھی غرق ہو جائے' میں سب کی نیتوں پر شبہ نہیں کرتا لیکن طرز عمل پر تنقید کرتا ہوں' یہ مانا کہ کہیں کہیں عمدہ بات اور بہتر توجیہہ بھی کرلیتے ہیں لیکن کہیں اپنی رائے کی حریت اور علم کی کمی (کی وجہ) سے ایسی باتیں لکھتے ہیں کہ ان کی تمام محنتوں پر پانی پھرجاتا ہے' اور بسا اوقات وہ غلطی گمراہ کن اور خطرناک ہوتی ہے اور قطعی عقیدہ کے خلاف ہوتی ہے۔ بطور مثال اس وقت ایک نمونہ پیش کرتا ہوں ہمارے ایک محترم نے سورۃ العصر کی تفسیر و تشریح میں حسب ذیل حقائق کا اظہار فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے :

"(الف) سورہ والعصر میں نجات کی کم از کم چار شرائط بیان ہوئی ہیں اور ان سے کم پر نجات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کامیابی کی فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن کا تذکرہ نہیں بلکہ صرف آخری درجہ میں پاس ہونے کی شرح کا بیان ہو رہا ہے۔

(ب) ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق' تواصی بالصبر چاروں شرطیں لازمی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہر کلمہ گو کی نجات لازمی ہے۔ گویا نجات کے لئے صرف ایمان اور اس کا بھی محض زبانی اقرار کافی ہے الخ۔ (دیکھو انسان کا اصلی سرمایہ" از ڈاکٹر اسرار احمد خاں مطبوعہ ادارہ اشاعت علوم ملتان)

افسوس کہ اس وقت تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں صرف اجمال واختصار سے چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ قرآن کریم اور احادیث نبویہ متواترہ اور اہل سنت والجماعت کی تصریحات ہیں کہ اصلی نجات یعنی کفر سے نجات جس کا نتیجہ خلود نار اور دوامی جہنم ہے صرف ایمان پر ہے جو کلمہ شہادت میں ذکر ہے بشرطیکہ دل وجان سے یہ عقیدہ ہو صرف زبانی اعتراف نہ ہو۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذلک لمن یشاء۔ یعنی "بلاشبہ حق تعالیٰ شرک وکفر کو نہیں بخشا اور اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دے"۔ عمل صالح کو جز ایمان ایسا ماننا کہ اس کے نہ ہونے سے نجات نہ ہو اور انسان کافر بن جائے یہ مذہب خوارج کا ہے اور قریب اس کے معتزلہ کا مذہب ہے' بہرحال اس قسم کا نظریہ دور حاضر میں جناب مودودی صاحب نے اپنی کتابوں میں بہت زور وشور سے پیش کیا' شاید ہمارے محترم چونکہ ان کے رفیق کار تھے ان سے لیا ہوگا اور مودودی صاحب سے پہلے غالباً مولانا فراہی صاحب مرحوم بھی اس قسم کی باتیں لکھ چکے ہیں' بہرحال کسی نے کہا ہو' سراسر غلط ہے' قرآن کریم کے نصوص قطعیہ کے خلاف

ہے، اور اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ پھر سورہ والعصر میں جو کچھ بیان فرمایا گیا ہے اس کو تیسرے درجہ کی کامیابی سمجھنا سراسر غلط ہے، وہ تو اعلیٰ ترین کامیابی ہے جس کے اوپر کوئی درجہ نہیں ہوسکتا "عملوا الصالحات" کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اسلام کی کوئی بات باقی نہیں رہی جو اس میں نہ آئی ہو۔ اس وقت تفصیل کا موقع نہیں ورنہ صاف صاف ان غلطیوں کی نشاندہی کرتے جہاں ہمارے محترم سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ دراصل باکمال اصحاب کی صحبت کے بغیر علم دین اور قرآن کریم کا فہم میسر نہیں آسکتا۔ اسی وجہ سے مودودی صاحب بھی ان خطرناک غلطیوں میں مبتلا ہوگئے کہ تعجب ہوتا ہے"۔

(ماہنامہ بینات، رمضان وشوال ۱۳۹۷ھ۔ ص۶ و ۷)

حضرت بنوری قدس سرہ کی یہ تحریر آج سے سات برس پہلے کی ہے، جب ڈاکٹر صاحب نے تنظیم اسلامی کی بیعت کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا، ڈاکٹر صاحب اگر چاہتے تو حضرتؒ کی اس رائے سے استفادہ کرتے ہوئے اسے سرمہ چشم عبرت بناسکتے تھے اور اس ناکارہ نے آج سے اٹھارہ بیس برس پہلے ڈاکٹر صاحب کی کتاب "تحریک جماعت اسلامی ایک مطالعہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے یہی بات مولانا مودودی صاحب اور ان کی تحریک اسلامی کے بارے میں کہی تھی، مناسب ہوگا کہ اس کا ضروری اقتباس یہاں نقل کردیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب پر جماعت اسلامی کے دو مقصد تجویز کرتے ہوئے کہا تھا کہ دور اول میں جماعت کے یہ یہ خصائص تھے اور دوسرے دور میں یہ خصائص ایک ایک کرکے مٹتے چلے گئے۔ اور اس کا سبب بیان کرتے ہوئے موصوف نے لکھا تھا کہ "میں اگر ایک لفظ میں اس کی اصل وجہ کو بیان کرنا چاہوں تو

وہ ایک لفظ "عجلت پسندی" ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس ناکارہ نے لکھا تھا :

" ہماری رائے میں (جو اگر غلط ہو تو حق تعالیٰ ہمیں معاف فرمائیں) مصنف نے جماعت کی "بنائے فساد" کی تشخیص صحیح فرمائی ہے، یعنی "عجلت پسندانہ بے اصولی"۔ لیکن ہمارے خیال میں جماعت اسلامی کی عجلت پسندی ذرا وسیع مفہوم بھی رکھتی ہے، اور اس کی تاریخ بھی کچھ طویل ہے، اس کے لئے ہمیں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کی تازہ ترین تالیف "خلافت وملوکیت" سے راہنمائی ملتی ہے، مولانا موصوف عمال عثمانی کے بارے میں فرماتے ہیں :

" دوسرے یہ کہ اسلامی تحریک کی سربراہی کے لئے یہ لوگ موزوں بھی نہ ہوسکتے تھے، کیونکہ وہ ایمان تو ضرور لے آئے تھے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت وتربیت سے ان کو اتنا فائدہ اٹھانے کا موقعہ نہیں ملا تھا، کہ ان کے ذہن اور سیرت وکردار کی پوری قلب ماہیئت ہوجاتی، وہ بہترین منتظم اور اعلیٰ درجہ کے فاتح ہوسکتے تھے، اور فی الواقع وہ ایسے ہی ثابت بھی ہوئے، لیکن اسلام محض ملک گیری اور ملک داری کے لئے تو نہیں آیا تھا وہ تو اولاً وبالذات ایک دعوت خیر وصلاح تھا جس کی سربراہی کے لئے انتظامی اور جنگی قابلیتوں سے بڑھ کر ذہنی اور اخلاقی تربیت کی ضرورت تھی اور اس کے اعتبار سے یہ لوگ صحابہ وتابعین کی اگلی صفوں میں نہیں، بلکہ پچھلی صفوں میں آتے تھے"۔

(ماہنامہ بینات ص۱۰۹، ۱۱۰)

مولانا موصوف کا بیان کردہ یہ معیار عمال عثمانی پر منطبق ہے یا نہیں؟ یہ ایک الگ بحث ہے' لیکن خود مولانا کی "دعوت خیر وصلاح" جس نے جماعت اسلامی کی دعوت کی شکل اختیار کی' اس معیار کی بہترین مثال ہے۔

فیاض ازل نے مولانا مودودی کو بے پناہ استعدادوں' بلا کی ذہانت' طبیعت کی جولانی اور قلم کی روانی جیسی گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا ہے' لیکن بقول سعدیؒ "استعداد بے تربیت دریغ" ان صلاحیتوں کی صحیح تربیت کا موقعہ نہ ملنے کی وجہ سے وہ سب کی سب نہ صرف یہ کہ ضائع ہوئیں' بلکہ غیر تربیت یافتہ صلاحیتوں کے "بے دھڑک استعمال" سے اولاً اسلام کو' ثانیاً جماعت اسلامی کو اور آخر میں خود مولانا مودودی کو بہت سی مضرتیں ہوئیں۔ عمال عثمانی کے بارے میں مولانا کو یہ شکایت ہے' کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھوڑی بہت "صحبت وتربیت" ان کے ذہن اور سیرت وکردار کی قلب ماہیت نہ کرسکی تھی' اور یہاں یہ قصہ ہے کہ مولانا کو کسی "نائب رسول" کی صحبت وتربیت سے فائدہ اٹھانے کا سرے سے موقعہ ہی نہیں ملا' "ذہنی قلب ماہیت" ہوتی تو کہاں سے ہوتی۔ مولانا کی دعوت خیر وصلاح (یا بہ لفظ دیگر دعوت جماعت اسلامی) کسی نائب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں تربیت یافتہ ذہن سے نہیں ابھری' بلکہ وہ تمام تر مولانا کے ذاتی اور "خودرو مطالعہ" کی پیداوار ہے' انہوں نے اسلام اور دیگر نظریہ ہائے حیات کا وسیع مطالعہ کیا' اور اسی "ذاتی مطالعہ" سے انہوں نے اسلامی کلیات وجزئیات کا ایک ذہنی

خاکہ مرتب کرلیا' (جسے وہ بتدریج صفحہ قرطاس پر بھی لاتے رہے اور لارہے ہیں) اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے تجدیدی تحریکات کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا' اور ان تحریکات میں جہاں جہاں کوئی خامی نظر آتی گئی' اسے اپنے خود رو مطالعہ کی روشنی میں نوٹ کرتے گئے' اس مطالعہ سے اقامت دین کا نقشہ مرتب ہوکر ان کے سامنے آیا اور اسے انہوں نے ایک دعوت کے طور پر پیش کیا' یہ "جماعت اسلامی" کی "دینی دعوت" تھی۔

الغرض "عجلت پسندی" کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ مولانا نے اپنے افکار و نظریات اور دعوت خیر وصلاح کی بنیاد کسی ایسے ذہن اور سیرت و کردار پر نہیں رکھی کہ کسی باقاعدہ صحبت و تربیت سے جس کی قلب ماہیت ہوگئی ہو' بلکہ اپنے ذاتی اور خود رائے مطالعہ پر رکھی' اور کوئی نہیں جانتا کہ خود رو مطالعہ ضروری نہیں کہ کسی صحیح نتیجہ پر آدمی کو پہنچادے' بلکہ خود رو مطالعہ سے آدمی مرزا غلام احمد بھی بن سکتا ہے' اور عبد اللہ چکڑالوی بھی' اسلم جیراج پوری بھی بن سکتا ہے' اور عنایت اللہ مشرقی بھی' اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن بھی بن سکتا ہے اور غلام احمد پرویز بھی۔ اس لئے ہمیں اس پر قطعاً تعجب نہیں کہ مولانا کی تحریک میں غلطیاں کیوں پیدا ہوتی گئیں' بلکہ حیرت اور تعجب اس پر ہے کہ اتنی کم غلطیاں ہی کیوں پیدا ہوئیں' اور وہ اپنے خود رو مطالعہ کے نتیجے میں' اہل حق سے نسبتاً قریب کیسے رہ گئے' دوسرے لوگ نہ معلوم اس کی کیا توجیہہ

کریں، لیکن مجھے تو یہ مولانا کی نیک نیتی کی کرامت معلوم ہوتی ہے۔

اور عجلت پسندانہ بے اصولی میں مزید اضافہ اس وقت ہوا، جب کہ مولانا نے اپنے نظریات وافکار کے گرد "انا اعلم" کا حصار کھینچ لیا، ان کی کسی غلطی پر جب کبھی تنبیہہ کی جاتی تو انہوں نے اس کی پرواہ کئے بغیر کہ یہ تنبیہہ کتنے بڑے فاضل، فقیہ، اور خدا ترس کی جانب سے کی گئی ہے، اسے "لائق توجہ نہیں" کہہ کر دل ودماغ کے تمام راستے بند کرلئے، ورنہ جب وہ غیر تربیت یافتہ ذہن کے باوصف اسلامی تحریک کی سربراہی کررہے تھے، اگر اس دوران بھی وہ اہل صلاح وتقویٰ، اور اصحاب علم وفضل کی ہدایت پر کان دھرتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جماعت بالاخر اس سطح پر آجاتی جس کی شکایت بڑے دردمند دل سے آج ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کرنا پڑی ہے"۔

(بینات ربیع الاول ۱۴۰۵ھ)

ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریک اور اندیشے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

گزشتہ صحبت میں عرض کیا گیا تھا کہ نئے فرقوں یا جماعتوں کے بانیوں کے بارے میں اہل علم کو جو اندیشے اور خطرے محسوس ہوئے (اور جو بعد میں حقیقت واقعہ بن کر سامنے آئے) ان کا اصل منشأ یہ تھا کہ اس عظیم الشان منصب کی صلاحیت واہلیت حاصل کئے بغیر انہوں نے مسندِ قیادت پر جلوہ افروز ہونے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ ضروری نہیں کہ یہ سب قائدین و مصلحین شروع ہی سے دل کے کھوٹے ہوں، نہیں! بلکہ ان میں سے بعض کے بارے میں غالب گمان یہ ہے کہ وہ امت کے واقعی خیر خواہ تھے، ان کی زبوں حالی سے فکر مند تھے، وہ خلوص دل سے چاہتے تھے کہ امت کو قعر مذلت سے نکال کر اوج ثریا پر پہنچائیں۔ مگر چونکہ یہ بزرگوار علم راسخ سے تہی دامن اور اصلاح وتربیت کے فیضان سے محروم تھے اس لئے منصب قیادت کے بار گراں کو زیادہ دیر تک نہ اٹھا سکے، بلکہ سفر قیادت شروع کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ان کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ بالآخر پٹڑی سے اتر گئے۔ اور چونکہ "بے مرشد" و "بے استاد" بھی تھے اور بزعم خود مجتہد بھی (یا ہمارے ڈاکٹر صاحب کی اصطلاح میں نیم مقلد)

اس لئے شتر بے مہار کی طرح جس طرح کو منہ اٹھا چل نکلے، نہ ان کا کوئی مرشد ورہنما تھا اور نہ وہ کسی کی تقلید کے قائل تھے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ خدا خیر کرے ٹھیک انہی کے نقش قدم پر آج کل ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب اسرار احمد صاحب بھی اس امت کے دینی انحطاط اور اس کی زبوں حالی پر کچھ زیادہ ہی فکر مند نظر آتے ہیں۔ مدت کے غور و فکر کے بعد موصوف نے امت کی خستہ حالی کا علاج "جہاد بالقران" تجویز فرمایا ہے اور اس جہاد کے لئے انہوں نے "تنظیم اسلامی" تشکیل دے کر "سفر قیادت" کا آغاز کر دیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ چشم بد دور انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح "سلسلۂ بیعت" بھی جاری فرمادیا ہے (یہ تشبیہ نفس بیعت میں ہے گو نوعیت کا اختلاف ہو) (جسے سلسلۂ عالیہ احمدیہ کے مقابلے میں "سلسلۂ عالیہ اسراریہ" کہنا موزوں ہوگا) مگر "منصب امامت" کے لئے جو صلاحیتیں درکار ہیں موصوف ان سے عہدہ برآ ہیں اس لئے ان کے پیش رو قائدین و مصلحین کی طرح ان کے قدم بھی بار قیادت سے لڑکھڑانے لگے ہیں اور وہی اندیشہ سامنے آنے لگا ہے کہ کہیں وہ بھی گزشتہ قائدین اور مصلحین کی طرح پٹڑی سے نہ اتر جائیں۔ ولا فعل اللہ ذلک۔

جو خطرہ حقیقت واقعہ بن کر سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ یوں تو ڈاکٹر صاحب بار بار یہ کہتے ہیں کہ وہ ان پڑھ اور امی امتی ہیں (ان کی اس تعبیر پر گفتگو انشاء اللہ آگے آئے گی) لیکن اپنی تمام تر امیت اور ان پڑھی کے باوصف انہوں نے پیچیدہ قسم کے دقیق نظری مسائل پر "اظہار خیال" شروع کر دیا ہے جو گویا ڈاکٹر موصوف کی "اصطلاحات" کی ابتدا اور بسم اللہ ہے۔

ان میں سے ایک "اجتہاد و تقلید" کا مسئلہ ہے، موصوف نے "جہاد بالقران" کے لئے جو میدان یا محاذ تجویز کئے ہیں ان میں ایک فرقہ واریت کا محاذ ہے، وہ فرماتے ہیں:

> "چوتھے محاذ کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ وہ ہمارے سامنے فرقہ واریت کا محاذ ہے، اس فرقہ واریت کی شدت کو کم کرنے اور غیریت کو ختم کرنے کے لئے ہمیں کوئی ایسی بنیاد، کوئی ایسی جڑ، کوئی ایسا مرکز درکار ہے جو ذہنی ہم آہنگی پیدا کرے، پھر یہی ذہنی ہم آہنگی لوگوں کے اندر آپس میں قرب اور وابستگی کا ذریعہ بنے، یہی مفہوم حبل اللہ کا ہے، میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ حبل اللہ سے مراد قران مجید ہی ہے"۔ (میثاق ستمبر ۱۹۸۴ء ص ۲۳)

اس فرقہ واریت سے ان کی مراد ائمہ مجتہدین کا فقہی اختلاف اور اس سے پیدا ہونے والے فقہی مذاہب یا مسالک ہیں۔ موصوف اس فرقہ واریت کو امت کے لئے ایک خطرہ تصور کرتے ہیں۔ اس کے خلاف "جہاد بالقرآن" کا محاذ کھولتے ہیں' اور اس فرقہ واریت کی شدت کو کم کرنے کے لئے "ایک معتدل راستہ" نکالتے ہیں۔ جو "اجتہاد" اور "تقلید" کے بیچ میں سے ہو کر گزرتا ہے' اور جو موصوف کی خاص اصطلاح میں "نیم مقلدیت" کا راستہ ہے۔ اس راستہ کو اپنانے کے لئے موصوف دو چیزوں کی سفارش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ائمہ اربعہؒ کے ساتھ امام بخاریؒ کے فقہی مسلک کو بھی ایک مستقل مذہب کی حیثیت میں تسلیم کرلیا جائے۔ دوم یہ کہ ان مذاہب خمسہ کے دائرے میں گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی ہونی چاہئے۔ "یہ نہیں

کہ بس ایک ہی کے ہو رہیں"۔ موصوف کا یہ "معتدل راستہ" بھی مسئلہ فرقہ واریت کا عارضی و عبوری حل ہے۔ ان کی دعا ہے کہ مستقبل میں اجتہاد مطلق کی حامل کوئی عظیم شخصیت کھڑی ہو اور وہ ان مذاہب خمسہ کا عطر نکال کر ایک ہی فقہی مذہب بنا ڈالے اور ساری دنیا کو اس پر جمع کر دے۔ یہ گویا فرقہ واریت کے مسئلہ کا صحیح اور حقیقی حل ہے۔ موصوف فرماتے ہیں :

"شاہ کاشمیریؒ کے خیالات کے پیش نظر ایک معتدل راستہ نکالنا ہو گا' خاص طور پر ان حضرات کو جو علمی میدان میں خدمت دین اور خدمت قرآن میں لگے ہوئے ہیں------ میں نے اس کے لئے ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے میں اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت کر رہا ہوں۔ چونکہ بات سمجھانے کے لئے نئی اصطلاحات وضع کرنی پڑتی ہیں۔ اصلاً یہ اصطلاح میں نے اپنے فقہی موقف کے لئے وضع کی ہے۔ میں اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ میں نیم مقلد ہوں۔ میں مقلد ہوں پانچ کا صرف ایک کا نہیں۔ چار تو اہل سنت کے متفق علیہ ائمہؒ ہیں اور پانچویں امام بخاریؒ جن کی کتاب کے متعلق سب مانتے ہیں "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" میں ان پانچ کے دائرے کے اندر اندر رہنے میں اپنے لئے عافیت سمجھتا ہوں۔ اللہ کرے کہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ کسی ایسی عظیم شخصیت کو کھڑا کر دے جس کے تقویٰ' جس کے تدین' جس کی فہم دین' جس کی اصابت رائے' جس کے خلوص واخلاص پر امت کے بڑے حصہ کا بالخصوص علمائے حق کی اکثریت کا اجماع ہو جائے تو وہ تمام فقہی مسالک میں عمیق غور وفکر کے بعد پوری للٰہیت اور خدا ترسی کے ساتھ امت کو ایک

فقہی مسلک پر مجتمع کر دے تو کر دے اور کسی مسئلہ کے متعلق دین کے دائرے کے اندر اجتہاد مطلق کر دے تو کر دے۔ اس دور میں میرے نزدیک ہم جیسے ٹھڈ بھیے اس طرح کی حرکت کریں گے تو دین کے خلاف بغاوت اور ایک بہت بڑے فتنہ کا آغاز کرنے کا باعث بنیں گے۔ رہیں اس دائرے کے اندر لیکن یہ نہیں کہ بس ایک ہی ہو۔ عوام کا معاملہ اور ہے وہ اپنے مسلک کے مطابق عمل بھی کریں اور روز مرہ کے مسائل میں اپنے ہی مسلک کے معتمد علماء کی طرف رجوع کریں۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ یہی ہدایت میں نے تنظیم اسلامی کے رفقا کو دی ہے۔ فقہی مسائل کے بارے میں، میں اپنی رائے کے اظہار سے بھی حتی الامکان گریز کرتا ہوں۔ البتہ میرا ایک مزاج ہے، میں اسے چھپانا نہیں چاہتا، میں محض مقلد نہیں ہوں، میں نیم مقلد ہوں۔ میں ان پانچوں ائمہؒ کا مقلد ہوں۔ ان پانچوں دائروں سے باہر جانے کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ یہ ہماری مشترک متاع ہے ان دائروں کے اندر اندر جس کی رائے کو بھی اقرب الی السنہ اور اقرب الی الصواب سمجھتا ہوں اسکی رائے کو ترجیح دیتا ہوں—— میرے مزاج، میری افتاد طبع اور میری احتیاط کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے کہ آپ کے اس شہر لاہور ہی کی نہیں بلکہ عالم اسلام کی مشہور علمی درس گاہ اور دارالعلوم کی ایک جید شخصیت، عالم دین، شیخ الحدیث کی خدمت میں آج سے قریباً ڈھائی سال قبل میں نے حاضر ہو کر اپنی تمام کتابیں ان کے قدموں میں ڈال دیں اور ان سے عرض کیا کہ اگر ان میں سے آپ

کسی بات کی نشاندہی فرمادیں جو ائمہ اربعہؒ اور امام بخاری رحمہم اللہ کے دائرے سے باہر کی ہیں تو میں ان کتابوں سے حذف کردوں گا ــــ میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف حنفیت میں منحصر ہے تو میرا راستہ اور ہے اور آپ کا اور ــــ انہوں نے کہا ہم ایسی بات کیسے کرسکتے ہیں' جب کہ ہم ان سب کو اہل سنت کے ائمہ تسلیم کرتے ہیں تو میں نے عرض کیا کہ میں ان شاء اللہ ان تمام باتوں سے رجوع کرلوں گا جو امت مسلمہ کے ان پانچ ائمہ عظام کے دائرے سے باہر کی ہوں گی"۔

(میثاق ستمبر ۱۹۸۴ء ص ۵۰-۵۱)

ڈاکٹر صاحب کے پیش رو مصلحین و قائدین کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ وہ جب بھی امت کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی اچھی سی "نئی تجویز" پیش کرتے ہیں "ملا" (اپنی کور ذہنی کی وجہ سے) فوراً اس کی مخالفت کرتا ہے' اور تنقید کے تیروں سے اسے چھلنی کردیتا ہے' افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس اچھی سی نئی تجویز کو یہی سانحہ پیش آیا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے اس نظریہ پر ماہنامہ "الخیر ملتان" (نومبر ۱۹۸۴ء) میں مولانا عبد القیوم حقانی (دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک) اور مولانا محمد ازہر مدیر الخیر نے شدید تنقید کی۔ اس تنقید کا پورا متن "الخیر" کے محولہ شمارے میں دیکھ لیا جائے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا نظریہ "اجماع امت" کی نفی کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے میثاق (دسمبر ۱۹۸۴ء) میں ایک طویل وضاحتی نوٹ رقم فرمایا ہے جس کے اہم نکات حسب ذیل ہیں :

۱ــــ "میری تقریر کے یہ جملے' جن پر تنقید کی گئی' ان کا

مطلب وہ نہیں تھا جو سمجھا گیا' اور اس مغالطہ کی کچھ وجہ خود راقم (یعنی ڈاکٹر صاحب) کی کج مج بیانی اور کچھ اس تقریر کے مرتب کی تقصیر ہے"۔ (میثاق دسمبر ۱۹۸۴ء ص ۲۴)

۲ ـــــ " تقلید واجتہاد کے مسئلہ میں) میں اپنا موقف اپنے ہی الفاظ میں بیان کئے دیتا ہوں :

" ان تمام مسائل کے ضمن میں' جو ائمہ مجتہدین (اعنی ائمہ اربعہ) کے زمانے میں پیدا ہو چکے تھے اور ان پر انہوں نے پوری طرح غور و فکر کر کے اپنے فیصلے ثبت فرمادیئے ہیں ان میں سے

(الف) جن مسائل میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہو ان کے ضمن میں تو اجتہاد مطلق تو کجا' نفس اجتہاد کے باقی رہنے کا بھی قائل نہیں البتہ

(ب) جن میں ان کے مابین اختلاف رائے ہو ان کے ضمن میں " اجتہاد" کو اس میں دائر سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کسی کے موقف کو ترجیح دیتے ہوئے اختیار کر لیا جائے' لیکن ان کے دائرے سے باہر نکلنے کو کسی طرح صحیح نہیں سمجھتا۔

جنس اجتہاد یا نفس اجتہاد کے بقا اور تسلسل کا معاملہ میرے نزدیک ان مسائل میں سے ہے جو سائنسی ترقی اور عمرانی ارتقا کے نتیجے میں بالکل نئی صورت معاملہ کی حیثیت سے پیدا ہوتے ہیں"۔

(ص ۲۷)

۳ ـــــ " مذاہب اربعہ کے ساتھ امام بخاریؒ کے مسلک کے اضافہ کی وجہ ڈاکٹر صاحب نے یہ بتائی ہے کہ :

"اہل سنت کا ایک گروہ برصغیر پاک وہند میں معتد بہ تعداد میں موجود ہے جو غیر مقلد یا اہل حدیث یا سلفی مسلک' الغرض مختلف ناموں سے موسوم ہے ------ اکثر وبیشتر مسائل میں یہ حضرت امام بخاریؒ کے اجتہادات ہی کا اتباع کرتے ہیں"۔

(ص۲۹)

۴" ----- چونکہ ڈاکٹر صاحب کا خود تعلق بھی اسی مکتب فکر سے ہے اس لئے موصوف نے اپنی ذات کی حد تک "نیم تقلید" کا جو دائرہ بنایا ہے اس میں ائمہ اربعہ کے ساتھ ساتھ امام بخاریؒ کو بھی شامل کیا ہے وہ علما کرام سے اپنی ذات کی حد تک اس اجازت کے طلب گار ہیں کہ اپنی تقلید کو ان ائمہ خمسہ کے دائرہ تک وسعت دیدیں۔

(ص۳۰)

گویا یہ نیم تقلید کا دائرہ ڈاکٹر صاحب نے صرف "اپنی ذات کی حد تک" تجویز فرمایا ہے اس کو عام کلیہ سمجھنا صحیح نہیں۔

۵ -------- مستقبل میں کسی مجتہد مطلق کے کھڑا ہونے کی دعا کا جو ذکر ڈاکٹر صاحب کی تقریر میں آیا تھا وہ بات ایک خاص تناظر میں کہی گئی تھی' اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں :

" بہرحال میں واضح الفاظ میں صراحت کرتا ہوں کہ میرے اس قول سے مراد صرف اس درجے میں امکان کو تسلیم کرنا ہے جس درجے میں ہم عموماً "بفرض محال" کسی بات کا ذکر کرتے ہیں۔ میں اس سے قطعی اعلان برات کرتا ہوں کہ میں اس کا داعی یا مبلغ ہوں یا کسی درجے میں مجوز ومحرک ہوں"۔

(ص۲۶)

۶ــــ فرقہ واریت کی شدت کو کم کرنے سے موصوف کی مراد یہ ہے کہ :

"مختلف فقہی مسالک کے ماننے والے ان پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے سینوں اور دلوں میں وسعت پیدا کریں اور ایسا نہ ہو کہ "قولنا صواب لکن متحمل الخطا وقول غیرنا خطا محتمل الصواب" صرف کہنے اور لکھنے میں آئے اور عملی صورت یہ ہو کہ فقہی اختلافات کی بنا پر ہمارے دلوں میں بُعد پیدا ہوجائے اور ہم مل جل کر شانہ بشانہ منکرات، فواحش کے خلاف جہاد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی سعی، اور غلبہ اقامت دین کی جدوجہد میں شریک نہ ہو سکیں"۔ (ص ۲۸)

اس ناکارہ نے ڈاکٹر صاحب کی وضاحت کے اہم نکات قریب قریب انہی کے الفاظ میں درج کردیئے ہیں جو حضرات ان کی پوری تحریر دیکھنا چاہیں وہ "میثاق" کا دسمبر ۱۹۸۴ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں۔ امید ہے کہ موصوف کی یہ توضیحات ان کے ناقدین کے لئے بڑی حد تک اطمینان و تسلی کا موجب ہوں گی۔ تاہم اس ضمن میں چند گزارشات ڈاکٹر صاحب کے گوش گزار کرنا مناسب ہوگا :

مذاہب خمسہ کا دائرہ کھینچ کر ڈاکٹر صاحب نے علماکرام سے اس دائرے کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت طلب فرمائی ہے ہمارے خیال میں انہیں اس اجازت طلبی کی مطلق ضرورت نہیں تھی، کیونکہ اول تو یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وہ مسلکاً اہل حدیث ہیں، اور اس فقہی مسلک کو اختیار کرنے کے لئے کسی سے اجازت طلب کرنا خارج از بحث ہے۔ ثانیاً وہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم کے فیض یافتہ ہیں، اور ان کے ذوق و مشرب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب کہ اس سلسلہ میں مولانا مرحوم کا فتویٰ حسب ذیل ہے :

"کیا ایک فقہی مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا گناہ ہے؟"

"سوال : ہمارے اس زمانہ میں مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی پابندی پہلے سے زیادہ لازمی ہو گئی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا کوئی صاحب علم و فضل چار معروف مذاہب فقہ کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرنے یا اجتہاد کرنے کا حقدار ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کس دلیل سے؟ اور اگر جائز ہے تو پھر طحاوی میں ایک بڑے صاحب کمال فقیہ کے اس قول کا کیا مطلب ہے؟

"المنتقل من مذهب الى مذهب باجتهاد وبرهان آثم يستوجب التعزير"۔

جواب : میرے نزدیک صاحب علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بنا پر کسی ایک سکول کے طریقے اور اصول کا اتباع کرنا اور چیز ہے اور تقلید کی قسم کھا بیٹھنا بالکل دوسری چیز اور یہی آخری چیز ہے جسے میں صحیح نہیں سمجھتا' رہا طحاوی کا وہ فتویٰ جو آپ نے نقل کیا ہے تو وہ خواہ کتنے ہی بڑے عالم کا لکھا ہوا ہو میں اس کو قابل تسلیم نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک ایک مذہب فقہی سے دوسرے مذہب فقہی میں انتقال صرف اس صورت میں گناہ ہے جب کہ یہ فعل خواہش نفس کی بنا پر ہو نہ کہ تحقیق کی بنا پر"۔

(ترجمان القرآن۔ رجب' شوال سنہ ۶۳ء جولائی۔ اکتوبر ۶۴ء)

رسائل و مسائل' حصہ اول ص ۱۶۰' ۱۶۱' مطبوعہ لاہور' طبع دوم سنہ ۱۹۶۳ء)

مولانا سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے یہ فتویٰ غریب طحطاوی کا نہیں' بلکہ علامہ طحطاوی نے اہل علم کا فتویٰ نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بار بار مذہب تبدیل کرتا پھرے وہ مستحق تعزیر ہے کیونکہ اس کا یہ فعل خواہش نفس اور تلعب بالدین کے ذیل میں آتا ہے' خواہ وہ اجتہاد و برہان کا دعویٰ کرے۔

ثالثاً ------- جدید تعلیم کے اثرات کی وجہ سے ہمارے آج کل کے "محققین" میں "اجتہاد" کی وبا عام ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر (الاماشاء اللہ) اجتہاد کی حقیقت وماہیت' اس کے لوازم و شرائط' اس کے موارد و مواقع اور اس کی ضرورت و غایت سے بھی واقف نہیں' لیکن ان میں سے ہر شخص اجتہاد کے مرض میں مبتلا ہے اور چشم بد دور اپنے تئیں ابو حنیفہؒ و شافعیؒ سے کچھ اونچا ہی سمجھتا ہے' کم نہیں' خود ڈاکٹر صاحب کے استاذ جناب مولانا امین احسن اصلاحی کی زندہ مثال موجود ہے' جو بے چارے اجتہاد کے اسی "وبائی بخار" میں نہ صرف یہ کہ خود مبتلا ہیں۔ بلکہ انہوں نے ایسے بلند پایہ مجتہدین کا ایک حلقہ بھی پیدا کرلیا ہے جو حضرات ائمہ مجتہدین کو سادہ لوح اور صحابہ کرامؓ کو (جن کے جنتی ہونے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی) غنڈے اور بدمعاش کہنے سے بھی نہیں شرماتے (اصلاحی صاحب نے "تدبر قرآن" سورہ نور میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان کے شاگردوں نے مجلّہ "الاعلام" میں)۔

اجتہاد کی ایسی وبائے عام کے دور میں ڈاکٹر صاحب کا صرف مذاہب خمسہ کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت طلب کرنا نرا تکلف نہیں تو اور کیا ہے؟ علمائے کرام نے ان "وبائی مجتہدین" ہی کا کیا بگاڑ لیا تھا جو ڈاکٹر صاحب کے ہلکے پھلکے اجتہاد کا (یا موصوف کی اصطلاح میں "نیم مقلدی مسلک" کا کیا بگاڑ لیں گے)۔

ا — دقیق علمی مباحث پر اظہار خیال میں بڑی احتیاط اور ہمہ پہلو نظر کی ضرورت ہے اس کے لئے جہاں بیان کرنے والے کے لئے بڑی گہری بصیرت اور راسخ علم درکار ہے وہاں سامعین میں ان مباحث کو سمجھنے کی صلاحیت ضروری ہے۔ ایسے مسائل پر ڈاکٹر صاحب ایسے شخص کا (جو اپنے آپ کو ان پڑھ اور "امی امتی" لکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں) عوام کے مجمع میں "اظہار خیال" کرنا بڑی ہی عجیب سی بات ہے' شاید یہ بھی اسی وبائی مرض کا اثر ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ورنہ بے چارے عوام کے سامنے جن کی ذہنی سطح معلوم ہے ڈاکٹر صاحب اجتہاد کے موضوع پر خطاب کرنے اور نئی اصطلاحات وضع کرکے لوگوں کو پریشان کرنے سے ضرور گریز کرتے پھر نہ اہل علم کو ان کے "خطاب" پر اشکالات پیدا ہوتے' اور نہ انہیں طویل وضاحتی نوٹ لکھنے کی ضرورت لاحق ہوتی۔ بہرحال اس ناکارہ کا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ ایسے دقیق نظری مسائل جو ان کی بساط علم سے باہر ہیں ان پر اگر اظہار خیال نہ فرمایا جائے اور اس سنگلاخ زمین کو انہی لوگوں کے لئے چھوڑ دیا جائے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں تو یہ چیز ڈاکٹر صاحب کے حق میں بہتر ہوگی۔ اور اگر وہ ان نظری مباحث میں الجھ کر رہ گئے تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنے دامن کو تار تار ہونے سے نہیں بچاسکیں گے۔ ان کے پیشرو مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کو بھی علمائے کرام نے یہی مشورہ دیا تھا جو افسوس کہ ان کی بارگاہ میں شرف پذیرائی حاصل نہ کرسکا' اس کا نتیجہ جو نکلا وہ ڈاکٹر صاحب کو بھی معلوم ہے۔

۳ — ڈاکٹر صاحب نے "فرقہ واریت" کے خلاف جو "جہاد بالقرآن" کا اعلان فرمایا ہے وہ ان کی اس توضیح کے باوصف بھی (جو فقرہ نمبر۶ میں نقل کرچکا ہوں) دانش مندی وتدبر کے خلاف ہے' کیونکہ اہل سنت کا یہ مسلکی اختلاف کبھی تعاون علی البر

والتقویٰ کے راستہ میں رکاوٹ نہیں بنا۔ اس کو "فرقہ واریت" سے تعبیر کرنا اور اس کے خلاف "جہاد بالقرآن" کا طبل بجانا ان تمام اکابر کی اہانت کے مترادف ہے، جو مختلف مسالک حقہ سے وابستہ ہیں۔

مجھے تسلیم ہے کہ ہر طبقہ میں غیر معتدل مزاج کے لوگ بھی ہوا کرتے ہیں جو ان فقہی و مسلکی اختلافات کو جنگ وجدال کا اکھاڑہ بنالیتے ہیں، ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب انہی کے خلاف "جہاد بالقرآن" کرنے چلے ہوں لیکن ایسے لوگوں کا علاج طبل جنگ نہیں، بلکہ حکمت ودانائی کے ساتھ انہیں دعوتی مقصد کی طرف متوجہ کردینا ہے ——— میں یہاں حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی تبلیغی تحریک کو مثال کے طور پر پیش کروں گا، جو حق تعالیٰ شانہ کے لطف واحسان سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں پر انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اور جس میں اہل سنت کے تمام مسالک حقہ ایک خاندان کی طرح جڑے ہوئے ہیں، اس تحریک کے اکابر کی طرف سے کبھی فرقہ واریت کے خلاف جہاد کا اعلان نہیں ہوا، بلکہ صرف دعوت الی اللہ پیش کی جاتی ہے، ایمان ویقین کو دلوں میں اتارا جاتا ہے، علم وذکر کی تلقین کی جاتی ہے، اعمال کے فضائل بتائے جاتے ہیں، مسلمانوں کا اکرام سکھایا جاتا ہے، راہ خداوندی میں محض رضائے الٰہی کے لئے جان ومال لگانے کی ترغیب دی جاتی ہے، ایثار وقربانی کے عملی نمونے پیش کئے جاتے ہیں، اس کے نتائج سب کے سامنے ہیں، اکابر تبلیغ کی طرف سے یہ بھی ہدایت ہے کہ تبلیغی حلقوں میں صرف فضائل بیان کئے جائیں مسائل بیان نہ کئے جائیں، بلکہ جس شخص کو جس عالم پر اعتماد ہو اس سے انفرادی طور پر مسائل دریافت کرے۔

دور جدید کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ خوبصورت نعروں کی گردان تو خوب کی جاتی ہے، مثلاً ہر شخص اٹھتے بیٹھتے یہ نعرہ لگاتا ہے کہ مسلمانوں کو متحد ہو کر "بنیان

مرصوص" بن جانا چاہئے۔ یہ نعرہ بجائے خود بڑا دلکش ہے لیکن اتحاد کے نعرے جس زور وشور سے لگائے جاتے ہیں اسی رفتار سے انتشار بڑھتا جارہا ہے ڈاکٹر صاحب کا یہ اعلان بھی کہ فرقہ واریت کے خلاف جہاد بالقرآن کیا جائے' اسی نوعیت کا ایک خوش کن نعرہ ہے اس سے فرقہ واریت کو تو کوئی آنچ نہیں پہنچے گی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی "تنظیم اسلامی" کے رفقا کا یہ ذہن ضرور بن جائے گا کہ ائمہ کے فقہی اختلافات "فرقہ واریت" ہیں۔ ہمیں ان اختلافات سے بالاتر ہونا چاہئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ تنظیم اسلامی خود ایک فرقہ بن جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب چلے تو فرقہ واریت کے خلاف جہاد بالقرآن کرنے' لیکن بالآخر خود ایک فرقہ بنا کر چلتے بنیں گے۔ اور صرف یہ اندیشہ ہی نہیں بلکہ ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے جس قدر گمراہ فرقے اس وقت موجود ہیں تم انہیں علما کے اختلافات اور فرقہ واریت کے خلاف وعظ کہتے سنو گے' ان کے اسی ذہن نے انکو نئے فرقے میں تبدیل کردیا ہے۔ قادیانیت پرویزیت اور جماعت المسلمین سے لے کر ڈاکٹر عثمانی کی "حزب اللہ" تک کا یہی نعرہ اور یہی تکنیک ہے۔

ڈاکٹر صاحب بھی لاشعوری طور پر ٹھیک انہی کے نقش قدم پر فرقہ واریت کے خلاف جہاد کرنے جارہے ہیں۔

______ڈاکٹر صاحب نے فقرہ نمبر۲ کی شق (ب) میں جو فرمایا ہے :

"جن مسائل میں ان (ائمہ اربعہ) کے مابین اختلاف رائے ہو ان کے ضمن میں "اجتہاد" کو اس میں دائر سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کسی کے موقف کو ترجیح دیتے ہوئے اختیار کرلیا جائے لیکن ان کے دائرے سے باہر نکلنے کو کسی طرح صحیح نہیں سمجھتا۔"

(ص ۳۰)

ڈاکٹر صاحب کی اس بات کو اصولی طور پر تسلیم کرلینے کے باوجود یہاں دو

سوالوں پر غور کرنا ضروری ہے ایک یہ کہ آیا یہ حق ہر شخص کو حاصل ہے کہ اپنے "اجتہاد" کے ذریعے مذاہب اربعہ میں سے جس کے موقف کو جب چاہے ترجیح دے لیا کرے یا اس کے لئے خاص اجتہادی صلاحیت بھی درکار ہے؟ اور اگر ایسی کوئی صلاحیت شرط ہے تو اسکا معیار کیا ہے؟ دوم یہ کہ یہ اجتہاد خاص ناگزیر حالات وضرورت کے تحت ہوگا یا ایسی کوئی پابندی نہیں؟ افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی پوری تحریر میں ان دونوں سوالوں کی طرف توجہ نہیں کی گئی---- اور اس سلسلہ میں خود اپنے "اجتہاد" کی جو دو مثالیں ذکر فرمائی ہیں ان سے عجیب وغریب کیفیت سامنے آتی ہے ان میں سے ایک تو "فاتحہ خلف الامام" کا مسئلہ ہے اور دوسرا مزارعت کا' جو غالباً مولانا محمد طاسین صاحب کے مقالہ سے تاثر کا نتیجہ ہے---- فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں تو ڈاکٹر صاحب کا امام بخاریؒ کے مسلک کو اختیار کرنا قابل فہم ہے کیونکہ کسی ایسے شخص کے لئے' جو اہل حدیث مکتب فکر سے منسلک ہو' امام بخاریؒ کے قول کی ترجیح ایک فطری سی بات ہے اس لئے میں ان کے اس اختیار وترجیح پر گفتگو کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں' لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ مزارعت کے مسئلہ میں امام بخاریؒ کا قول ترک کرنے پر اپنے دل ودماغ کے ہاتھوں کیوں مجبور ہوگئے؟ حالانکہ دلائل کے اعتبار سے بھی یہ مذہب قوی ہے یہی جمہور صحابہؓ وتابعینؒ کا قول بھی ہے' اور یہی فقہ حنفی کا "مفتیٰ بہ" مسئلہ بھی ہے---- اور پھر ضرورت بھی اسی کی مقتضی ہے---- اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی طرح ہر شخص کو مذاہب خمسہ کے دائرے میں گھومنے پھرنے کی اجازت دیدی جائے تو وہ کس طرح چن چن کر شاذ یا کم از کم مرجوح اقوال کو ترجیح دینے لگے گا' اور ڈاکٹر صاحب کی طرح دلیل صرف یہ پیش کردیا کرے گا کہ "میں اپنے دل ودماغ کے ہاتھوں ایسا کرنے پر مجبور ہوں"۔

علمائے حقانی نے مذاہب اربعہ میں سے کسی قول کو اختیار کرنے کا دروازہ کبھی بند نہیں کیا (جس کو دوبارہ کھلوانے کی ڈاکٹر صاحب سفارش کرتے ہیں) البتہ اس کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ شرط عائد کی ہے کہ اس راستہ پر پھونک پھونک کر قدم رکھا جائے۔ کسی ناگزیر ضرورت کی بنا پر ایسا کیا جائے' محض تشہی (یعنی "میں دل ودماغ کے ہاتھوں مجبور ہوں") اس کا منشا نہ ہو' پھر اس راستہ میں انفرادی قدم اٹھانے سے پرہیز کیا جائے' اہل علم وفہم کے مشورے سے کوئی فیصلہ کیا جائے۔ پھر جب مذہب کو اختیار کیا جائے اس کے تمام شروط کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ یہ نہ ہو کہ "آدھا تیتر آدھا بٹیر" قسم کا اجتہاد کرکے یہ فرض کرلیا جائے کہ اس مسئلہ میں ہم نے فلاں امام کا قول لے لیا ہے۔ ماضی قریب میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے رسالہ "الحیلة الناجزہ" میں حنفی مسلک کو چھوڑ کر مالکی مسلک اختیار کیا گیا جس میں مندرجہ بالا تمام شرائط کو احتیاط سے ملحوظ رکھا گیا' حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور حضرت بنوریؒ کے زمانہ میں اسی مقصد کے لئے مجلس مشاورت قائم کی گئی تھی' اور اس نے بعض اہم فیصلے بھی کئے---- الغرض ڈاکٹر صاحب نے مذاہب اربعہ کے دائرے میں رہ کر "اجتہاد" کرنے کا جو اصول بیان فرمایا ہے وہ عند الضرورت اپنی جگہ صحیح ہے اور علمائے حقانی کا معمول بہ بھی---- لیکن بحث اس میں ہے کہ ایسے "اجتہاد" کا اہل کون ہے؟ اور یہ کہ اس کی اجازت کن حالات میں ہے؟ ورنہ اس "اجتہاد" کو بھی اگر بے لگام چھوڑ دیا جائے تو اس کی سرحدیں اباحیت کے ساتھ جا ملتی ہیں۔

۴------ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بھی بالکل بجا ہے کہ :

"جنس اجتہاد نفس اجتہاد کے بقا وتسلسل کا معاملہ میرے نزدیک ان مسائل میں سے ہے جو سائنسی ترقی اور عمرانی ارتقا کے

نتیجے میں بالکل نئی صورت معاملہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں"۔

(ص ۲۷)

ظاہر ہے کہ جب ایک بالکل نئی صورت سامنے آئے گی تو اہل علم کے لئے اس پر غور کرکے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ قرآن و سنت اور اشباہ ونظائر کی روشنی میں اس کا حکم کیا ہوسکتا ہے؟ لیکن میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ سائنسی ترقی اور عمرانی ارتقا کے حوالے سے دین کے قطعی مسائل میں کتر بیونت بھی ہمارے دور حاضرہ کے "مجتہدین" کا روزمرہ کا معمول بن چکی ہے' وہ ہر جگہ یہ موٹا سا اصول جاری کرلیتے ہیں کہ فلاں صورت حال زمانہ نبویؐ اور فقہا کے زمانے میں نہیں تھی۔ بالکل "نئی صورت حال" ہے۔ اس لئے اس پر قرآن و سنت کے نصوص کا اطلاق نہیں ہوسکتا ہے اور نہ فقہا کے اجتہادی فیصلے اس پر لاگو ہوتے ہیں۔ اس میں ہمیں بالکل نیا اجتہاد کرنا چاہئے۔ اس کی مثال عورت کی دیت وقصاص کا مسئلہ ہے جس پر ہمارے محققین نے حال میں ہی "اجتہاد" کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ جب اندرون ملک کی اجتہادی سرگرمیاں کافی نہ ہوئیں تو باہر سے جناب معروف دوالیبی اور شیخ مصطفیٰ الزرقا کو تشریف آوری کی زحمت دی گئی' ان "عرب شیوخ" نے جو کچھ فرمایا اس کا مغز اور خلاصہ یہی تھا کہ کسی زمانے میں خاندان کا معاشی بوجھ صرف مرد کے کندھوں پر تھا' لیکن اب حالات بدل چکے ہیں' عورت اپنا معاشی کردار ادا کرنے لگی ہے' اور معاشی بوجھ اٹھانے میں مرد کے ساتھ برابر کی شریک ہے لہٰذا اب عورت کی دیت بھی مرد کے برابر ہونی چاہئے۔ فیا سبحان اللہ۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ ان شیوخ کی تقریر میں' جو نئے حالات کے تحت نئے "اجتہاد" کا وعظ فرمانے کے لئے ہمارے یہاں تشریف لائے تھے' کیا کیا سقم ہے میں یہاں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ نئے حالات کے نئے مسائل سے نمٹنا

بلاشبہ اہل علم کا فریضہ ہے (اس کو خواہ ڈاکٹر صاحب کی اصطلاح میں نفس اجتہاد کا تسلسل کہہ لیا جائے) لیکن عمرانی ارتقا کے حوالے سے دین کے قطعیات میں قطع وبرید شروع کردینا اور ہر مدعی اجتہاد کو کھلی چھٹی دے دینا کہ وہ نئے حالات میں جیسے چاہے نئے فتوے صادر کرتا پھرے، کسی طرح بھی قرین عقل وقیاس نہیں، بہرحال ڈاکٹر صاحب کا نفس اجتہاد کے بقا کا نظریہ اپنی جگہ صحیح ہونے کے باوجود بڑی احتیاط کا مقتضی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے زیر بحث خطاب میں متعدد گوشے ابھی باقی ہیں جن پر تنبیہہ کی ضرورت ہے، لیکن مضمون اندازے سے زیادہ طویل ہوگیا۔ اس لئے باقی نکات پر کبھی فرصت ہوئی تو پھر عرض کروں گا البتہ ایک بات کا اوپر وعدہ کرچکا ہوں اس لئے مختصراً اس کا عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطاب میں بھی، اور اپنے وضاحتی نوٹ میں بھی اپنے لئے "امی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امی امتی" کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے چنانچہ وضاحتی نوٹ میں اپنے رفیق شیخ جمیل الرحمٰن کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

> "اس سب کے باوصف یہ اندازہ تو جملہ قارئین "میثاق" کو ہو ہی گیا ہوگا کہ وہ بھی بالکل میری طرح، امی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) کے امی امتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ میری طرح ان کی تحریروں میں بھی بعض فاش غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ ادھر میرے "ان پڑھ" ہونے کا یہ عالم ہے کہ ـــــــــ"۔
>
> (میثاق دسمبر ۱۹۸۴ء ص ۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب مقدس ـــــ امی ـــــ مدح کے لئے ہے۔ اور آپ ﷺ کی امیت آپ ﷺ کی نبوت کی ایک مستقل دلیل

ہے۔ لیکن کسی امتی کے حق میں تو یہ لفظ بطور مدح استعمال نہیں ہوتا (الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کو علم لدنی سے سرفراز فرمایا گیا ہو) اب اگر "امی نبیؐ کا امی امتی" میں امی کا لفظ مدح کے لئے ہے تو ڈاکٹر صاحب پر اس لفظ کا اطلاق کیسے ہوتا ہے؟ اور اگر یہ "کسر نفسی" کے لئے ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ ملانے کی کیا تک ہے---- علاوہ ازیں امی تو اس شخص کو کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو' اس اعتبار سے بھی اس کا اطلاق ڈاکٹر صاحب پر محض تک بندی ہے الغرض اگر ڈاکٹر صاحب "امی نبیؐ کا جاہل یا بے علم امتی" لکھتے تو صحیح تھا' مگر "امی نبیؐ کا امی امتی" لکھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں سوء ادب کا پہلو رکھتا ہے۔

بظاہر یہ ایک لفظی سا مناقشہ ہے' لیکن ایک تو معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا ہے' اس لئے اس پر تنبیہہ کرنا ضروری ہوا۔ دوسرے میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب (اپنی تمام خوبیوں کے باوصف) چونکہ علم راسخ نہیں رکھتے۔ اس لئے معمولی علمی تعبیرات میں بھی ان سے کیسی کیسی لغزشیں ہوتی ہیں' جن میں ان کو تنبہ بھی نہیں ہوتا۔

آخر میں یہ گزارش کرنا بھی ضروری ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے محض خیر خواہی کے جذبہ سے لکھا ہے' ڈاکٹر صاحب کی شان کے خلاف کوئی بات نکل گئی ہو تو اس پر پیشگی معذرت کا طالب ہوں' واللہ العظیم۔

میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ ان سے عرض کیا جائے کہ آپ ایک نئی جماعت بنا کر اور بیعت کی نئی طرح ڈال کر امت کو کسی نئی آزمائش میں مبتلا نہ کریں' یہ امت نئی نئی اصطلاحات' اور دین کے نام پر وجود میں آنے والی نئی نئی تنظیموں کے چرکوں سے پہلے ہی چور چور ہے' خدارا اس پر رحم کیا جائے اس کو کسی نئی تنظیم' نئی بیعت اور نئی اصطلاحات کی آزمائش سے معاف

رکھا جائے بہرحال ان کے علمی ضعف کے پیش نظر میں ڈاکٹر صاحب کو وہی مشورہ دوں گا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کو دیا تھا :

یا ابا ذر! انی اراک ضعیفا، وانی احب لک ما احب لنفسی، لا تامرن علی اثنین ولا تولین مال یتیم۔

(رواہ مسلم (مشکوٰۃ ص۳۲۰)

ترجمہ :"ابو ذر! میں تمہیں کمزور دیکھتا ہوں اور میں تمہارے لئے وہی پسند کرتا ہوں، جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں۔ کبھی دو آدمیوں کا بھی امیر نہ بننا اور کبھی یتیم کے مال کا متولی نہ بننا"۔

اقول قولی ھذا۔ واستغفر اللہ العظیم۔ وما ابری نفسی۔ ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی۔ ان ربی غفور رحیم۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه
صفوۃ البریۃ سیدنا ومولانا محمد
وآله وصحبه واتباعه اجمعین الیٰ یوم الدین۔

(بینات ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ)

مولانا محمد حنیف ندوی

اساسیات اسلام کے آئینہ میں

"مولانا محمد حنیف ندوی ایک بلند پایہ مفکر و ادیب اور مصنف کی حیثیت سے علمی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں- اہل حدیث مسلک سے تعلق ہے- فلسفہ ان کا خاص موضوع ہے، امام غزالیؒ، ابن تیمیہؒ، ابن خلدونؒ اور اشعریؒ کے افکار کی تشریح و توضیح میں ان کی فکری کاوشیں منظر عام پر آچکی ہیں، ان کی نئی کتاب: "اساسیات اسلام" کے نام سے (جو کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور، کی مطبوعہ ہے) ہمارے ہاتھوں میں ہے-

چونکہ کتاب کے نام سے کتاب کے موضوع کی وضاحت نہیں ہوتی اس لیے سرورق پر کتاب کا موضوع ان الفاظ میں مشخص کیا گیا ہے: "اسلام کی روشنی میں فرد اور معاشرہ کے فکری اور تہذیبی مسائل کا تجزیہ اور حل"-

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف موصوف مغرب اور مغربی افکار سے مرعوب ہیں بلکہ انہیں اسلام اور علمأ اسلام سے شکایت ہے کہ وہ دورِ حاضر کی جاہلیت

جدیدہ کو سندِ جواز کیوں نہیں دیتے؟ ذیل میں ہم کتاب کے مندرجات کی روشنی میں مصنف کی سوچ و فکر اور افطار وخیالات کا جائزہ لیں گے۔

مغرب کے صنعتی انقلاب نے جس جاہلیت جدیدہ کو جنم دیا اس نے نہ صرف بے شمار مسائل، ان گنت ناہمواریوں، لاتعداد تضادات اور بے حد الجھنوں کے تحائف سے جدید انسان کو نوازا بلکہ اسے انسانی قدروں اور روحانی رشتوں سے اس حد تک محروم کردیا کہ وہ اچھا خاصا حیوان آکل بن کر رہ گیا، بیضۂ مور کی طرح اس کی تگ و تاز کا میدان اس فضائے نیلگوں تک محدود ہے، وہ مادیت کے ایک ایک شعبہ حیات کے لئے مستقل سائنس رکھتا ہے، کیڑے مکوڑے اور درختوں کے پتے تک اس کی سائیٹیفک ریسرچ کا موضوع بنے ہوئے اس کی سائنسی تحقیقات سے مشرف ہورہے ہیں، لیکن جو چیز اس کی نظر التفات سے محروم ہے وہ خود اس کا فلسفہ موت وحیات اور قلب ونظر کی سائنس ہے، جسے مذہب کہا جاتا ہے اور جو انسان کے سر پر ولقد کرمنا بنی آدم کا تاج رکھ کر صرف اقلیم مادیات کی سیادت وقیادت ہی اسے عطا نہیں کرتا، بلکہ خدا تعالیٰ کی معصوم اور نورانی مخلوق کو اس کے آگے سرنگوں دیکھنا چاہتا ہے : واذ قلنا للملائکۃاسجدوالآدم۔

جدید انسان کا گوشہ چشم کبھی اپنے فلسفہ زیست (مذہب) کی طرف ملتفت ہوا بھی تو اس نیت سے نہیں کہ وہ اس کے ذریعہ شرف انسانیت کی تکمیل کا مواد فراہم کرے، یا اپنے داغ جگر اور افسردگی قلب کا مداوا ڈھونڈے، بلکہ اس نقطہ نظر سے کہ : مادیت کے جدید اسلحہ سے مذہب کی روح کو کچلنے میں کامیابی کس طرح حاصل کی جائے؟

الغرض آج کا جدید انسان' سائنسی انسان اور مشینی انسان' مذہب بیزاری کی بدولت روحانی خودکشی کر چکا ہے' وہ خود اپنے ہاتھوں جس قدر مظلوم' بے بس' محروم اور بے مقصد بن چکا ہے' تاریخ نے اپنے طویل ترین سفر میں اسے کبھی اتنا مظلوم اور لاچار نہیں دیکھا ہوگا' مولانا ندوی نے صحیح لکھا ہے :

"مادیت کے اس بڑھتے ہوئے ریلے میں دنیا کس عظیم خطرے سے دوچار ہے' اس کو سمجھنے کے لیے یورپ اور امریکہ کے اس لٹریچر کو پڑھنا چاہیے جس کو وہاں کے "مستقبل آشنا" اہل دانش نے ترتیب دیا ہے' ان کا کہنا ہے کہ اگر سائنس اور ٹیکنالوجی کے ترقی پذیر تقاضوں کے لئے کوئی نصب العین نہ وضع کیا گیا' یا ارتقا برائے ارتقا کے اصول پر پابندیاں عائد نہ کی گئیں اور اس چیز کے مواقع فراہم کئے جاتے رہے کہ لذت ایجاد کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے' تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ خود تہذیب انسانی کے لئے خطرات پیدا ہو جائیں گے' مثلاً دھوئیں اور گیس سے ساری فضا زہر آلود ہو جائے گی' انسانی اختیار اور نشاط آفرینی کا دائرہ نت نئی ایجادات سے تنگ سے تنگ تر ہوتا جائے گا.... سب سے بڑھ کر خطرہ یہ ہے کہ بالآخر یہ انسان مشینوں کی دائمی رفاقت سے خود مشین بن کر رہ جائے گا اور وہ اپنا روحانی اور اخلاقی تشخص کھو بیٹھے گا' جس کی وجہ سے یہ مسجود ملائک قرار پایا تھا۔"

(ص ۱۳۲)

"ہمارے نزدیک سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ ارتقا

نے جس سب سے بڑے خطرے کو جنم دیا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب نے روحانی اور اخلاقی قدروں سے محرومی اختیار کرلی ہے' جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ علاوہ ان خطرات کے جن کی طرف "مستقبل آشنا" دانشوروں نے اشارہ کیا ہے' وہ قاہر وبااختیار انسان' جس نے اس مادی تہذیب کی تخلیق کی تھی' خود اس کے مقابلہ میں بے بس اور مجبور ہو کر رہ گیا ہے' اس کا اختیار اس سے چھن گیا ہے اور یہ قطعی اس لائق نہیں رہا کہ تہذیب کے اس اسپ تیز رفتار کو روک سکے' اس کی منہ زوریوں کا مداوا کرسکے' یا اس کے لئے راہ منزل کا تعین کرسکے"۔

(ص ۱۳۴)

جدید انسان کی اس محرومیت کے اسباب و عوامل کیا تھے؟ اس نے بقائمی عقل و خرد قبائے مذہب کیوں اتار پھینکی؟ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے تمام پیمانے توڑدینے پر کیوں آمادہ ہوا؟ اور اس نے گلیم مادیت پہن کر "مشینی حیوان" کی حیثیت میں زندہ رہنے کو کیوں ترجیح دی؟ اس پر طویل بحثیں ہو چکی ہیں' اور ہمارے مفکرین ایک مدت سے بے چین ہیں کہ کسی طرح جدید انسان اور مذہب کے درمیان پیدا شدہ خلیج کو پاٹ دیا جائے وہ "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر کوئی ایسا "مصالحتی فارمولا" تلاش کرنا چاہتے ہیں جو انسان اور مذہب بیک وقت دونوں کے لئے قابل قبول ہو' اور جو دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کچھ مشورے مذہب کو دیئے جائیں گے اور کچھ فرمائشیں مشینی دور کے انسان سے کی جائیں گی۔

مغرب' جو اس فتنہ سامانی کا موجد ہے' مدت ہوئی اپنے مذہب۔ عیسائیت

اور یہودیت۔ سے ایک مصالحتی فارمولا طے کرچکا ہے' اور وہ یہ کہ مذہب ہر شخص کا اختیاری وانفرادی معاملہ ہے' مذہب کو تہذیب ومعاشرت کے دوائر میں داخل ہونے اور دخل دینے کی اجازت نہ ہوگی' نہ وہ قانونی' سیاسی' اقتصادی' اور انتظامی اداروں کو کنٹرول کرے گا' نہ ان کی راہنمائی کرے گا' نہ انہیں کوئی مشورہ دے گا۔ لہٰذا مذہب لائق قبول ہے بشرطیکہ وہ اپنے جامہ سے باہر پاؤں پھیلانے کی جسارت نہ کرے' بلکہ اس کا دائرہ عمل مذہبی رسوم تک محدود رہے اور وہ بھی صرف رضاکارانہ طور پر۔ اس مصالحت کے بعد وہاں مذہب زندہ ہے مگر اس کا کوئی اجتماعی کردار نہیں' نہ وہ مادیت کے طوفان میں افراد سازی ہی کا کام کررہا ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ اس مصالحتی فارمولے پر آمادہ صلح نہیں' اس کا پہلے دن سے اعلان ہے :

> "قل الحق من ربکم' فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر' انا اعتدنا للظالمین ناراً احاط بهم سرادقها۔" (الکہف ر۲۹)

ترجمہ :" آپ (صاف صاف) کہہ دیجئے کہ حق تمہارے رب کی جانب سے (آچکا) ہے' اب جس کا جی چاہے ایمان وتسلیم کا راستہ اختیار کرے' اور جس کا جی چاہے کفر اور بے ایمانی کا راستہ لے' (اور خوب یاد رکھے کہ) بے شک ہم نے (ایسے) ظالموں کے لئے آگ تیار رکھی ہے جس کی قناتیں انہیں ہرچہار طرف سے محیط ہوں گی"۔

اسلام کسی کا منت کش احسان نہیں کہ وہ کاسۂ احتیاج لے کر کسی تہذیب کے دروازے پر دستک دے' بلکہ وہ کمال بے نیازی سے بڑی سے بڑی ترقی یافتہ خود سر تہذیبوں کو "اسلم تسلم" کی دعوت دے کر بار احسان ان پر رکھتا ہے :

"یمنون علیک ان اسلموا قل لاتمنوا علیّ اسلامکم بل اللّٰہ یمن علیکم ان ھداکم للایمان۔"
(الحجرات/۱۷)

ترجمہ :"وہ آپ پر احسان دھرتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا' آپ کہہ دیجئے کہ اپنے اسلام لانے کا احسان مجھ پر مت رکھو' بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت عطا فرمائی"۔

اسلام' خود دین فطرت ہے' وہ فطرت کے معیار اور پیمانے وضع کرتا ہے' اور انسانیت کی تمام اعلیٰ اقدار کا مجسم نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں پیش کرکے تمام انسانیت کو دعوت دیتا ہے کہ اپنے تہذیبی معیاروں کی پیمائش اس پیمانے سے کرکے دیکھو کہ وہ صحیح ہیں یا غلط؟ وہ پیمانہ فطرت پر پوری اترتی ہیں یا نہیں؟

"لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ"
(الاحزاب/۲۱)

ترجمہ :" بے شک تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے"۔

اسلام کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ اس "پیام امن وسلامتی" کو قبول کرے :"لا اکراہ فی الدین"۔ لیکن وہ بڑی سختی سے یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ جو شخص اس گہوارہ امن میں پناہ لینا چاہتا ہے اسے اپنی خواہشات کو چھوڑ کر آنا ہوگا' آنے نہ آنے کا اختیار ہے' لیکن جو آتا ہے اسے پورے انشراح صدر کے ساتھ آنا ہوگا۔ اور "آدھا اندر' آدھا باہر" کی پالیسی پر عمل کرنے کی اسے اجازت نہیں ہوگی۔ "یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ"۔

اغراض وخواہشات انسان کی فطری کمزوری ہے' عام طور سے آدمی کسی چیز کے رد وقبول میں اغراض وخواہشات کے پیمانے استعمال کرتا ہے' حد یہ ہے کہ وہ کسی دین کو قبول کرتا ہے تو اسمیں بھی اپنی خواہشات کی آمیزش ضروری سمجھتا ہے' اور جب دین پر اغراض وخواہشات اور نفسانی پسند وناپسند کا غلاف چڑھا دیا جائے تو نہ صرف اس کی چمک دمک مدھم پڑ جاتی ہے' بلکہ رفتہ رفتہ دین کا حلیہ ہی بگڑ کر رہ جاتا ہے' یہودیت ونصرانیت اور دیگر مذاہب کو یہی حادثہ پیش آیا۔ اور وہ اپنی بقا کے لئے انسانوں کے رحم وکرم پر رہ گئے' اس لئے انہیں بہرحال مصالحتی سمجھوتہ کرنا پڑا' برعکس اس کے اسلام دائمی صداقت لے کر آیا تھا' اس کی حفاظت وصیانت کا غیبی انتظام کردیا گیا' ناممکن ہے کہ آفتاب اسلام کو انسانی خواہشات کے غبار سے بے نور کردیا جائے' اس غیبی انتظام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ
ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین

وتاویل الجاھلین۔"

(مشکوۃ شریف ص۳۶)

ترجمہ :" اس علم دین کو ہر آئندہ نسل کے ایسے دیانت دار لوگ حاصل کرتے رہیں گے جو غلوپسندوں کی تحریف' باطل پرستوں کے غلط دعاوی اور جاہلوں کی تاویل باطل کا پردہ چاک کرتے رہیں گے"۔

اس طرح دین اسلام نہ صرف کامل و مکمل ہے' بلکہ پائیدار وپائندہ بھی' اور یہ اپنی بقا کے لئے کسی کا ممنون احسان نہیں' بلکہ اس کے پاس خود کار غیبی انتظام موجود ہے' جو اس کی بقا کا خود ضامن ہے' اسی نکتہ سے "مجددین" اور "متجددین" کے درمیان جو فرق ہے واضح ہوجاتا ہے' مجددین' انسانوں کی خود تراشیدہ بدعات کے داغ دھبوں سے دامن اسلام کو صاف کرتے ہیں' اس کے برعکس "متجددین" کا شیوہ یہ ہے کہ وہ اسلام میں غلط اغراض وخواہشات کی پیوند کاری کے لئے ہمیشہ بے تاب رہتے ہیں۔

غرض اسلام اور معاشرہ کے درمیان مصالحت کا یہ تصور ہی غلط ہے جس کا تجربہ دانشوران مغرب اپنے یہاں کرچکے ہیں' اور جس کی دعوت ہمارے جدید مصلحین کی جانب سے دی جاتی ہے اور چاہا جاتا ہے کہ "آزاد اجتہاد" سے تراش کر اسلام کے کس بل نکالے جائیں تاکہ اسے معاشرہ پر منطبق کیا جاسکے۔ ممکن ہے ان میں کچھ حضرات مخلص بھی ہوں اور وہ کمال اخلاص ودل سوزی سے چاہتے ہوں کہ کسی طرح اسلام کو معاشرہ سے ہم آہنگ کیا جاسکے' لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ اسلام کی نفسیات اور اس

کے مزاج سے ناواقف ہیں' اسلام خدائے لم یزل کا آخری دین ہے' وہ اس لئے نازل نہیں کیا گیا کہ اسے حسب ضرورت توڑ موڑ کر غلط معاشروں پر چسپاں کیا جائے' وہ تو اس لئے آیا ہے کہ خود غلط معاشروں کی اصلاح کی جائے' اور انہیں اسلام کے شفاف آئینے کے سامنے کھڑا کرکے یہ دیکھا جائے کہ ان میں کس کس جگہ کیا کیا غلطیاں در آئی ہیں تاکہ ان کی نوک پلک درست کی جاسکے' ہمارے ان مصلحین کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہر موقعہ پر یہ دیکھتے ہیں کہ آج کے دانشور اسلام کے فلاں عقیدہ و نظریہ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں' اور اسلام کو کس شکل میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ چھوٹتے ہی اسلام کو اصلاحی مشورے دینا شروع کرتے ہیں' اور "آزاد اجتہاد" کے ذریعہ اس میں ترمیمی تجاویز پیش کرنے لگتے ہیں۔ ماضی قریب میں اس کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں' سود پر مبنی ساہوکاری کا دور آیا تو سود کی حلت کی تجاویز پیش ہونے لگیں۔ تعلیم نسواں کا مسئلہ اٹھا تو اسلامی پردہ کے خلاف محاذ کھول دیا گیا' اشتراکیت کا چرچا ہوا تو اس کو اسلام میں داخل کرنے کی سفارش کرنے لگے۔ وغیرہ وغیرہ

زیر نظر کتاب "اساسیات اسلام" بھی بنیادی طور پر ایک مصالحتی فارمولا کی حیثیت رکھتی ہے' جس میں تہذیب جدید کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اسلام کے نظریہ توحید و عبادات کو اپنا کر روحانیت سے بہرہ ور ہو' اور اسلام کو مشورہ دیا گیا ہے کہ جاہلیت جدیدہ کے ان کھوٹے سکوں کو سند جواز عطا کردے' جن کی ظاہری چمک دمک اور دلفریبی و رعنائی پر طفلان مغرب ریجھے ہوئے ہیں۔

ہمارے "جدید مصلحین" کا ایک طرۂ امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ جب اسلام کے موضوع پر لکھتے اور بولتے ہیں تو اس بنا پر کہ ان کے سامنے یورپ کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا پورا طومار موجود ہوتا ہے' انہوں نے ایک مومن قانت کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ مغرب کی کور باطنی اور کور چشمی کی سیاہ عینک سے اسلام کا مطالعہ کیا ہوتا ہے' اس لئے انہیں اسلام کا ماضی ہمیشہ تاریک ہی تاریک نظر آتا ہے' انہیں' غلط نگہی کی بنا پر' اسلاف کے کارناموں میں غلطیاں ہی غلطیاں نظر آتی ہیں' جنہیں دیکھ کر وہ عرق ندامت میں ڈوب ڈوب جاتے ہیں' اور یکایک ان کا لہجہ ایک ایسی معذرت پسندانہ پستی اختیار کرلیتا ہے گویا میدان محشر قائم ہے' نفسی نفسی کا عالم ہے' مگر انہیں صرف اپنے نامہ عمل کا نہیں' بلکہ بدقسمتی سے اپنے اسلاف کی "خطاؤں" کا حساب گویا آج چکانا پڑ رہا ہے۔ "اساسیات اسلام" کے مصنف کی زبانی "اعتراف خطا" کا یہ دل خراش منظر ملاحظہ ہو:

"صحت فکر اور علمی دیانت کا تقاضا ہے کہ تعمیر نو کے اس مرحلہ میں ہم اس حقیقت کو کھلے بندوں تسلیم کرلیں کہ عہد ماضی میں ہم سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں' ہم نے غیر صحت مند تمدنی رجحانات کو نہ صرف اپنایا اور قبول کیا ہے' بلکہ ان کی پرورش بھی کی ہے' اور ایسے تصورات کو اسلامی سمجھ کر سینے سے چمٹائے بھی رکھا ہے' جن کا اسلامی روح سے' اسلام کے مزاج سے اور اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی تعلق ثابت نہیں کیا جاسکتا' اس

اعتراف سے دو گونہ فائدے حاصل ہوں گے' ایک تو ماضی میں جو کچھ ہوا ہے اس کی جوابدہی سے بچ جائیں گے' دوسرے اس تضاد سے ہم مخلصی حاصل کرلیں گے جو اسلام اور مسلمان کو مترادف سمجھ لینے سے پیدا ہو سکتا ہے"۔

(ص ۱۱۹' ۱۲۰)

وہ کون سے امور تھے جن کا اسلامی روح' اسلام کے مزاج اور اسلام کی تعلیمات سے دور کا بھی تعلق ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود ہمارے اسلاف نے ان کو اسلامی سمجھ کر سینے سے چمٹائے رکھنے کی غلطی کی؟ یہ داستان خود مصنف کی زبانی سنئے :

"ہمارے ہاں علم الکلام پر اس حیثیت سے کام ہوا کہ یہ یونانی فلسفہ کی ایک شاخ ہے.... تصوف' اسلام کے مقابلے میں ایک مستقل بالذات نظام کی حیثیت سے ابھرا' جس کا دعوی یہ تھا کہ تعلق باللہ اور عبودیت وولایت کے رشتوں کو ریاضت ومجاہدہ سے ہر ہر شخص براہ راست استوار کرسکتا ہے' اسی طرح فقہ کے معنی ہمارے ہاں یہ تھے کہ نئے نئے پیش آئند مسائل (میں) کتاب اللہ اور سنت کو بحیثیت مجموعی فکر ونظر کے سامنے رکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کی تعلیمات کی روشنی میں ان مسائل کا کیا حل نکلتا ہے' اس کے بجائے یہ ہوا کہ فقہ ایک جداگانہ فن قرار پائی اور مسائل کے حل وکشود کے لئے ایسے اصول اور پیمانے وضع کئے گئے جو ایک طرف ان روحانی واخلاقی اقدار

سے بیگانہ تھے جن سے اسلامی فقہ ترتیب پاتی ہے اور دوسری طرف جن کی صحت کے بارے میں قیل و قال کی کافی گنجائش تھی' اس پر مستزاد یہ کہ بغیر کسی اجتماعی اور معاشرتی ضرورت اور تقاضے کے شاخ در شاخ مسائل تراشے گئے' اس انداز اجتہاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فقہ جسے زندگی کے مسائل حل کرنا تھے' جسے فکر و کاوش کی تازہ کاریوں سے تہذیب و تمدن کے قافلے کو آگے بڑھانا تھا' اس طرح سے زندگی کی گرانباریوں میں اضافے کا سبب بنی"۔

(ص ۱۲۰' ۱۲۱)

لیجئے یہ تھیں ہمارے اسلاف کی وہ غلطیاں یعنی علم عقائد' علم تصوف و سلوک اور علم فقہ و قانون جن پر مصنف عرق انفعال میں ڈوبے جاتے ہیں اور انہیں اپنے ماضی سے دستبردار ہوئے بغیر نہیں بن پڑتی۔ اس سے قطع نظر کہ ان اکابر (متکلمین' صوفیا اور فقہائے امت) کے بارے میں "اساسیات اسلام" کے مصنف کا دامن فکر غلط فہمیوں کے کتنے بڑے انبار کو سمیٹے ہوئے ہے' سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب وہ اسلاف سے اس قدر "حسن ظن" رکھتے ہیں اور تیرہ صدیوں کی متاع عزیز پر اس قدر نادم اور منفعل ہیں تو "تعمیر نو" کے مرحلہ میں اسلام کی تشریح و تعبیر میں وہ عقل و خرد اور علم و دانش کے کیا گل کھلائیں گے اور ان کے اصول اور پیمانے کیا ہوں گے؟ دراصل یہ ہمارے سادہ لوح مصلحین کی مخصوص تکنیک ہے' انہیں چونکہ "روح اسلام" کو سامنے رکھ کر "آزاد اجتہاد" کی دعوت

دینا ہے' اس لئے وہ پہلے مرحلے پر ان تمام اصول وضوابط سے چھٹکارا حاصل کرلیتے ہیں جو "آزاد اجتہاد" کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہوں۔ جب علم عقائد وکلام غلط اور متکلمین کے ارشادات "یونانی فلسفہ کی شاخ" قرار پائیں گے تو آپ کسی مسئلہ میں ان کا حوالہ نہیں دے سکیں گے۔ جب تصوف اسلام' اسلام سے جداگانہ ایک چیز تصور کیا جائے گا' تو مادیت کے طوفان میں اکابر اولیاء اللہ کا' جنہیں صوفیا کہتے ہیں' حوالہ بے کار ہوگا' اور جب فقہ کا رشتہ اسلام سے کاٹ دیا گیا' تو آپ "آزاد اجتہاد" کے استنباط شدہ نتائج کے مقابلہ میں یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ اس مسئلہ میں اسلام کا قانون (فقہ) تو یہ کہتا ہے' مسلمانوں کے اسلاف میں کیڑے نکالنا اور ان کے زریں کارناموں کو بھیانک شکل میں پیش کرنا ابلیس مغرب کا وہ تخریبی حربہ ہے جو انگریزی میں "اسلام کا مطالعہ" کرنے والوں کو اسلام کے بارے میں متذبذب کرنے کے لئے ایجاد کیا گیا' اور اسکے بعد انہیں "آزاد اجتہاد" کے ذریعہ "اصلاح اسلام" کی پٹی پڑھائی گئی۔

اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمایئے : آپ کو حیرت در حیرت ہوگی جب آپ یہ دیکھیں گے کہ وہی قلم' جو اسلام کے علم عقائد' علم تصوف وسلوک اور علم فقہ و قانون پر ماتم کناں نظر آتا ہے اسی کو ہم دیکھتے ہیں کہ جاہلیت جدیدہ کے "فن کاروں" پر داد و تحسین کے پھول نچھاور کرنے میں وہ کسی بخل کا مظاہرہ نہیں کرتا :

> "ہمارے نزدیک "فن کار" کا درجہ ایک مصلح سے کم نہیں' یہ بسا اوقات برش اور قلم کی ایک جنبش سے ایسے عجیب وغریب نقوش ابھار دیتا ہے جن سے قانون

و آئین کی بے مائیگی کا اندازہ ہوتا ہے، اور ایک اچھے
خاصے مہذب و شائستہ معاشرہ کی وہ بھیانک غلطیاں فکر و نظر
کے سامنے آموجود ہوتی ہیں، عام حالات میں جن کو محسوس
نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح ایک مغنی شعلہ نوا اور مطرب جاں
فزا دل میں طرب و انبساط کے بعض مرتبہ ایسے نازک
گوشوں کو بیدار کرتا ہے جن کی بیداری سے زندگی کا پورا
دبستان مہک اٹھتا ہے، فنکار کی نگاہ احتساب معاشرہ کے
عیوب ہی کو تلاش نہیں کرتی بلکہ اس کے لئے مرہم اور
مداوے کا اہتمام بھی کرتی ہے، صرف تفریح اور خوشی کے
موتی ہی نہیں بکھیرتی، زندگی کی تمام نشاط آفرینیوں میں
اضافہ کا موجب بھی بنتی ہے، زندگی کو ولولہ تازہ بھی عطا
کرتی ہے اور تہذیب و تمدن کو ادراک و احساس کے ان
لطائف سے بھی مالا مال کرتی ہے جن کے بغیر زندگی ٹھس
اور بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے، غرض فن ایک ایسی حسین
طاقت ہے، اور ایک حسین قوت ہے اور اصلاح و تعمیر کا ایسا
اسلوب ہے جو بہرحال کارگر ہوتا ہے"۔

یہ ہے فکر و نظر کا غلط زاویہ! جس سے اسلام کے مایہ ناز فرزند جن
کی زندگی کا مشن خدا و رسولؐ کے منشا کو سمجھنا اور سمجھانا تھا، خطا وار اور
مجرم نظر آتے ہیں، اور مہذب دنیا کے اوباش "مصلح" قرار دیئے
جاتے ہیں :

"بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست"

"فنون لطیفہ" اگر چہ جاہلیت قدیمہ کی یادگار ہے، مگر جدید جاہلیت نے ان بتان کہنہ کو ترقی یافتہ شکل دیکر ہوا و ہوس کے نئے صنم خانوں میں لا رکھا ہے، اور آج کے روحانی و اخلاقی اقدار سے محروم انسان نے "تفریح" کے نام پر ان کی پرستش کے نئے اسلوب وضع کئے ہیں۔ "اساسیات اسلام" کے مصنف سے توقع کی جاسکتی تھی کہ مبادی فواحش کے خلاف علم جہاد بلند کریں گے، لیکن فنون لطیفہ پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے سینما، ٹیلی ویژن، تصویر سازی اور موسیقی کے جواز کا فتوی صادر فرمایا ہے، اس سلسلہ میں ان کے "اجتہادی استدلال" کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ ان چیزوں کا رواج چل نکلا ہے، لہٰذا سائنس اور ٹیکنالوجی کے ان نتائج کو کسی بے جان فقہی بحث اور غیر موثر عدم جواز کے فتوی سے روکنا ممکن نہیں، اندریں صورت دین کے حکیمانہ انداز فکر کا داعیہ یہ ہے کہ ہم اپنے اجتہاد کو حریت پسندانہ انداز استدلال سے نکال کر افادیت ودانش کے وسیع تر سانچے میں ڈھالیں.... اور یوں سوچیں کہ اگر عہد جاہلیت کے بجائے اسلام آج نازل ہوتا تو ان مسائل کو کیونکر سلجھا پاتا.... اگر فطرت گلے سڑے فضلات غذا کو دودھ جیسی مفید اور تر و تازہ غذا میں بدل دینے پر قادر ہے، اور دوا ساز مہلک و مضر اشیاء سے حیاتین تیار کر دینے پر قدرت رکھتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک مجتہد، اجتہاد و تخلیق کے اس عملیہ سے کام نہ لے۔"

(ص ۱۴۹ تا ص ۱۵۱ ملخصاً)

یہ خیالات پریشاں خود مولانا ندوی کے ذہن کی اپج نہیں، بلکہ متجددین کے حلقے میں یہ ایک مدت سے گشت کر رہے ہیں، ایوبی دور میں ڈاکٹر فضل الرحمان نے "اسلام کی تعمیر نو" کا نعرہ لگایا تو ان کے فلسفہ تعمیر کا

تار و پود انہی افکار پریشاں سے عبارت تھا' تعجب ہے کہ مولانا ندوی ایسا منجھا ہوا مفکر' جو افلاطون و ارسطو کے افکار کے تجزیہ و تحلیل پر قدرت رکھتا ہے' جو ہیوم اور کانٹ وغیرہ کے نظریات کی تنقید کا فریضہ انجام دیتا ہے اور جو "اساسیات اسلام" کی تشریح کی نازک ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہے' وہ آخر ان بچکانہ مغالطوں کے چکر میں کیوں جا پھنسا؟ سوال یہ ہے کہ "اساسیات" کے ان مباحث کو سپرد قلم کرتے وقت مصنف نے موسس اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کامطالعہ کیوں ضروری نہیں سمجھا؟ یا "زمانہ سازی" کے خمار میں وہ حکیم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو ---خاکم بدہن ---کوئی اہمیت دینے کے لئے کیوں تیار نہیں؟ "ان چیزوں کا رواج چل نکلا ہے"۔ "یہ ہمارے معاشرہ میں زبردستی گھس آئی ہیں" اور "اب ان کو روک دینا ممکن نہیں" ایسے فقرے لکھنے سے پہلے انہیں اسلام کی نفسیات پر غور کرنا چاہیے تھا' کہ اسلام مشرق و مغرب کی تہذیبوں سے ٹکرا کر تاریخ کے دھارے بدلنے کا عادی ہے؟ یا خود تاریخ کے طوفانی ریلے میں بہ جانے کا خوگر ہے؟ وہ ہر دور کی غلط روش کے خلاف سینہ تان کر کھڑا ہونے کی دعوت دیتا ہے؟ یا ہر غلط تہذیب کے سانچے میں ڈھل جانے کی تلقین کرتا ہے؟ اسلام کو ایسے دوں ہمت' پست حوصلہ' اور کوتاہ نظر لوگوں کی ضرورت نہیں جو جہاد زندگانی میں "تو بزمانہ بساز" کی کتاب کھول کر ناصحانہ وعظ کہنا شروع کردیں' اسلام کو ایسے جوان ہمت' اولو العزم' بلند نظر اور بہادر سپاہیوں کی ضرورت ہے جو روحانیت کی بھرپور ضرب سے' تاریخی جبریت اور مادی جدلیت کے سومنات کو مسمار کرڈالیں' انسان کو لذت طلبی اور خواہش پرستی

کے طلسم سے نکال کر اسے اعلیٰ قدروں سے آشنا کردیں۔

کون نہیں جانتا کہ آج کا انسان تہذیب جدید کے رنگ وبو کا مارگزیدہ ہے' نفسانی خواہشات کے طوفان نے اس کے امن وسکون کو غارت کر ڈالا ہے' اور جدید انسان "تفریح" کے لئے تہذیب جدید کے ان مصنوعی کھلونوں پر قناعت کناں ہے' مگر یہ آلات طرب ونشاط جو اسے وقتی اور مصنوعی لذت عطا کرتے ہیں' درحقیقت یہی اس کے امن وسکون کے غارت گر ہیں' لیکن صد حیف! کہ زمانے کے رواج کی سند لاکر مولانا ندوی اسی زہرہلاہل کو نسخہ شفا تجویز کرتے ہیں' یعنی : ؎

میر بھی کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے بیٹے سے دوا لیتے ہیں

الغرض اسلام کے نقطہ نگاہ سے مولانا ندوی کے اس فقرے میں کوئی جان نہیں کہ : چونکہ فلاں چیز کا رواج چل نکلا ہے' اس لئے اسے اسلام کی عدالت سے جواز کی سند ملنی چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی دعوت پیش کی تو کفروشرک اور فسق وفجور کا کتنا رواج تھا؟ مولانا ندوی ایسا فلسفی اگر اس وقت موجود ہوتا تو غالباً یہی فتوی دیتا کہ چونکہ ان چیزوں کو قبول عام کی سند حاصل ہے' لہٰذا یہ سب جائز ہیں۔ تصویر اور موسیقی کے جواز کی مولانا نے کیا خوب صورت دلیل دی ہے کہ "اس کو بے جان فقہی بحث اور غیر موثر عدم جواز کے فتویٰ سے روکنا ممکن نہیں"۔ (ص ۱۴۹) حالانکہ دو تین صفحے پہلے رقص اور مجسمہ سازی کے جواز کو خود مولانا ہی یہ کہہ کر رد کردیتے ہیں کہ "ان کے لئے اسلامی فقہ

وتہذیب میں جواز کی کوئی صورت نہیں نکلتی"۔ (ص ۱۴۶) کیا مولانا کو اس تضاد پسندی پر تنبہ نہیں ہوا' یا یہ کہ ان کے ہاں رد وقبول کے پیمانے الگ الگ ہیں' یعنی جس چیز کو مولانا کا ذہن رد کرنا چاہے اس کے لئے اسلامی تہذیب وفقہ حرکت میں آجاتی ہے اور اس کے جواز کے سارے راستے بند کردیتی ہے۔ اور جس شئے کی طرف مولانا کی نظر استحسان ملتفت ہو جائے وہاں فقہی بحث بے جان اور عدم جواز کے فتوے غیر موثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا کے قلم سے نکلا ہوا یہ فقرہ علمی ثقاہت سے عاری ہے :

"تصویر اور نغمہ کی بحث میں بھی اس نقطہ نظر کو ملحوظ رہنا چاہئے کہ انداز اب یہ نہیں اختیار کرنا چاہیے کہ ان کے حق میں یا مخالفت میں جو دلائل محدثین اور فقہا اور صوفیا کے درمیان استخوان نزاع بنے رہے ہیں...."۔

محدثین اور فقہا وصوفیا کے دلائل پر "استخوان نزاع" کا طنز سن کر روح ایمان لرز جاتی ہے اور وجدان کانپ کانپ اٹھتا ہے' مولانا کی منطق یہ ہے کہ مسئلہ کے حق میں دلائل کچھ ہی ہوں اور دلائل کی رو سے راجح پہلو خواہ عدم جواز ہی کا ہو ہمیں بہرحال اس کو جائز بنانا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ طرز فکر الحاد کے راستے سے گزرتے ہوئے سیدھا "اباحیت" کے جہنم تک جاتا ہے۔ اگر حریت پسندانہ استدلال اسی کا نام ہے تو ہٹ دھرمی کا کوئی نیا مفہوم وضع کرنا ہوگا' متوازن بحث واستدلال کا آخر یہ کیا تک ہوا کہ "اگر فطرت گلے سڑے فضلات غذا کو دودھ جیسی مفید اور تر و تازہ غذا میں بدل دینے پر قادر ہے اور دوا ساز مہلک ومضر اشیاء سے حیاتین تیار

کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مجتہد' اجتہاد و تخلیق کے اس عملیہ سے کام نہ لے سکے"۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ مجتہد کا کام نصوص شرعیہ کے مطابق حلال وحرام اور جائز وناجائز کی نشاندہی نہیں' بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد و تخلیق سے کام لے کر حرام چیزوں میں کچھ سائیٹیفک تبدیلیاں کرکے انہیں حلال بنانے کی خدمت انجام دیا کرے' اگر یہی اجتہاد ہے' اور اسی پر "اساسیات اسلام" مبنی ہے تو یقین کرنا چاہیے کہ حلال وحرام کا تصور محض ایک اضافی چیز ہے' ہر کفر و شرک اور ہر بدعت و معصیت کو آزاد اجتہاد کی لیبارٹری میں لے جا کر اسے پاکیزگی و طہارت کی سند عطا کی جاسکتی ہے۔ مولانا مجتہد پر تخلیق کی ذمہ داری ڈالتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلامی احکام میں اجتہاد کسی غیر موجود شئی کی تخلیق کا نام نہیں' بلکہ نصوص شرعیہ کی تشریح و تطبیق کا نام ہے' اور یہ انطباق بے ہنگم نہیں بلکہ اپنے جلو میں کچھ اصول وضوابط رکھتا ہے' لوگوں کے دلوں میں ابو حنیفہؒ وشافعیؒ یا کم از کم ابن تیمیہؒ بننے کی خواہش تو چٹکیاں لیتی ہے' مگر مشکل یہ ہے کہ اس کے لئے کچھ علم و عقل کی حاجت ہے۔

" اسلام اور عورت" کے موضوع پر مصنف کی گفتگو بڑی متین اور ان کی نگہ بلند کی غماز ہے' تاہم یہاں بھی وہ تضاد کا شکار ہیں یعنی ایک طرف وہ اسلام کے وکیل کی حیثیت سے عورتوں کو دور حاضر کی تمام ترقیات کی کھلی چھٹی دیتے ہیں اور دوسری طرف اسے عفاف وپاکیزگی اور نسوانی وقار کی بیڑیوں میں جکڑنا بھی چاہتے ہیں' نسوانی وقار کا پیمانہ جو خود قرآن نے وضع کیا ہے' مولانا کے سامنے ہے :

"وقرن فی بیوتکن ولاتبرجن تبرج

الجاھلیة الاولی۔"

(الاحزاب ر ۳۳)

ترجمہ :"اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں' اور دکھلاتی نہ پھرو جیسا کہ دکھانا دستور تھا پہلے جاہلیت کے وقت میں"۔

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ جاہلیت اولیٰ کا تبرج آج کی جاہلیت جدیدہ کے ترقی یافتہ "تبرج" کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا' پس جب کہ قرآن صنف ضعیف کے نازک آبگینوں کو جاہلیت اولیٰ کے غبار سے اس لئے مصئون و محفوظ رکھنا چاہتا ہے کہ اس سے نسوانی وقار مجروح ہوتا ہے تو آج کے "تبرج" میں' جو بدقسمتی سے "ترقی نسواں" کا عنوان بن گیا ہے' نسوانی وقار کا مقدس جوہر' تہذیب کے قزاقوں کے ہاتھوں محفوظ رہ سکتا ہے؟ کلا! واللہ!۔ اندریں صورت انہیں "ترقی" کے نعروں سے فریب دینا اور پھر اسے عفاف وپاکیزگی کا وعظ کہنا فلسفہ اجتماع ضدین ہی کہلاسکتا ہے جس کے مولانا بڑی شد ومد سے قائل ہیں' یعنی :

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

"اسلام اور سیاست" کی بحث میں مصنف نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ آج کے دور میں احیا خلافت کا نظریہ محل نظر ہے "خلیفہ اور بادشاہ کی اصطلاحوں میں اس دور کے سیاسی شعور کو کوئی بات سمجھانا نہ صرف مشکل ہے بلکہ غلط فہمیوں کو پیدا کرنے کے مترادف ہے"۔ اور "حکومت

الٰہیہ کا نعرہ محض پیرایہ بیان کی حیثیت رکھتا ہے جس کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں"۔ وہ صاف صاف جمہوری نظام مملکت کو موجودہ عصری تقاضوں کے مطابق اسلام کا نظام مملکت قرار دیتے ہیں' سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت' اقتدار کا سرچشمہ عوام کو مانتی ہے اور تشریع و قانون سازی کے اختیارات مجلس منتخبہ کو تفویض کرتی ہے' جب کہ یہ دونوں باتیں اسلام کے یکسر منافی ہیں' اس کے جواب میں مصنف نے بتایا ہے کہ اسلامی جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ صرف انتظامی امور کی حد تک ہی عوام یا اس کے منتخب نمائندوں کے پاس ہوگا جسے وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق نافذ کریں گے اور یہ کہ تشریع اور قانون سازی میں فرق ہے۔ قانون سازی دراصل اجتہاد واستنباط تک محدود ہوگی' اور اس کے دائرے نصوص شریعت کے دائروں سے متصادم نہیں ہوں گے۔

مصنف کا یہ نکتہ نظر بے حد الجھا ہوا ہے۔ مصنف کا یہ دعوی صحیح نہیں کہ اسلام کا نظریہ سیاست موجودہ دور کی ٹھیٹ جمہوریت ہے' کس ملک کی جمہوریت کو کن راستوں پر چلنا ہے اور اسے دستور و آئین اور ضابطہ و قانون کے کون سے پیمانے وضع کرنے ہیں؟ اس کا بیشتر انحصار عوام کی خواہشات پر اور اس سے بڑھ کر قومی نمائندوں کی مجلس مقننہ اور انتظامیہ کی سلامتی فکر و نظر اور عقیدہ و عمل پر ہوتا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ عملی طور پر یہ جمہوریت غلط راہوں پر چل نکلتی ہے یا اس کے تخلیقی عناصر' اسلام کے نقطہ نظر سے انحراف کرلیتے ہیں تو انہیں کنٹرول کرنے کے لئے آپ کے ہاتھ میں کیا چیز ہوگی؟ یہی اصل مرکزی سوال تھا جسے مولانا ندوی تشنہ جواب چھوڑ کر آگے نکل گئے ہیں۔ جمہوریت پر دوسرا سوال وہ ہے

جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا یعنی "اس میں سروں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا"۔ اور یہ کہ :

کہ از مغز دو صد خر کار یک مردے نمی آید
گریز از طرز جمہوری، غلامے پختہ کارے شو

مولانا محمد حنیف ندوی نے اس کی تاویل میں کتاب کے پورے چار صفحات سیاہ کئے ہیں، مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ سوال نہ صرف نظری طور پر جوں کا توں باقی ہے بلکہ عملی طور پر بھی جمہوریت کے جو تماشے ایک مدت سے دکھائے جا رہے ہیں ان میں بیشتر مناظر سروں کے گننے ہی کے نظر آتے ہیں اور یوں "مغز دو صد خر" کو "کار یک مردے" پر ترجیح دی جاتی ہے۔

جمہوریت پر سب سے قوی اعتراض خود جمہوری اصول ہی سے یہ ہوتا ہے کہ اس میں بڑی آسانی سے ایک محدود اقلیت پر جمہوری لیبل چسپاں کرکے اسے اکثریت کے سیاہ و سفید کا مالک بنادیا جاتا ہے، پھر لطف یہ کہ ایک معینہ مدت کے لئے "جمہور" خود بھی بے بسی کی چکی میں پسنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اسلام کا معیاری نظام، خلافت ہی ہے، اس پر مستشرقین نے اپنی کور چشمی کی وجہ سے اگر اعتراضات کئے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اسلام کا نظریہ ہی بدل ڈالیں۔
"اقتصادیات اور اسلام" کے عنوان پر بحث کرتے ہوئے مصنف کا موقف یہ ہے کہ اسلام کے پاس کوئی ڈھلا ڈھلایا اقتصادی نظام موجود نہیں، وہ صرف ان اصولی قدروں کی نشاندہی کرتا ہے جن کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل

پر غور و فکر ہو سکتا ہے' اور ہر ہر دور میں تعبیر و تشریح کی ایسی شکل اختیار کی جاسکتی ہے' جو اس عصر کی روح کے عین مطابق ہو۔ اور ان کے نزدیک "روح عصر کے عین مطابق" چونکہ اشتراکی نظام اقتصادیات ہے' لہٰذا وہی اسلام کا اقتصادی نظریہ قرار پانے کا مستحق ہے۔

اشتراکیت کو اسلام کے چوکھٹے میں سجاتے ہوئے پہلا سوال تو یہ سامنے آتا ہے' کہ اشتراکیت کی بنیاد تاریخی جدلیت پر قائم ہے' اور انکار خدا' انکار وحی و رسالت' انکار آخرت اور انکار دین کے عناصر اربعہ سے اس کا خمیر اٹھایا گیا ہے' جس نظام کا نعرہ ہی دین اور دینی اقدار سے جنگ لڑنا ہو اسے مشرف بہ اسلام کیونکر بنایا جاسکتا ہے؟ اس کے جواب میں مصنف کی رائے یہ ہے کہ "ہمیں سوشلزم سے صرف اس کے معاشی نظام کی حد تک دلچسپی ہے' اس کے پورے فلسفہ سے نہیں' اس لئے کہ سوشلزم اپنے ریاضیاتی مزاج کے اعتبار سے نہ اسلامی ہے' نہ غیر اسلامی۔ یہ ایک سائنس ہے جس کا تعلق تقسیم دولت کے ایک خاص طریق سے ہے"۔ (ص ۲۴۰)

ہمارے اشتراکی مفکرین' جو اسلام اور سوشلزم کے ملاپ کو انسانیت کی سب سے بڑی خدمت تصور کرتے ہیں' عموماً یہی نکتہ پیش کیا کرتے ہیں جو مولانا ندوی نے کیا ہے' جس کا حاصل یہ ہے کہ اشتراکیت کا اقتصادی نظریہ تو اسلامی اصول کے عین مطابق ہے' اس میں کسر ہے تو صرف ایک آنچ کی۔ اور وہ یہ کہ اس نظام اقتصادیات کی بنیاد دہری مادیت اور تاریخی جدلیت پر رکھی گئی ہے' اے کاش کہ دین و مذہب پر اس کی بنیادیں استوار ہوتیں تو اسلام اور اشتراکیت ایک ہی چیز کے دو عنوان ہوتے۔ اور اب یہ فرض مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے کہ ایوان اشتراکیت کے نیچے سے زمین کھود

کر اس کی تہ سے مادیت کے سارے اینٹ پتھر نکال ڈالیں اور اس خلا کو روحانیت سے پر کردیں تو اشتراکیت کا سارا زہر نکل سکتا ہے۔ مولانا ندوی کے الفاظ میں :

"اس وقت معاشرہ کو ابن عربی، ابن تیمیہ، اور ابو حنیفہ ایسی بھاری بھرکم شخصیتوں کی ضرورت ہے جو مادیت کے طوق وسلاسل سے انسان کو نجات دلائیں، جو کتاب وسنت کے دبستان سجائیں اور قانون وفقہ کا ایسا سلجھا ہوا ڈھانچہ تیار کریں جو نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ پوری دنیائے انسانیت کے لئے قابل قبول ہو"۔

(ص ۲۴۲)

ابن عربیؒ، ابن تیمیہؒ اور ابو حنیفہؒ تو خیر اب کیا آئیں گے (یوں بھی اپنے وقت میں انہوں نے جو کارنامے انجام دئے ان کے بارے میں مصنف کی جچی تلی رائے ہم اوپر نقل کرچکے ہیں) تاہم ابن تیمیہؒ کے جانشین کے ذہن میں قانون وفقہ کا جو ڈھانچہ ہے اس کی جھلک خود ان کی اسی کتاب میں نظر آرہی ہے، ملاحظہ ہو :

" اشتراکیت کی یہ اقتصادی روح جس کو ہم اسلامی فکر میں سمو لینا چاہتے ہیں، چونکہ اجتماعی ملکیت کے نظریہ کی حامی ہے اس بنا پر نجی ملکیت کے مسئلہ پر، فقہی سطح پر اس لئے غور کرلینا ضروری ہے کہ اس میں (فقہ میں) تقسیم دولت کے قریب قریب تمام ابواب یعنی حضانت، وراثت، زکوۃ، صدقات وغیرہ کو اس مسلمہ اصول کی روشنی میں

مرتب کیا گیا ہے کہ دولت اور اس کے ذرائع کا مالک ایک
فرد یا کچھ لوگ ہیں"۔

مولانا کا مدعا یہ ہے کہ اسلامی قانون کے تمام ابواب انفرادی ملکیت کے اصول پر مبنی ہیں' جب کہ اشتراکیت کی "اقتصادی روح" اجتماعی ملکیت ہے' اس سے لوگوں نے یہ منطقی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "اسلام اور اجتماعی ملکیت دو مختلف چیزیں ہیں" لیکن مولانا کی رائے ہے کہ "درحقیقت ایسا نہیں" کیونکہ بقول ان کے فقہ کے مسائل واحکام کو ابدیت حاصل نہیں' وہ تو ان مجتہدانہ کوششوں سے تعبیر ہے جو ہر دور میں جاری رہیں' اس لئے فقہی احکام کے الفاظ وحروف سے زیادہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں کیا روح' کارفرما ہے۔ اور پھر عام حالات میں تو خیر اجتہاد کی ایک لگی بندھی شکل ہوتی ہے کہ نصوص کو دیکھو' تعامل صحابہؓ پر نظر کرو اور قواعد زبان کو مد نظر رکھو' لیکن غیر معمولی حالات میں اجتہاد کا اسلوب بدل جاتا ہے' وہاں صرف الفاظ نصوص' ترتیب مسائل' اور اصول ومعانی کی باریکیوں کو نہیں دیکھیں گے بلکہ .... اس خاص مسئلہ میں "اسلام کی روح" حقیقی مصلحت اور غرض وغایت کو دیکھیں گے۔

مزید وضاحت کے لئے مولانا بتاتے ہیں دیکھو غلامی ایک برائی تھی' انسانیت کی جبیں پر ایک بدنما داغ تھا' اس کا رواج صدیوں سے چلا آرہا تھا اس کا خاتمہ اس وقت ممکن نہ تھا' اسلام نے حکمت سے کام لے کر ان کے حقوق متعین کردیئے' صدیوں تک مسلمانوں میں یہ برائی رائج رہی' اسلام کبھی اس برائی کو جائز قرار نہیں دے سکتا تھا' ہاں اس وقت کی بین الاقوامی مجبوریوں کی بنا پر اس نے غلاموں کے احکام دیئے' تا آنکہ یہ برائی خودبخود

مٹ گئی۔

اسی طرح نجی ملکیت بھی مولانا کے نزدیک گو فی نفسہ برائی نہیں مگر خاص مرحلے میں برائی ہے جو پہلے سے چلی آرہی تھی اسلام نے اس کو تحفظ حقوق کی خاطر جائز رکھا اور اس کے لئے احکام و قوانین وضع کئے' اور مولانا کے خیال میں اب اشتراکی نظریہ اقتصادیات نے اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا فیصلہ کرلیا ہے اس لئے اسلام کی روح اب یہی فتوی دیتی ہے کہ نجی ملکیت کا تصور ختم کردیا جائے' بقول ان کے "نجی ملکیت سے متعلقہ احکام کی روح استحصال کو ختم کرنا' سرمایہ کو خرچ کرنا' پھیلانا اور اس کو چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے سے روکنا ہے' اور جب یہ "اسلامی روح" اشتراکیت کے قالب میں منتقل ہوچکی ہے تو ان اسلامی احکام کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی"۔ یہ ٹھیک وہی انداز فکر ہے جس کا اظہار ان سے پہلے مسٹر پرویز ان الفاظ میں کرچکے ہیں کہ یہ احکام عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں' یا ڈاکٹر فضل الرحمان یہ کہہ کر کرچکے ہیں کہ یہ احکام وقتی وہنگامی تھے' یا زیادہ سے زیادہ ایک نظیر کی حیثیت رکھتے ہیں :

لبے نادیدنی را دیدہ ام من
مرا اے کاشکے مادر نہ زادے

مولانا کی منطق کو کارل مارکس کے یہودی فلسفہ اشتراکیت کے پرستار ذرا آگے بڑھائیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلام اس تاریک دور میں آیا تھا جب کہ انسانیت کارل مارکس کی مادی جدلیت کے فلسفہ سے نا آشنا تھی' اور کسی نہ کسی مظہر میں "خدا" کا تصور ان کے یہاں رائج تھا' اسلام بین

الاقوامی مجبوریوں کی بنا پر اس برائی کو مٹانے کی پوزیشن میں نہیں تھا' اس لئے اسلام نے اس کی اصلاح کے لئے ایک صاف ستھرا عقیدہ انسانیت کو عطا کیا۔ اب جب کہ کارل مارکس کے طفیل زندگی کے صحیح فلسفہ' تاریخی جدلیت' تک انسانیت کی رسائی ہوچکی ہے اور اب جب کہ انسان کے تمام مسائل اس فلسفہ کی روشنی میں حل کئے جاسکتے ہیں تو اسلام کے تصور توحید کی روح خودبخود حاصل ہوجاتی ہے اور اس کے بعد اسلامی توحید وعقائد اور نبوت ورسالت کی احتیاج باقی نہیں رہ جاتی ہے' یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ توحید کا مقصد انسانی مساوات کی دعوت دینا تھا' اسلام نے اس کی بنیاد ڈال دی تھی اوز کارل مارکس اور اس کے متبعین نے اسے انتہا تک پہنچادیا اور جب اسلامی توحید کی "روح" اشتراکیت میں آگئی اور اس نے ایک فلسفہ کی شکل اختیار کرلی تو اس کے بعد نظریہ توحید خودبخود ایک غیر ضروری چیز قرار پایا۔ اس طرح مولانا ندوی کے عطا کردہ "اساسیات اسلام" سے چشم بد دور خود اسلام ہی کی ضرورت ختم ہوجاتی ہے۔ کیا مولانا ندوی اس دلیل کو آگے بڑھانے کی اجازت دیں گے؟ کتنے شرم کی بات ہے کہ غلامی اور نجی ملکیت کو "فی نفسہ برائی" تسلیم کرکے یہ دعوی کیا جائے کہ وہ برائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر صدیوں تک مسلمانوں میں رائج رہی' نہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے مٹاسکے' نہ خلفائے راشدین کو اس کی توفیق ہوئی' نہ بعد کے مسلمانوں کو۔ اور آج اس برائی کے خلاف جہاد کرنے کے لئے مولانا ندوی کو "اساسیات اسلام" تصنیف کرنا پڑی۔

غلامی ایک برائی تھی؟ نجی ملکیت ایک برائی تھی؟ اور خدا اور خدا کا

رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے لئے احکام پر احکام دیتے چلے گئے۔ مگر اس برائی کو ختم کرنے کی صلاحیت ان میں نہیں تھی' بتایئے! یہ اسلام کی اساسیات ہے یا خالص کفر کی بنیاد؟ اور ایک آدمی یہ کفریہ نظریہ سن کر اسلام پر یقین لانے کے لئے کہاں تک آمادہ ہو سکتا ہے؟ لقد جئتم شیئا ادا۔

مولانا ندوی نے اپنے فکر و نظر کی جولانیوں میں قرآن کریم کی آیات کی تعبیر و تشریح کی خدمت بھی انجام دی ہے جس کا سرا تاویل سے آگے بڑھ کر تحریف سے جاملتا ہے' لیکن اس ضمن میں یہ احتیاط انہوں نے اکثر وبیشتر ملحوظ رکھی ہے کہ حتی الامکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات (احادیث) سے گریز ہی کیا جائے۔ اس کی متعدد توجیہات ہو سکتی ہیں' مثلاً ایک یہ کہ انہوں نے یہ کتاب ایسے انداز و اسلوب میں لکھی ہے کہ جدید ذہنوں کو اپیل کر سکے' اور چونکہ جدید اذہان احادیث طیبہ کے نام سے چونکتے ہیں اس لئے مولانا نے ان کو توحش سے بچانا چاہا ہو' اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ احادیث نبویہ پر اعتماد کرلیا جاتا تو "آزاد اجتہاد" اور "مجتہدانہ تخلیق" کی راہ میں کچھ الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ مولانا نے مناسب سمجھا کہ ان سے تعرض ہی نہ کیا جائے۔ بہرحال قرآن کو خود صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر سمجھنے سمجھانے کی جو کوشش کی ہے وہ ندوی صاحب کے درون باطن کو پوری طرح آشکارا کردیتی ہے۔ جس سے ہر مسلمان کو پناہ مانگنی چاہئے۔

اپنے پیش رو متجددین کی طرح مولانا ندوی نے بھی "اسلام کی روح" کا بے معنی لفظ بار بار استعمال کیا ہے' اس سلسلہ میں بھی چند نکات

اجمالاً عرض کردینا ضروری ہے :

اول :۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی صرف روح ہی عطا نہیں کی بلکہ اس کے لئے اسلام کا ایک قالب' ایک ظاہری ڈھانچہ اور جسم بھی بخشا ہے' اسلام اس قلب و قالب کے مجموعے سے عبارت ہے' اور یہ روح اسی وقت تک اسلامی کہلائے گی جب تک کہ اسلامی قالب میں ہے' اس قالب سے نکل کر کسی اور قالب میں اس کا منتقل ہونا' ممکن نہیں' جس دن آپ اس "اسلامی روح" کو اس کے "اسلامی قالب" سے نکال کر کسی دوسرے قالب میں منتقل کرنے کے لئے اسلام پر عمل جراحی کا آغاز کریں گے' وہ دن اسلام کی موت کا دن ہوگا اور آپ قاتل اسلام قرار پائیں گے۔ ولا فعل اللہ ذالک۔

دوم :۔ جس طرح اسلام کی روح ہر کہنگی سے پاک ہے اسی طرح اسلام کا جسم بھی گردش ایام سے کہنہ نہیں ہوپاتا' ہاں اس پر خواہشات وبدعات کا میل آتا رہتا ہے' اور گزشتہ سطور میں عرض کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجدید اسلام کا جو خود کار نظام تخلیق فرمایا ہے اس کا مفہوم یہی ہے کہ اسلام کو غسل دے کر اس کے جسم اطہر سے وہ تمام میل کچیل اتار دیا جائے جو اس عرصہ میں لوگوں کی اہوا واغراض اور بدعات نے اس پر چڑھادیا تھا۔ الغرض تجدید کے معنی اسلام کے جسم کو بیرونی آلائشوں سے پاک صاف کرکے اس کے فطری گیسو وکاکل سنوارنے کے ہیں۔ اس کے جسم میں کانٹ چھانٹ کرکے تبدیلیاں لانے کے ہرگز نہیں۔ آفتاب وماہتاب کے کروں کی طرح اسلام کا جسد منور ہر کہنگی سے پاک ہے اور

اس کی تابانی وضوپاشی ہر زمانہ میں تابندہ وپائندہ رہی ہے اور رہے گی۔

ہمارے متجددین کا یہ بنیادی مفروضہ قطعا بے ہودہ ہے کہ چونکہ اسلام کا جسم کہنہ' دور از کار اور نکما ہوچکا ہے اس لئے اس کی روح نکال کر فورا کسی دوسرے تر وتازہ' چست اور جوان جسم میں منتقل کردو' ورنہ وہ بیکار ہوجائے گی' آفتاب وماہتاب کے نورانی پیکروں کے بارے میں اگر کوئی شخص کمال اخلاص سے یہ وعظ کرے کہ : ان کا جسم قبل از تاریخ کے وقت سے چلا آرہا ہے اور اب بالکل فرسودہ ہوچکا ہوگا اس لئے ان کی "نورانی روح" نکال کر کسی اور پیکر میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے' جو نئے زمانے کی ترقیات کا ساتھ دے سکے' تو ایسا شخص احمق کہا جائے گا۔ مگر افسوس ہے' کہ اسلام کے نورانی پیکر کے بارے میں اس نوعیت کے ہذیانات کو حماقت اور جنون کے بجائے دانش مندی' روشن خیالی اور ترقی پسندی سمجھا جاتا ہے' یہ بھی دور حاضر کے "حسن کرشمہ ساز" کا کمال ہے کہ جہل کے معنی علم بتائے جاتے ہیں' جنون کا ترجمہ عقل سے کیا جاتا ہے' اور بد تہذیبی کو تہذیب وثقافت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سوم : -------جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اسلام کی روح کو اس کے جسم سے (جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عطا کیا) نکالنا ممکن ہی نہیں' نہ اسے کسی اور حسین قالب میں منتقل کیا جاسکتا ہے' تاہم فرض کیا کہ آپ نے اسلام کی روح نکال کر اسے بتمام وکمال کسی اور قالب میں منتقل ہی کردیا' تب بھی معاف کیجئے وہ نیا جسم اسلام نہیں ہوگا' آپ کو اس کا نام کچھ اور ہی رکھنا پڑے گا۔ ہندوانی عقیدہ "آواگون" کے مطابق فرض کرو کہ زید کی روح عمرو میں منتقل ہوجاتی ہے' بتایئے اس دوسرے

جنم میں اسے زید کہا جائے گا؟ نہیں! بلکہ عمرو ہی کہلائے گا، کسی مجرم انسان کی روح اپنے پاپ کی سزا بھگتنے کے لئے کسی حیوان میں منتقل کردی جاتی ہے تو کیا وہ اس جون میں انسان کہلائے گی؟ نہیں! بلکہ اسے کتا، بلی ہی کہیں گے۔ کتنی موٹی سی بات ہے کہ جو ہمارے باریک عقل فلسفیوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ "اسلام کی روح" تو اسلامی قالب میں ہی باقی رہ سکتی ہے، اور جب تم نے اسلام کا وہ سانچہ ہی توڑ ڈالا، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دیا تھا، تو اسلام تو اسی دن ختم ہوگیا، اب نہ اس کی روح کسی کے قبضہ میں آئے، نہ اس کا قالب مہیا ہوسکے۔ اور جس نئے قالب پر اسلام کی تختی چسپاں کی جائے گی وہ اسلام نہیں ہوگا۔ ان معروضات سے معلوم ہوگا کہ "اسلامی روح" کا جو راگ ہمارے جدید مصلحین، بڑی سریلی لے میں الاپتے ہیں محض ایک فریب، ایک دھوکہ، ایک سازش ہے، حیف ہے کہ مولانا ندوی، جو ائمہ دین کی تقلید کو جائز نہیں سمجھتے، وہ ان ملاحدہ کی تقلید میں "اسلامی روح" کا نعرہ بڑی بلند آہنگی سے لگاتے ہیں اور اسے اشتراکیت کے قالب میں منتقل کردینے کے بے بنیاد دعوے کرتے ہیں۔

عیبش ہمہ بگفتی، ہنرش نیز بگو

مولانا ندوی سے بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم یہ اعتراف نہ کریں کہ موصوف نے "اساسیات اسلام" میں وجود باری، توحید، نماز، حق تعالیٰ کی ربوبیت اور اسلامی اخلاق سے متعلق بعض جزوی امور سے قطع نظر، بڑی ایمان افروز بحثیں کی ہیں، جن میں ان کا قلم واقعتاً ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی بلندیوں کو چھوتا نظر آیا۔ تاہم کتاب کے تین ابواب نے، جو اصل

موضوع بحث سے تعرض کرتے ہیں' ان کی ساری قلمکاریوں پر پانی پھیردیا ہے' یہ مواد اس قدر "ایمان شکن" ہے کہ اس کی توقع کسی "مولانا ندوی" سے کیا؟ کسی سلیم فکر عامی سے بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ اس سے قبل متعدد کتابیں شائع کرچکا ہے' جن میں اسلامی ثقافت کے نام اور "اسلامی روح" کے فلسفے سے دینی حقائق کے مسخ کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا گیا' اور جن کا اصل ہدف دین میں تشکیک کے راستے ہموار کرنے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا' ہمیں امید ہے کہ ادارہ کے اس مقصد کے لئے اساسیات اسلام سب سے زیادہ مفید ثابت ہوگی' کیونکہ اس میں محرمات کو حلال کرنے' احکام شرعیہ کو ساقط کرنے اور اسلام کو اشتراکیت کے قالب میں ڈھالنے کا فلسفہ بڑے سلیقے سے سائنسی زبان میں مرتب کیا گیا ہے' اور لطف یہ کہ یہ "مقدس فریضہ" ایک ایسے مصنف نے انجام دیا جو اپنے نام کے ساتھ "مولانا" کی شہرت رکھتے ہیں اور ندوۃ العلما کے فاضل کی حیثیت سے "ندوی" کہلاتے ہیں۔

(رمضان المبارک' شوال المکرم ۱۳۹۴ھ)

اسلام اور علمائے اسلام کو بدنام

کرنے کا بھونڈا انداز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ'

نوائے وقت ۲۲ ستمبر ۱۹۷۷ء میں جناب وقار انبالوی صاحب کا ایک مضمون' "سوشلزم' کمیونزم کا روپ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ روسی انقلاب کے بعد ۲۳-۱۹۲۲ء میں روس کے دانشور کارپردازوں کا ایک وفد دہلی آیا اس نے جمیعت علما دہلی سے رجوع کیا اور کہا' اگر برفانی علاقوں کے لوگوں کو وڈکا کے دو ایک گھونٹ پینے اور صبح کی نماز کے لئے تیمم کی رخصت دے دی جائے تو روس میں اسلامی ضابطہ حیات کے تجربے کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ مگر جمعیت علماء اسلام نے اسے یہ جواب دیا کہ یا تو اسلام کو پورے کا پورا قبول کرو یا اس سے دستبردار ہو جاؤ۔ اس واقعہ کو نقل کر کے وقار صاحب نے علامہ اقبالؒ کی زبانی یہ رونا رویا ہے کہ افسوس! ہمارے علما کرام کی کم نگہی اور بے سوادی نے اٹھارہ کروڑ انسانوں کو اسلام کے دروازے سے دھکا دے دیا۔

جناب وقار انبالوی ایک کہنہ مشق صحافی ہیں' اسلام اور سوشلزم کی جنگ میں عموماً" ان کو اسلام کا حامی سمجھا جاتا ہے' مگر جس موقعہ پر ان کا یہ مضمون چھپا ہے اس کی نزاکت کو یا تو انہوں نے محسوس نہیں کیا' یا انہوں نے جان بوجھ کر اس نازک

وقت میں اسلامی کیمپ پر پتھر پھینکنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے روسی وفد کی آمد کا یہ واقعہ انہوں نے کسی سے سنا ہو۔ افسوس ہے کہ انہوں نے اس فرضی افسانہ کو اخبار کی سیاہی میں منتقل کرنے سے پہلے بالکل نہیں سوچا کہ یہ کس قدر غیر ذمہ دارانہ صحافت کا مظاہرہ ہے۔ میں ان کی اور ان کے قارئین کی توجہ چند امور کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں :

ا ------- موصوف اس واقعہ کو روسی انقلاب کے بعد کا واقعہ بتاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا روسی انقلاب ایک سنجیدہ انقلاب تھا اور اس نے روس کے "دانشور کارپردازوں" کو یہ سوچنے کی مہلت دی تھی کہ انہیں انقلاب کے بعد اب کون سا ضابطہ حیات اپنانا ہے؟ جن حضرات نے روسی انقلاب کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ روس کے کمیونسٹ انقلاب نے مذہب واخلاق کے خلاف ایک طوفان برپا کر دیا تھا کہ تمام مذہبی وانسانی قدریں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں تھیں اور اجتماعی طور پر تو کجا انفرادی طور پر بھی اسلام کے اپنانے اور اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے نمایاں کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ نہ روس کے دانشور کارپردازوں کے ذہن کے کسی گوشے میں اسلام کو اپنانے کا خیال پیدا ہو سکتا تھا۔ نہ نو تشکیل کمیونسٹ معاشرے میں اس کی گنجائش تھی۔ ان حالات میں وقار صاحب کا یہ انکشاف تاریخی انقلاب کے اور اس کے نفسیاتی و ذہنی نتائج سے بے خبری کی دلیل ہے۔

۲ ------- وقار انبالوی صاحب موسیٰ جاراللہ صاحب کو ترکستان کا شیخ الاسلام بتاتے ہیں اور یہ کہ انہی کی ترغیب پر روسی دانشوروں کا وفد دہلی آیا تھا حالانکہ موسیٰ جاراللہ کو ترکستان کے شیخ الاسلام ہونے کا شرف صرف وقار صاحب نے عطا کیا ہے نہ وہ اس حیثیت کا آدمی تھا اور نہ اسے یہ منصب حاصل تھا' اس کے عقائد و نظریات اہل

علم سے پوشیدہ نہیں۔

۳ ـــــ اگر وقار صاحب کے بقول موسیٰ جار اللہ صاحب ترکستان کے شیخ الاسلام تھے تو سوال یہ ہے کہ انہوں نے اس فرضی وفد کو دہلی آنے کی زحمت کیوں دی؟ وہ اپنے ملک کے حالات و ضروریات سے جس قدر آگاہ تھے' دہلی کے علمائے کرام اس قدر باخبر نہیں ہو سکتے تھے' جس مشکل کا حل دہلی کے ایوان علم میں ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے' وہ ترکستان کے شیخ الاسلام نے خود ہی کیوں نہ پیش کر دیا' انہوں نے اپنے اٹھارہ کروڑ اہل وطن کو اسلام کے دروازے سے دھکا کیوں دے دیا؟

۴ ـــــ سب سے تعجب خیز اور حیرت افزا بات یہ ہے کہ وقار صاحب کے مطابق روسی دانشور کارپردازوں کا یہ وفد روس سے چلتا ہے اور سیدھا جمعیت علما دہلی کے دفتر پہنچ کر وڈکا اور تیمم کی رخصت چاہتا ہے اور وہاں سے نفی میں جواب پا کر چپ چاپ روس لوٹ جاتا ہے اور وہاں جا کر سوشلسٹ ضابطہ حیات مرتب کر لیتا ہے۔ اسے نہ تو ہندوستان میں کسی اور عالم سے رجوع کرنے کی توفیق ہوتی ہے۔ نہ یہاں کے اخبارات ان کی آمد و رفت کا نوٹس لیتے ہیں نہ ہندوستان میں اس کی آمد اور ناکام واپسی کی کسی کو کانوں کان خبر ہوتی ہے اور نہ وقار صاحب ایسے دردمندان اسلام میں سے کوئی اس وفد کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ یہ سارے راز ۵۵ برس تک وقار صاحب کے سینہ میں دفن رہتے ہیں اور وہ اس کا انکشاف ٹھیک اس وقت کرتے ہیں جب کہ پاکستان میں اسلام اور سوشلزم کی جنگ آخری اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے اور چند ہی روز بعد پاکستانی قوم کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ یہاں اسلام کے نفاذ کو دیکھنا چاہتی ہے یا اسے دفن کر کے اس کی جگہ سوشلزم کا گرجا تعمیر کرتی ہے۔ اس نازک موقعہ پر وقار صاحب کا ۵۵ سال کے مخفی راز کو اگلنا' علما کرام پر کم نگہی

اور بے سوادی کا فتویٰ صادر کرنا آخر کس چیز کی غمازی کرتا ہے؟ اس سے نظام مصطفیٰ کی تحریک کی تائید ہوتی ہے یا اس کے مقابلہ میں لادینی تحریک کی؟

۵ .... وقار صاحب نے وڈکا کے دو ایک گھونٹ لے کر صبح کی نماز کے لئے تیمم کی رعایت کا جو افسانہ رقم کیا ہے اب ذرا اس کی شرعی حیثیت بھی ملاحظہ فرمایئے :

دینیات کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ ایسے طوفانی علاقے میں جہاں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے میں واقعتاً بیماری کا اندیشہ ہو، تیمم کرنے کی اجازت ہے کیا اس معروف مسئلہ سے ترکستان کے علماناواقف تھے کہ روس کے وفد کو ہندوستان آنے کی زحمت اٹھانا پڑی؟ اور پھر کیا دہلی کے علماکرام اس سے ناواقف تھے کہ انہوں نے اس شرعی رخصت پر عمل کا فتویٰ دینے میں تحمل سے کام لیا؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک غلط تہمت ہے جس کا تصور کسی عالم دین کے حق میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک "وڈکا" پینے کا تعلق ہے اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سن لیجئے۔ حضرت دیلم حمیریؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ :

"ہمارا علاقہ بڑا سرد ہے اور سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم ایک مشروب تیار کیا کرتے ہیں، کیا اس کے پینے کی اجازت ہے؟ فرمایا کیا وہ شراب نشہ آور ہوتی ہے؟ بولے جی ہاں! فرمایا تب تو اس سے پرہیز لازم ہے، عرض کیا لوگ اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوں گے فرمایا۔ لوگ اسے ترک نہ کریں تو ان سے قتال کرو۔"

(ابو داؤد شریف ص ۱۶۲ ج ۲)

کیا وقار صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کم نگہی اور بے سوادی کا فتویٰ صادر کریں گے؟ (نعوذ باللہ)۔

۶۔ —— جنابِ وقار صاحب نے سنی سنائی کو بے موقع نقل کر کے صحافت کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ اپنی ثقاہت و اعتماد کو مجروح کیا ہے میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ وقار انبالوی صاحب بہائی مذہب کے پیرو ہیں میں اپنے دوست کی اس بات پر اعتماد نہیں کر سکا' اسی بنا پر مجھے احتجاج کی ضرورت بھی محسوس ہوئی' ورنہ اگر میرے دوست کی بات صحیح ہے اور وقار انبالوی صاحب واقعی بہائی مذہب رکھتے ہیں تو میرے لئے شکایت کا کوئی موقعہ نہیں' کیونکہ اس صورت میں لوگوں کو اسلام سے بد ظن کرنا اور علمائے اسلام کو بدنام کرنا ان کا مذہبی مشن ہے تاہم ان سے یہ توقع پھر بھی رکھوں گا کہ وہ اس مقصد کے لئے غلط افسانے تراشنے سے گریز کریں۔

(ہفت روزہ لولاک ۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء)

مولانا اللہ یار خان چکڑالوی صاحب

کے جدید انکشافات!

مولانا اللہ یار خان چکڑالوی صاحب کے جدید انکشافات!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا اللہ یار خان چکڑالوی صاحب نے تصوف وصوفیا سے متعلق عوام وخواص اور علماء کے دلوں میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالہ کیلئے متعدد کتابوں کے مطالعہ کے بعد نہایت عرق ریزی سے "دلائل السلوک" نامی ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے، موصوف نے اس کتاب میں اکابر علماءٔ دیوبند، سلف صالحین اور ائمہ تصوف کے جادہ مستقیمہ کی کس قدر پاسداری کی ہے؟

ذیل میں ہم نے موصوف کی اس کتاب کے اقتباسات کی روشنی میں ان کے افکار و نظریات اور تفردات کا جائزہ لیا ہے، جس سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ چکڑالوی صاحب نے یہ کتاب تصنیف فرما کر تصوف وصوفیاءٔ سے متعلق پیدا شدہ غلط فہمیاں دور کی ہیں یا ان میں مزید اضافہ کیا ہے-؟

مولانا المحترم "مسلکاً دیوبندی اور مشرباً نقشبندی، اویسی ہیں" -(ص ۱۵۱)

زندگی کا اکثر حصہ فرقہ باطلہ کی تردید میں گزرا، لیکن اب آخری عمر میں اشغال تصوف، اور بیعت و تلقین کا سلسلہ شروع فرمادیا ہے، زیر نظر کتاب انہوں نے تصوف اور صوفیا سے متعلق عوام اور علماً کے دلوں میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالہ اور عوام وخواص کی علمی تشفی کیلئے لکھی ہے (ص ۱) کتاب بڑے بڑے بیس عنوانات پر مشتمل ہے اور ہر عنوان کے تحت ذیلی عنوان آتے گئے ہیں، فاضل مؤلف کی محنت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس تالیف کے لئے پچاس سے زائد کتابوں کا تصفح کیا ہے، اور بڑی دیدہ ریزی سے حوالے تلاش کئے ہیں، بلاشبہ مؤلف کا مقصد نہایت مبارک اور محنت قابل ستائش ہے، مگر کتاب کی زبان صوفیانہ تو مطلق نہیں، بیشتر متکلمانہ ہے، جس میں کہیں کہیں مناظرانہ تلخی کی آمیزش نے اسے بے لطف کردیا ہے، مثلاً کشف کی بحث میں یہ عبارت:

> "یہ بحث قدرے طویل ہوگئی، دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے بعض نئے رفقائے حلقہ سے "کشف قبور" کے متعلق اظہار ہوتا ہے تو بات ذرا آگے چلتی ہے، نور بصیرت سے محروم مولوی نما لوگ جب سنتے ہیں تو چیں بہ جبیں ہوجاتے ہیں، اور جھوٹے.... مدعیان ولایت وخلافت وسجادگی جو اعلیٰ حضرت، خلیفۂ مجاز، پیر طریقت، رازدان شریعت، قطب الاقطاب اور نہ جانے کیا کیا بنے بیٹھے ہیں، جب یہ باتیں سنتے ہیں تو دل ہی دل میں اپنی تہی دامنی پر نادم ہوتے ہیں مگر اپنا جھوٹا وقار قائم رکھنے کے لئے بھانت

بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔" الخ (ص ۱۲۳۔)

نفس مسئلہ (کشف قبور) سے قطع نظر نہ صرف یہ کہ یہ زبان تصوف جیسے پاکیزہ موضوع کے شایان شان نہیں، بلکہ یہ عبارت فاضل مؤلف کے بلند مقصد کو مشتبہ اور ان کی تمام محنت کو بے قیمت بھی کر دیتی ہے، ان کی "دراصل بات یہ ہے" سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے "نئے رفقائے حلقہ" اور "بعض علماء و مشائخ کے درمیان" "کشف قبور" کے موضوع پر معرکۂ کارزار گرم ہے، اور زیر نظر تالیف سے فاضل مولف کا اصل مقصد، اپنے "بعض نئے رفقائے حلقہ" کے لئے اظہار کشف قبور کی سند مہیا کرنا اور انہیں مخالفین کے مقابلہ میں مناظرہ کے لئے تیار کرنا ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ واقعۃً فاضل مصنف کا مقصد تالیف یہی ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ ان کی مذکورہ بالا عبارت قاری کو یہ غلط اور ناخوشگوار تاثر دیتی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ تاثر ان کے اہم اور وقیع مقصد کے لئے کوئی اچھی فضا پیدا نہیں کر سکتا۔

اس تالیف میں "انکشافات" بالکل نئے ہیں مثلاً:

"فائدہ: تصوف جزو دین ہے، اور انتفائے جزو مستلزم ہے انتفائے کل کو، پس انکار تصوف مستلزم ہوگا انکار دین کو۔"

(ص ۱۳)

تصوف بمعنی تزکیۂ قلب، تعمیر باطن اور اصلاح اخلاق کوئی شک نہیں کہ دین کا اہم شعبہ ہے، اس لئے یہ کہنا تو صحیح ہے کہ اس کے بغیر دین ناقص رہتا ہے، لیکن اس کے انتفاء سے انتفائے دین کا دعویٰ... صرف "نیا" ہی نہیں بلکہ محل نظر بھی ہے، اور فاضل مؤلف کی تقریب بھی تام نہیں، اور اگر تصوف سے مراد ان کا

اصطلاحی تصوف لیا جائے جس کے لوازم میں "کشف" (قبور وغیرہ) کو بھی شمار کرلیا گیا ہے۔(ص ۱۸۵) تو پھران کروڑوں صلحاً کے ایمان کا اللہ ہی حافظ ہے، جو کشف قبور وغیرہ کی دولت سے محروم رہے ہیں۔

فاضل مؤلف "لطائف اور شیخ کامل کے عنوان کے ذیل میں رقم طراز ہیں :

> "صوفیا کرام میں فقہائے مجتہدین کے مقابلے میں ایک قوت زائد ہوتی ہے کہ وہ صاحب کشف والہام ہوتے ہیں، فقہا محض ذاتی رائے سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں، اور یہ لوگ الہام و کشف کی روشنی میں، اور کشف والہام، اعلام واطلاع من اللہ ہوتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اعلام من اللہ محض ذاتی رائے سے افضل ہے"۔(ص ۳۳)

تمام فقہائے مجتہدین کا استخراج محض ذاتی رائے اور وہ صفائے باطن سے محروم؟ اور ہر صوفی کا دعوائے کشف، اعلام واطلاع من اللہ؟ انا للہ وانا الیہ راجعون پھر ستم بالائے ستم یہ کہ "محض ذاتی" رائے کو منصف امامت حاصل، اور "اعلام واطلاع من اللہ کو ربقۂ تقلید نصیب، چنانچہ فاضل مؤلف لکھتے ہیں :

> "میں ذاتی طور پر فقہائے مجتہدین کے اجتہاد کو کشف والہام پر مقدم سمجھتا ہوں، اس کی دلیل صوفیاً کا تعامل ہے، تمام صوفیہ محققین، مجتہدین کے مقلد رہے ہیں، پس فقہ کے اجتہاد کا مقدم ہونا ثابت ہو گیا۔"(ص ۳۴)

کاش! فاضل مؤلف کو مقام اجتہاد اور مقام کشف والہام کا "صحیح کشف" ہو جاتا تو ان کی تحقیق شاید یہ نہ ہوتی جس سے ان کے بیان میں تضاد،

صوفیاً کے موقف تقلید میں پیچیدگی، ائمہ اجتہاد کے اعتماد میں اشتباہ اور ہماری حیرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

فاضل مؤلف "شیخ کامل کی پہچان" کے ذیل میں لکھتے ہیں :

"۸۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی تعلق قائم کر دے، جو بندے اور خدا کے درمیان واحد واسطہ ہیں۔

اس ناچیز کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے ہاتھ پر بیعت کبھی نہیں لی، صرف تعلیم دیتا ہوں، اور ابتدائی منازل طے کرا کے دربار نبویؐ میں پیش کر دیتا ہوں، جو تمام جہاں کے پیر ہیں، صرف زبانی جمع خرچ کافی نہیں کہ پیر صاحب فرمادیں کہ لو تمہیں دربار نبویؐ میں پہنچادیا، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سالک خود مشاہدہ کرے کہ سلوک طے کر رہا ہے اور دربار نبویؐ میں پہنچ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کر رہا ہے، اگر کوئی مدعی دربار نبوی تک رسائی نہیں رکھتا، پھر بیعت لیتا ہے، تو وہ دھوکا باز ہے، ماخوذ ہو گا، پس کامل و ناقص کی یہی پہچان ہے، خوب سمجھ لو۔" (ص ۳۸)

فاضل مؤلف کو اگر یہ مقام رفیع حاصل ہے کہ صرف "ابتدائی منازل" طے کرانے کے بعد براہ راست سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر وہ اپنے حلقۂ ارادت کے راہ نوردان طریقت کی بیعت کرا دیتے ہیں، تو یہ ان کے مریدین کی بڑی سعادت مندی ہے، ہم نے جن اکابر اولیاً کو دیکھا سنا ہے وہ تو اپنے کو اس کا اہل بھی نہیں سمجھتے کہ بیداری میں نہ سہی خواب ہی میں اور بلاواسطہ

نہ سہی بالواسطہ ہی سلام نبویؐ سے مشرف ہو جائیں، بہر حال یہ تو اپنا اپنا ظرف ہے، لیکن کوئی مدعی جب تک مؤلف محترم کی تشریح کے مطابق دربار نبویؐ تک رسائی نہ رکھے، اسے بیعت کے لئے نااہل، دھوکاباز، اور ماخوذ قرار دینا بالکل جدید انکشاف اور کامل وناقص کی پہچان کے لئے نئی کسوٹی ہے، ہر صدی میں مشکل ہی کوئی بزرگ اس معیار پر پورا اترا ہوگا۔

> "پہلے بیان کر چکا ہوں کہ آدمی رضائے الٰہی کو مقصد بنا کر اور طلب صادق لے کر ہمارے سلسلہ میں آجائے تو انشاء اللہ تعالیٰ چھ ماہ کے عرصہ میں روح سے کلام بھی کرے گا، روح کو دیکھ بھی لے گا"۔(ص ۱۷۶)

اس سے پہلے فاضل مؤلف ہمیں بتلا چکے ہیں کہ "روح عالم امر سے ہے" اور عالم امر کی تشریح امام غزالیؒ کے حوالے سے اس طرح بیان کر چکے ہیں کہ "عالم امر عبارت ہے موجودات سے جو حس، خیال، جہت، مکان اور حیز سے خارج ہے، عالم امر انتفائے کمیت کی وجہ سے مساحت وتقدیر کے تحت نہیں آسکتا"۔(ص ۲۷) اور یہ کہ "پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ یہاں روح کی تعریف بالوجہ ہوگی نہ کہ بالکنہ، کیونکہ روح کی حقیقت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "وما اوتیتم من العلم الا قلیلا"(ص ۲۳) اب ایسی چیز جس کی نہ تو حقیقت اور کنہ معلوم ہو، نہ وہ مساحت وتقدیر کے تحت آسکتی ہو، نہ حس اور خیال کا وہاں دخل ہو، نہ جہت، مکان اور حیز کے دائرے میں اسے لایا جاسکے، صرف چھ ماہ کے عرصہ میں اسے آنکھوں سے دکھا دینے کا انکشاف بالکل نئی چیز ہے، ورنہ ہماری طرح عام لوگ بھی روح کو غیر محسوس اور غیر مرئی چیز ہی سمجھتے رہے۔

جیسا کہ امام غزالیؒ کی تصریح فاضل مؤلف نے نقل کی ہے۔

''قصد رسول اور کشف قبور'' کے تحت فاضل مؤلف فرماتے ہیں :

''چوتھی اصولی بات یہ ہے کہ تصوف واحسان دین کا اہم شعبہ ہے اور یہ قاعدہ ہے اذا ثبت الشی ثبت بلوازمہ اور الہام اور کشف کا ہونا تصوف کے لوازمات سے ہے، اس لئے دین کو تسلیم کرنے کے ساتھ دین کے اہم جز تصوف واحسان کو تسلیم کرنا پڑے گا، اسے تسلیم کیا تو کشف والہام کو ماننا پڑے گا، کیونکہ لازم وملزوم ہیں''۔ (ص ۱۸۵)

بلاشبہ بعض اوقات اللہ کے مقبول بندوں کو کشف والہام بھی ہوتا ہے (جو نہ تصوف اور خدا رسیدگی کے شرائط میں ہے، نہ لوازم میں سے، نہ اس میں دوام ہے نہ اختیار، پھر نہ ان چیزوں کو ذرہ برابر قرب خداوندی میں دخل ہے، نہ ان کے نہ ہونے سے قرب ورضا میں ادنیٰ خلل واقع ہوتا ہے، لیکن ''کشف قبور'' تک کو لوازم اور ضروریات دین میں داخل کرنا اور اسکے اثبات ونفی کو دین کے اثبات ونفی کے ساتھ لازم وملزوم قرار دینا پہلی دفعہ مؤلف کے یہاں دیکھا، جب کہ مؤلف محترم ''تصوف کیا نہیں'' کے عنوان سے خود ہمیں بتلاتے ہیں ''تصوف کے لئے نہ کشف وکرامت شرط ہے، نہ دنیا کے کاروبار میں ترقی دلانے کا نام تصوف ہے.... نہ اس میں کشف والہام کا صحیح اترنا لازمی ہے اور نہ وجد وتواجد اور رقص وسرور کا نام تصوف ہے، یہ سب چیزیں تصوف کا لازمہ بلکہ عین تصوف سمجھی جاتی ہیں، حالانکہ ان میں سے کسی ایک چیز پر تصوف اسلامی کا اطلاق نہیں ہوتا، بلکہ یہ ساری خرافات اسلامی تصوف کی ضد ہیں''۔

(ص ۸، ۹) ان تمام چیزوں کو "خرافات" اور "اسلامی تصوف کی ضد" قرار دینے کے بعد دین اور کشف قبور کے درمیان ملازمہ کے دعویٰ کو "اصولی بات" بتلانا اور بھی انوکھا سا تجربہ ہے۔

ایک جگہ عنوان ہے "سماع موتی پر اجماع امت ہے" (ص ۱۶۱) راقم خود بھی "فی الجملہ سماع موتی" کے ثبوت کا منکر نہیں، مجھے بڑی خوشی ہوتی، اگر مؤلف محترم اس اجماع پر کوئی نقل پیش کرتے، لیکن افسوس کہ اس "اجماع" پر کوئی تصریح پیش نہیں کی، اس صورت میں خواہ ہم کتنا ہی چاہیں، مگر اس نزاعی مسئلہ پر "اجماع امت" کا دعویٰ نہ صرف غیر واقعی بات ہے بلکہ اس سے "اجماع امت" کا تقدس بھی مجروح ہوتا ہے، یعنی ہماری اس انتہاپسندی سے سماع موتی تو اجماعی نہیں بنے گا، ہاں یہ خطرہ ضرور ہے کہ خدانخواستہ اجماع امت کا مسئلہ بھی، سماع موتی بن کر نہ رہ جائے، فالی اللہ المشتکی۔

ایک جگہ فاضل مؤلف نے امام غزالی کے ذکر کردہ اس نکتہ سے کہ "آسمان دعا کا قبلہ ہے" یہ انتہاپسند نتیجہ نکالا ہے:

> "فائدہ: معلوم ہوا کہ جس طرح کعبہ کی طرف رخ کئے بغیر نماز ادا کی جائے تو نماز ادا نہیں ہوتی اور نہ ہی قبول ہوتی ہے، اسی طرح ہاتھ اٹھائے بغیر دعا کی جائے تو وہ دعا قبول نہیں ہوتی۔
>
> ۲- یہاں سے ثابت ہوا کہ اگر قبر کے پاس ہاتھ اٹھا کر دعا نہ کی جائے تو مقبول نہیں، اگر دعا مقبول نہیں تو میت کو ثواب کس چیز کا پہنچے گا، گویا قبر کے پاس جا کر بغیر ہاتھ اٹھائے دعا

کرنا ایک بیکار فعل ہوا، پس ثابت ہوا کہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا مسنون ہے، اس میں قبر اور غیر قبر کی قید نہیں"۔
(ص ۲۰۱)

بعض جگہ بلاشبہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا مسنون ہے، اور اگر کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو قبرستان میں دعا کرتے وقت بھی رفع یدین کی اجازت میں بھی مضائقہ نہیں، لیکن امام غزالیؒ کے نکتہ سے یہ کلیہ اخذ کر لینا کہ "ہاتھ اٹھائے بغیر دعا کرنا ایک بے کار فعل ہے" یقیناً کوئی علمی انداز نہیں، کیا ہر دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا عادۃً ممکن ہے؟ بعض جگہ فاضل مؤلف کے استدلال میں توازن نہ ہونے کی وجہ سے جدل کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، مثلاً:

"کوئی حسد کی آگ ذرا علمی رنگ میں اگلتا ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ کشف ظنی چیز ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں، بجا، مگر یہ بھی تو فرمائیے کہ کتب فقہ میں مذکور.... تمام مسائل قطعیہ ہی ہیں، کیا ذخیرۂ احادیث کی تمام حدیثیں متواتر اور قطعی ہیں، کیا وتر، سنت، نفل کی تعیین نصوص قطعیہ سے ثابت ہے؟ اگر محض ظنی ہونے کے احتمال پر کشف کی کوئی اہمیت نہیں تو فقہ اسلامی سے کیا سلوک کریں گے"۔ (ص ۱۲۳)

(ہمیں مؤلف محترم سے آج تک نہ تو تعارف کا شرف حاصل ہے، نہ اس کتاب کی وصولی سے قبل ان کے اسم گرامی ہی سے واقفیت تھی، اس لئے "ذرا علمی رنگ میں حسد کی آگ اگلنے" کا فقرہ امید ہے کہ ہم پر بھی چست نہ کیا جائے گا) ظنیت کے خاص اصطلاحی لفظ کے سہارے ایک طرف کشف کو، اور

دوسری طرف فقہ و حدیث، واجبات دین اور سنن ھدیٰ کو رکھ کر ایک ہی میزان سے تولنا، اور اصرار یہ کرنا کہ یا تو دونوں پر ایمان لاؤ، یا دونوں سے دست بردار ہو جاؤ، اسے خالص جدل تو کہا جا سکتا ہے مگر اسے کشفی تحقیق یا علمی تشفی کا نام دینا بے انصافی ہے۔

بعض جگہ ان کی جدلی ٹکر سے پورے دین کے لئے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ:

> ''کوئی کہتا ہے کہ اس (کشف) میں غلطی کا احتمال ہے، اس کا جواب دیا جا چکا ہے کہ دین نقل ہے، اور نقل خبر ہے اور خبر میں احتمال صدق و کذب دونوں کا ہے، تو پھر اس احتمال پر پورے دین کو چھوڑ دینا چاہئے''۔ (ص ۱۲۳، ۱۲۴)

اف! توبہ!! علمائے ظاہر کی سطحیات اور صوفیا کی شطحیات سنی تھیں، لیکن علمائے جدل کی نطحیات کا یہ انوکھا تجربہ ہوا، کشف میں غلطی اور پورے دین میں غلطی، دونوں کا ایک حکم؟ ''فرق مراتب نہ کنی زندیقی'' کیا کسی نے غلط کہا تھا۔؟ کیا پورے دین میں ''احتمال کذب'' کا شعلہ ''خرمن ایمان کو خاکستر نہیں کر دے گا۔ استغفر اللہ۔

بعض جگہ مؤلف محترم کی دعوی و دلیل میں قاری کو ''محض سخن سازی'' کا احساس ہوتا ہے، مثلاً ص ۱۳۳ میں مؤلف نے عنوان قائم کیا ہے ''عدم کشف بڑا حجاب ہے'' اور دلیل میں قرآنی آیت ''کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون'' پیش فرمائی گئی ہے، اور مزید تشریح کے لئے امام رازیؒ کی عبارت مع ترجمہ دی گئی ہے، مگر بڑی کاوش کے بعد بھی مؤلف کے دعوی و دلیل کے

درمیان کوئی ادنیٰ ربط نہیں ملتا، اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ "کفار کے دنیا میں کفر اور لذات فانیہ میں منہمک رہنے کی وجہ سے قیامت کے دن انہیں دیدار خداوندی نصیب نہ ہوگا"۔ اب اس سے یہ استدلال کرنا کہ جن اہل ایمان واخلاص کو دنیا میں کشف نہیں ہوتا وہ اس آیت کا مصداق ہیں، محض بناوٹ ہی کہلائے گی، کتاب میں جگہ جگہ اسی قسم کے غیر متوازن اور انتہا پسندانہ نوادر کی بھرمار ہے۔

مؤلف محترم ماشاء اللہ سنی العقیدہ نقشبندی اور دیوبندی ہیں مگر ان کی یہ تالیف نہ اصول اہل سنت کی ترجمانی کر سکی ہے، نہ تصوف کے حقائق کا صحیح انکشاف اس سے ہو سکا ہے، نہ دیوبندی مسلک اور نقشبندی مشرب ہی کو نبھا سکی ہے، نیک نیت مؤلف اس کتاب کے ذریعہ تصوف سے متعلقہ غلط فہمیوں کے ازالہ اور عوام وخواص کی علمی تشفی کا قصد رکھتے ہیں، مگر ہمارا خیال ہے کہ اگر کتاب کو پڑھ کر عوام اور بالخصوص جدید طبقہ کے ذہن میں دین اور تصوف کے بارے میں مزید غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں تو یہ مؤلف کی بڑی کامیابی اور ان کے قارئین کی بڑی سعادت ہوگی۔